بهار بهشت

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

اظہارِ تشکر

حضرت خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمتہ کی ذات برصغیر پاک و ہند کے اہل علم و نظر میں ہمیشہ ممتاز رہی کہ جنکی حیاتِ ظاہری میں اُن کی علمی و روحانی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جانے لگا آپ رحمۃ اللہ علیہ واعظ، صوفی، شاعر ہونے کے علاوہ ایک دردمند دل رکھنے والے صاحبِ طریقت بزرگ تھے، لاکھوں کے اجتماع میں آپ کی آواز اس قدر اثر آفرین ہوتی کہ سامعین شوقِ سماعت میں سانس روک لیتے اور ہمہ تن گوش ہوتے یوں محسوس ہوتا کہ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قبولیت کی معراج پر ہے اور لوگ ہیں کہ کشکولِ دل وا کئے ہوئے تقریر کو دل کی دھڑکن بنانے کا عزم لئے ہوئے ہیں۔

وہ وارداتِ قلب کے امین اور عشق و مستی کی جولانیاں تقسیم کرنے والے صوفی تھے، آپ ایسے شاعرِ محبت تھے جو فارسی اردو اور سرائیکی میں دلوں کے تار چھیڑتے تھے، ایک دیدہ ور شاعر کی طرح آپ کو انتخابِ الفاظ کا سلیقہ اور ترتیبِ کلمات کا قرینہ حاصل تھا، کہتے ہیں کہ جب لفظ لفظ کے ساتھ یوں جڑا ہوا ہو جیسے زنجیر کی کڑیاں تو کلام تاثیر کی انتہا کو چھونے لگتا ہے اور اگر معانی و مفاہیم کی روانی بھی موسلا دھار بارش کی صورت دھار لے تو ایسا کلام سماعت نواز ہونے کے ساتھ ساتھ دلوں پر بھی دستک دینے لگ جاتا ہے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کبھی سہل ممتنع کی صورت میں آسانیاں بہم پہنچاتی ہے کہ ہر خاص و عام فریفتہ ہو جائے اور کبھی اسرار و رموز کے دروازے کھول دیتی ہے تو ہوش و خرد شکار ہونے لگتے ہیں

شاعری کی معراج یہی ہے کہ ''از دل خیزد بر دل ریزد''۔

علامہ اقبال نے اسی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے''۔

وطن عزیز کا ہر صاحب علم گواہ ہے کہ اُن کے دل کی بات نے کس کس پر اثر دکھایا ہے۔ کچھ لوگ پڑھ کر مست ہوئے تو کچھ ورطہِ حیرت میں غوطہ زن ہو گئے کوئی انتخاب الفاظ کا گرویدہ ہے تو کوئی جمالِ دروبست کا گھائل ہے۔ضروری تھا کہ ایسے باکمال صوفی اور جذب اب شاعر کے حالات وکمالات کو جمع کر کے منظر عام پر لایا جائے تا کہ سلسلۂ رشد کا یہ فیض ہر ایک تک پہنچ سکے۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ حضرت خواجہ صاحب کے حالات کے ساتھ ساتھ اُن کے علمی مقام، روحانی عظمت اور شعری رفعت پر ایک جامع کتاب ترتیب دی جائے جس کے لئے میں نے اپنے انتہائی محسن! نامور محقق اور ماہر تعلیم جناب ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صاحب سے رابطہ کیا اور انہوں نے میری گذارش کو شرفِ قبولیت بخشا ڈاکٹر صاحب کے معیارِ تحقیق اور رفعت علمی کا ایک زمانہ معترف ہے۔الحمدُ للہ کہ اُن کے ذوقِ سلیم نے بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے یہ کارنامہ سر انجام دیا جو اس کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، جس پر میں ان کا بے حد ممنون اور دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے علم وفضل میں مزید تو انائی عطا فرمائے اور تندرستی سے نوازے۔آمین

خاکِ راہِ دردمنداں

غلام قطب الدین فریدی

سجادہ نشین آستانہ عالیہ گڑھی شریف

WWW.NAFSEISLAM.COM

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انسانی زندگی میں ماضی کی تلخ وشیریں یادیں معاشرتی رویوں کی تعمیر وتربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، کہا جاتا ہے ایک مرتبہ کا معلوم کبھی بھی نامعلوم نہیں بن سکتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر معلوم کی حیثیت ایک سی نہیں ہوتی، کوئی شعور کی مکمل آگہی کے ساتھ سطح ذہن پر درخشاں رہتا ہے تو کوئی تحت الشعور کے دھندلکوں میں سرگرداں ہو کر ابہام کی وادی میں اترنے لگتا ہے جبکہ کوئی اپنی بیشتر قوتوں سے عاری گم شدگی کی غاروں میں غرق ہو کر شناخت کے اعزاز سے بھی محروم ہو جاتا ہے، انسان انہی تین حالتوں کا اسیر رہتا ہے۔ شعور اُس کا حُسن ہے تو تحت الشعور اُس کا اعزاز، لاشعور بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ بہت سے انسانی رویے اور معاشرتی مظاہر کا پردہ نشین محرک یہی ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حفاظت ماضی کا یہ ذہنی سفر مختلف کیفیات کا اسیر رہتا ہے، حافظہ ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے جو قدرت کا وہ عطیہ ہے جو ہر انسان کو تقریباً یکساں نصیب ہوا ہے اگرچہ اس کی یاداشت اور شناخت میں تفاوت ہے، اسی حوالے سے انسانی ذہن کی برتری اور کہتری کا تعین کیا جاتا ہے، یہ بھی ایک مشترک انسانی وصف ہے کہ بچپن یا آغاز عمری کا انسانی ذہن آلودگیوں سے محفوظ اور بے ترتیبی کی قباحتوں سے محفوظ ہوتا ہے اسی لیے اوائل عمر کا تجربہ ہو یا تعلق، حادثہ ہو یا واقعہ، محبت ہو یا

WWW.NAFSEISLAM.COM

نفرت زندگی کے ہر موڑ پر اثر دکھاتی ہے بعض اعمال کی انسانی شعور توجیہ بھی پیش نہیں کر سکتا کہ اس میں کسی حد تک فراموش کردہ افعال کی کارفرمائی ہوتی ہے، گزرے ہوئے لمحات کی یہ اثر آفرینی ہی ہے کہ کبھی ان کی راعنائیوں میں گم رہنے میں حظ ملتا ہے تو کبھی ان کی تلخیوں سے موجود بھی مسموم ہو جاتا ہے، کسی نے سچ ہی کہا تھا ؎

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مگر اس کے برعکس کسی کا تجربہ یہ ہوتا ہے کہ

"اکثر شب تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے، گزری ہوئی دلچسپیاں،
بیتے ہوئے دن عیش کے، بنتے ہیں شمع زندگی، اور ڈالتے ہیں
روشنی، میرے دل صد چاک پر۔"

خوش قسمت ہیں وہ افراد جن کا ماضی بھی تابناک ہے اور حال بھی روشن ہے، وہ لوگ موجود ہوں، زندہ ہوں تو بانصیب ہوتے ہیں۔ ماضی میں محو سفر ہوں تو بھی خورسند ہوتے ہیں، یہ بھی ضروری نہیں کہ گزرا ہوا دور ہمیشہ ہی پُر بہار رہا ہو ضرورت اس کی ہے کہ مسرتیں کشید کرنے کا ہنر آ گیا ہو، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف علامہ اقبال نے ذاتی حوالے سے ذکر کیا تھا کہ ؎

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا غنچے سے چھینے گا کوئی ذوق شکرخند

اسی کیفیت کا بے مثال نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات سے ہویدا ہوا کہ آتش نمرود بھی گلزار صفت بنی، یہ خورسندی کا دائمی جمال تو منتخب افراد ہی کو حاصل ہوتا ہے مگر وہ جو اپنے خالق پر کچھ بھروسہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ بھی ہر گزرتے لمحے کو آنے والے ادوار کے لیے راحت بخش سامان سفر بنا لیتے ہیں، اپنی زندگی میں ایسے نور آشنا لمحات میسر نہ ہوں تو پھر مہکتے ہوئے جسموں والے باخدا افراد ذوقِ سفر کو فراواں کر دیتے ہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

کہ انسان معاشرتی روّیوں سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم جونسلوں کو آداب آشنا بنانا چاہتی ہے اپنے اچھے تجربات کے ساتھ دوسروں کے روشن نقوش سے بھی کسب نور کا اہتمام کرتی ہے، بزرگوں کا مستقیم کردار، اصحابِ عزیمت کی راہنما سیرت اور تعلق باللہ کے حاملین کا صالحانہ رویہ، ہر حال میں پرورش خیر کا ذریعہ بنتا ہے، تذکرے، ملفوظات، نقوشِ سیرت اور سوانح حیات کی تجمیع، ترتیب اور تدوین اسی جستجوئے حُسن کی مرہون ہے، اس تلاش میں انسان نے ہمیشہ بہتر وجود پیش نظر رکھے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام، خصوصاً رحمت عالمین ﷺ کی سیرت ہر دور کے انسان کے لیے قندیل نور رہی ہے اور ابد تک رہے گی کہ یہی وجود مکرم حسن تمام کا مظہر اور جمال کردار کا نمونہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وجود ہر راست رو انسان کا مقصود ہے کہ یہی اصحاب شاہراہ حیات کے لیے روشنی کا مینار ہیں، اولیاء کرام صوفیاء عظام، ائمہ مجتہدین اور محدثین باتمکین بھی قدم قدم پر انضباطِ حیات کے کفیل ہیں اسی لیے ان کے ذکر سے راستی کی تلاش کی جاتی ہے اور یادِ رفتگاں سے استقامت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

تحدیث نعمت کا تقاضا ہے کہ ذاتی تجربات وکوائف کی اُن خوش بختیوں کا ذکر کیا جائے جو ہر نازک موڑ پر وابستگی حسنات کا وسیلہ رہی ہیں، والد گرامی محمد بشیر الحق صدیقی رحمۃ اللہ علیہ تربیت اولاد میں ہمہ جہت باخبری کو تربیت کا بنیادی عنصر گردانتے تھے اس لیے عملی نمونہ بن کر بھی اخلاقی منزلت کی راہ دکھاتے تھے اور بزرگانِ دین کے رویوں کے ذکر کو بھی کسب فیض کیلئے تربیت کی اساس بناتے تھے، آپ کی لائبریری میں جہاں کتب تفاسیر، کتب احادیث، کتب فقہ سے مالا مال تھی وہاں اولیاء وصوفیاء کے تذکروں سے بھی مملو تھی، کہانیاں، بزمِ اطفال کا لازم جزو ہوتی ہیں اس لیے آپ کا انتخاب صلحاء کے واقعات اور حسنات کی تحریک دینے والی کہانیاں ہوتی تھیں، عصر موجود بھی آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا کہ آپ کے نزدیک ملت اسلامیہ کسی دور میں بھی بے توفیق نہیں ہوئی، اس لیے آپ ذاتی تجربات کو بھی اپنی گفتگو کا حصہ بناتے تھے، بے پناہ مطالعہ جس کا خیال اب بھی

جھنجھوڑتا ہے اور بے لاگ تبصرہ جواب بھی اخذ وترک کا معیار سمجھا تا ہے آپ کے لیے ایسا نمونہ تھا جو سعادت مندی کا کفیل تھا، حیرت اس پر ہوتی تھی کہ شخصیت کا ہمہ پہلو تذکرہ اور اُس سے تربیت کے عوامل کی کشید آپ کس حسن نظم سے کرتے تھے، ہم نے آپ نے اتنا کچھ سنا کہ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا علم کا بیشتر انحصار انہی سماعتوں پر ہے، جب استطاعت نصیب ہوئی اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل ہوئی تو ان سماعتوں کے استہناد پر حیرت انگیز اعتماد پیدا ہوا، زبانی روایات کو جب محفوظ تحریر کی ثقاہت بھی حاصل ہوئی تو اک گونہ گرویدگی کا احساس ہوا۔

والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے بعض ہم عصر علماء وصوفیاء کے حالات سنے تھے، ان بزرگ اصحاب میں ایک نام اکثر گوش نواز ہوا، یہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا نام تھا، والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے سامنے کبھی اُن کی کسی کرامت کا ذکر نہ کیا، ہمیشہ عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گرویدگی بلکہ بے پناہ گرویدگی کا ذکر ہوا فرمایا کرتے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ عصر حاضر کے اُن خوش نصیب بزرگوں میں سے تھے جن کی نس نس میں محبت، عشق اور عقیدت کی جولانیاں رُستہ خیز تھیں، ہر جملہ انتہاء کلام پر پہنچنے سے پہلے حاضر دربار ہو جاتا تھا۔ گفتگو کا موضوع کوئی ہو، عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بیت الغزل کے طور پر نمایاں رہتا تھا، فرمایا کرتے کہ تصوف کے گھرانوں میں ایسے افراد کم ہی دیکھے ہیں جو باکمال صوفی ہو کر بھی علماء کی صف میں رہنے میں فخر محسوس کرتے ہوں، اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ اصحاب علم بھی چند صوفیانہ مشقوں کی بنا پر، صوفی، پیر، صاحب سجادہ حتیٰ کہ ولی کہلانے کو ہی ترجیح دیتے ہیں مگر خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے عشق ومستی کی اک دنیا آباد کرنے کے باوجود نسبتوں کی بے پناہ عظمتوں کو سمیٹنے کے باوصف اپنا علمی حوالہ گم نہیں ہونے دیا، حضرت خواجہ مرحوم مدینۃ العلم وجود کے عاشق اور باب العلم شخصیت سے تعلق رکھنے والے، عالم دین تھے، آپ کی تقریر میں لفظوں کی دروبست بڑی مؤدب ہوتی تھی انتخاب کلمات میں مکمل ہوشمندی کی جلا نظر آتی تھی جبکہ استخراج مسائل میں مکمل اتباع کے جلوے ہوتے تھے،

WWW.NAFSEISLAM.COM

تقریر میں بسا اوقات جذبوں کا ہنگام ازخود رفتہ کر دیتا تھا، ایک جولانی سی جولانی تھی جو سامعین پر حملہ آور ہوتی تھی، بے کیف اور بے ذوق سامعین بھی جذبوں کے طلاطم میں بہہ جاتے تھے، نہ وجود کا ہوش رہتا نہ ٹوپی کے سنبھالنے کا، لرزش ہی لرزش، وجود پر طاری ہوتی، محسوس ہوتا کہ حواس کی دنیا سے آزاد ہو گئے ہیں، وارفتگی وجود کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے، ایک عاشق ہے جو تمام تر بحر عشق میں غرق ہے، ایسے موقعوں پر خیال آتا کہ اب تو شعور کی پاسداری بھی نہیں رہی ہوگی مگر حیرت ہے ادب شناسی پر، کہ لڑکھڑاتا جسم، اُبلتا جذبہ اور ہمہ جہت مچلتا جوش بھی آداب کا اسیر رہتا، نہ کوئی لفظ بے ربط ہوتا، نہ کوئی کلمہ حد ادب سے سرکتا اور نہ کوئی مستانہ حرکت حصار شریعت سے سر نکالتی اور نہ ہی کوئی جذبہ آداب محفل کو دگرگوں کرتا، خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ حصار شریعت میں رہنے والے عاشق تھے۔ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے، کئی بار سنا، محفلوں میں جذب و کیف کا ہنگام بھی اٹھا، سامعین کے جذبے منہ زور بھی ہوئے مگر ادب رسالت کے تقاضوں سے باخبر مقرر کسی کو شریعت مطہرہ کی حدود سے نکلنے نہ دیتا، فرماتے مجھے اُن کی یہ ادا بہت پسند آتی تھی کہ یہی عشق باشعور اسلام کا مطلوب ہے۔ جب بھی والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے سراپا سپاس ہو جاتے، برملا فرماتے عصر حاضر میں شعور و عشق کا ایسا حسین سنگھم کم کم ملتا ہے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہزار مستی کے باوجود آپ حاضر دربار ہیں اس لیے حضوری کی منزلت بے کیف نہیں ہونے دیتی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر محبت کرنے والا کون ہوگا؟ مگر وہاں ایک ادب ہے جو مجلس کا حسن بھی ہے اور محبت کا تقاضا بھی، بعض صوفیاء کے ہاں یہ بندھن ٹوٹے ہیں کہ باخدا دیوانہ باش، کا حوصلہ انہیں حاصل رہا ہے مگر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ''با محمد ہوشیار'' کے حصار میں رہے ہیں، والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ گفتگو جو بارہا گوش نواز ہوئی، دل میں ایک خواہش کو جنم دے گئی، کیا ہی اچھا ہو، ایسے بزرگوں کا ذکر ہوتا کہ آداب شناسی کی توفیق پروان چڑھے،

والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ فیض رساں تذکرے بارہا سنے، ایک

اُنس پیدا ہوا اور نہاں خانہ دماغ میں کروٹیں لینے لگا، اُسی دور میں ایک دو شعر بھی اسی قبیل کے سنے جو فریدی ذوق کے علمبردار تھے، گردشِ زمانہ اپنی رفتار سے جاری رہی، اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ میں ایم۔اے عربی میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہو گیا، بہت مختصر عرصہ میں ہی تعیناتی ہو گئی اور گورنمنٹ کالج منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بطور لیکچرار عربی خدمات انجام دینے لگا، چند روز کالج میں ہی قیام رہا پھر مکان کی تلاش ہوئی تو ایک دوست کی وساطت سے ایک حکیم صاحب جن کا نام حکیم محمد طفیل تھا کے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر مل گیا، کرایہ دار تھے مگر جلد ہی اس نیک گھرانے سے اپنوں کا سا تعلق قائم ہو گیا، یہ گھرانہ خالصتاً صوفی گھرانہ تھا، بہت محبت کرنے والے یہ لوگ بہت خدمت گار بھی تھے اس لیے تعلقات میں استواری آ گئی، حکیم صاحب فریدی کا لاحقہ بھی رکھتے تھے اور گھاس منڈی منٹگمری میں مطب کرتے تھے، مانوسیت کی اس فضا میں ایک مرتبہ مطب میں حاضر ہوا، بڑے تپاک سے ملے، کچھ مریض موجود تھے، میں نے خود ہی گذارش کی کہ آپ اپنا مطب جاری رکھیں فارغ ہونے پر باتیں ہوں گی، حکیم صاحب نے منتظر مریض کو بلایا، قریب بٹھایا، نبض دیکھی دیگر کوائف دریافت کیے، جب مرض اور علاج کے حوالے سے سب کچھ جان چکے تو پیڈ اٹھایا اور پوچھا برخوردار تمہارا نام کیا ہے، ایک دیہاتی سا جوان لڑکا کہنے لگا ''محمد یار'' بس یہ نام کان میں پڑا۔ حکیم صاحب کا پیڈ نیچے گر پڑا، حکیم صاحب یوں تڑپے جیسے کوئی الیکٹرک شاک لگا ہو، پھر اچانک کھڑے ہو گئے اور بے خود ہو کر بے ترتیب سا رقص کرنے لگے، میں حیران کہ حکیم صاحب کو کیا ہوا، تقریباً دس منٹ حکیم صاحب تھرکتے جا رہے ہیں اور زبان سے ''سوہنے نام والا'' کا ورد کر رہے ہیں۔ میں بھی حیران، نوجوان بھی مضطرب، خدا خدا کر کے حکیم صاحب کا جوش ہوشمندی کی صورت میں ڈھلنے لگا، بیٹھ گئے مگر ابھی تک اندر کا ہنگام بے چین کر رہا تھا، انتظار جب حد سے بڑھا تو ہم نے آگے بڑھ کر وجود کو ٹھہراؤ دینا چاہا، مشکل سے ہی واپس آئے، کچھ خاموش رہے پھر نسخہ لکھنے لگے، نام کی جگہ ''محمد یار'' نہیں لکھا۔ ''سوہنے نام والا'' لکھ کر دوا تجویز کر دی، میں تو کالج سے لوٹا

تھا اچانک یہ منظر آنکھوں کے سامنے آیا تو والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد ارشادات یاد آنے لگے، یقیناً وہ مرد درویش جس کا تذکرہ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کرتے تھے کہ مستیوں کا مسکن تھا آج نظروں کے سامنے اس مستی کا بروز تھا، مرید باصفا، سالوں کے فاصلوں کے باوجود نام پر یوں تڑپ اٹھتا ہے تو جب نام والا سامنے ہوگا تو کیسی مستی ہوگی اور جس کا نام یوں تڑپائے وہ وجود خود کیسا ہوگا، محسوس ہونے لگا کہ ضرور اس وجود میں عشق کی بجلیاں کوندتی رہی ہوں گی۔ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے سچ ہی کیا تھا کہ ''شراب ہم سے مست ہو جاتی ہے، ہم شراب سے مست نہیں ہوتے۔'' خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی یقیناً ایسی ہی شخصیت ہوگی جو مستیوں کی افزائش گاہ ہوگی، میری زندگی میں یہ دوسرا واقعہ تھا جو خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ سے ذہنی قرب کا ذریعہ بنا، آپ کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش بھی دل میں کلبلانے لگی مگر مدت تک کوئی واضح صورت سامنے نہ آئی۔

پھر کیا ہوا، چند احباب نے پاکپتن شریف میں انعقاد پذیر ایک محفل میں شرکت کے لیے اصرار کیا، اصحاب کا اصرار بھی تھا اور پاکپتن شریف میں حاضری کا شوق بھی، اس لیے حاضر ہو گیا میری مشکل یہ تھی کہ مجھے ایک اور سیمینار میں حاضر ہونا تھا اس لیے اپنی گزارشات ابتداء ہی میں پیش کر دیں، اجازت لے کر سٹیج سے اترنے لگا تو ایک نہایت باوقار وجود سامنے تھا، نظر ڈالی تو نامانوس وجود مگر روکنے کا انداز حد درجہ محبت آمیز، پہلی نظر ہی میں محسوس کر لیا کہ کسی درگاہ سے تعلق ہے اور آستانوں کی منزلت سے آشنا ہے، سلام کیا، فرمانے لگے، میرے ہاں ایک سیمینار ہے جو داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر سماع ہال میں ہوگا اگر آپ اس میں شرکت کریں تو اچھا ہوگا، میں شخصیت کی منزلت سے متاثر ہو چکا تھا، ہاں کہہ دی، ایک دو منٹ کی راستے کی گفتگو مستقبل میں ایک مستحکم تعلق کی بنیاد بنی، جب یہ انکشاف ہوا کہ حضرت صاحب اُس باکمال دادا کے پوتے ہیں جن کی سحر آفرینی کا میں مدت سے قائل تھا تو گرویدگی میں ایک بے خودی بھی امنڈ آئی، ایک نامعلوم مسرت نے گھیر لیا کہ یہ جو شگوے ہوتے ہیں کہ تصوف کے سوتے

بالکل خشک ہو رہے ہیں یہ مکمل طور پر سچ نہیں، خواجہ غلام قطب الدین فریدی کی ذات میں علمی وقار بھی ہے اور تلاش و جستجو کی تڑپ بھی، خوشی یہ ہوئی کہ آپ کے تعلق سے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ سے قلبی تعلق میں حسی اپنائیت کی متانت بھی آ گئی، اب تو ماضی کے چند حوالوں کو مزید وسعت ملنے لگی، حالات سے باخبر ہونا نصیب ہوا، شاعری کی دلنوازی نے مسحور کر دیا، یہ جوہر دادا سے پوتے کو بھی منتقل ہوا ہے، تسلی ہوئی کہ گڑھی اختیار خان میں کاشت کیا گیا نخل تصوف، اب بھی ہرا ہے اور مسلسل پھل دے رہا ہے۔ ''تؤتی اکلھا کل حین'' کا اثر نسلوں میں زندہ رہے تو ''شجر طیب'' کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔ اللہ کرے یہ بلند بام فروع سلامت رہیں۔

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور آپ کے علمی و دینی مشاغل سے آگہی بڑھتی رہی تو دل میں ایک تحریک پیدا ہوئی کہ اس شجر تصوف، کی حکایت محفوظ ہو جائے تو ہم سب کا اور آئندہ نسلوں کا بھلا ہوگا، یہ خیال اس تحریر کی اساس ہے، خواہش ہے کہ فریدی چمنستان، سے خوشہ چینی کی جائے تا کہ یہ فیض مزید وسعتیں پائے، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت و کردار کا اصل حوالہ تصوف ہے اسی لیے مناسب ہے کہ سوانح حیات کے اندراج سے پہلے تصوف کے حوالے سے مختصر گفتگو ہو جائے اور پھر سلاسل تصوف کے تذکرے کو شامل کر کے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے اور ان کے خاندان کے بارے میں دستیاب معلومات اکٹھی کر دی جائیں۔ ابتداء ''تصوف'' پر گفتگو سے کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے دین حق پر استقامت عطا فرمائے اور ان سلاسل فیض و برکات کو توفیق بخشے تا کہ راستی کا یہ سفر جاری رہے۔ آمین

اللھم صلّ وسلم دائماً ابداً علی حبیبک خیر الخلق کلھم

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

تصوف

"تَصَوُّف" کیا ہے؟ کیا یہ اسلامی معاشرے کا ایک مظہر ہے یا کسی غیر اسلامی معاشرے کے اثرات کا بروز ہے؟ کیا یہ ایک علم ہے یا صرف سماجی رویہ؟ یہ کلمہ کس مادہ کا اشتقاق ہے اور یہ بطور اصطلاح کب وجود میں آیا؟ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے اس کا مقام و رتبہ کیا ہے؟ اہل تصوف جو عموماً صوفیاء کہلاتے ہیں کون لوگ ہیں؟ کیا وہ خالصۃً اسلامی فکر کے حامل افراد ہیں یا اُن پر غیر اسلامی عقائد، نظریات اور تصور حیات کا غلبہ ہے؟ صوفیاء کی تبلیغی مساعی کا نتیجہ ملت اسلامیہ کی قوت کی صورت نمودار ہوا یا معاشرہ اسلامی تعلیمات سے انحراف کرنے والوں کے فروغ کا باعث بنا؟ تاریخی تناظر میں اس تحریک تصوف کے اثرات کیا رہے؟ یہ سوالات اور کئی دیگر اسی قسم کے سوالات ہر دور میں اٹھائے گئے، موافق یا مخالف ردعمل بھی ہر دور میں نمایاں ہوتا رہا مگر اس تحریک کو کوئی ردعمل بے توفیق نہ کر سکا، تاریخ تصوف گواہ ہے کہ محافل تصوف میں بھی یہ سوالات موضوع بحث رہے ہیں اور ماورائی تصورِ حیات یا مافوق الطبیعیات طرزِ فکر کے حامل افراد بھی ان سوالوں کو زیر بحث لانے میں سرگرم رہے، مستشرقین کے ہاں بھی یہ موضوع پسندیدہ رہا، حقیقت یہ ہے کہ ان موافق و معاند ابحاث نے کسی صاحب علم و فکر کو اس سے لاتعلق نہیں رہنے دیا، یہ کلمہ کس طرح لائق توجہ ہوا، تصوف کن اساسی حروف سے ترتیب پایا ہوا کلمہ ہے۔ یہ خالص لغوی بحث ہے جو بیشتر اصطلاحات کی تشکیل کی حتمیت کا حصہ ہوتی ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

اصل سوال یہ ہے کہ جس کو ہر دور میں تصوف کہا گیا وہ کیا ہے؟ یہ تسلیم کرنے میں کسی بڑے سے بڑے معاند کو بھی تامل نہ ہوگا کہ یہ ایک ایسی تحریک ہے جو بہر حال مسلمان ملت کے اندر سے اٹھی ہے اور اس کے اہداف بھی مسلمان امت سے ہی متعلق ہیں، عقیدہ توحید دنیا کے تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے مگر اس سے اسلامی عقیدہ توحید سے بیزاری کا تو کوئی جواز نہیں ہے، اسی طرح مختلف مذاہب میں تصوف سے ملتی جلتی تحریکوں کا وجود اسلامی تصوف کے چشمۂ صافی کو داغدار نہیں کرتا، ہوسکتا ہے ملت اسلامیہ کے بعض افراد اپنی کم علمی یا وقتی میلان کے سبب کچھ نامحمود راہیں تراش لیں، ایسا تو عقائد کے حوالے سے بھی ممکن ہے تو کیا ان غیر مستقیم میلانات کے باعث سارے نظام عقائد کو غیر مستحسن قرار دے دیں؟ یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کا ایک مرکز ومحور ہے جس کی پاسداری لازم بھی ہے، یہی وہ لزوم ہے جو غور وفکر بلکہ رویوں کو بھی پابند آداب بناتا ہے، یہ بھی خیال رہے کہ انفرادی لغزش یا تاویل کی کوئی من پسند صورت حجت قرار نہیں پاتی ندی کے خرام کو کسی ایک رکاوٹ سے بدلا نہیں جا سکتا، تصوف کے حوالے سے زیادہ تر معاندت ڈالی رجحانات ومیلانات کا نتیجہ بھی ہے، کسی صوفی کی عبارت کو سیاق وسباق سے کاٹ کر فتویٰ بازی آج کی بات نہیں، یہ تو انانیت پسند افراد کا ابتداء سے ہی دستور رہا ہے، اپنی فکر کو پوری ملت کی فکر پر ترجیح دینے والوں کا رویہ ہمیشہ ہی ناقدانہ بلکہ معاندانہ ہوتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ ملت کی قوت اور دین کی اشاعت کن صاحبانِ نظر کے حوالے سے مستحکم ہوئی؟ اگر صوفیاء کی صدیوں کی مساعی کو نظر انداز کر دیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا ملت اسلامیہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے فیضان سے انکار کر سکتی ہے؟ کیا حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں سے صرفِ نظر کر کے تاریخ اسلامی کی واضح صورت گری کی جا سکتی ہے۔ یہ تو

چند نام ہیں، تاریخ اسلام کا کوئی ورق زیر مطالعہ لائیے، صوفیاء کی کہکشاں ہر کہیں دمک رہی ہوگی، ان وجود قدسیہ سے انکار تو اپنے آپ سے انکار ہے، ان بزرگوں کی تبلیغی کاوش، ترویج اسلام کی روداد سے حذف کیجیے اور پھر اندازہ لگائیے ہم کس بیابان میں کھڑے رہ جائیں گے، اگر فکر و نظر کے چراغ روشن کرنے والوں کو ہی اندھیروں کا سفیر قرار دیا جائے تو روشنی کہاں رہے گی، برصغیر پاک و ہند نہیں پوری دنیائے اسلام انہی کو اکب رشد و ہدایت سے منور ہے، ایسے ایسے زاویے تعمیر ہوئے کہ "تبتل الیہ تبتیلاً" کی فضائیں اُمڈ آئیں، ایسی ایسی خانقاہیں قائم ہوئیں کہ تخت نشینوں کو رشک آنے لگا، متلاشیان علم و ہدایت ان درگاہوں پر حاضر ہوتے رہے اور دین و دنیا کی نعمتیں پاتے رہے، یہ وجود جب کبھی کمیاب ہوئے تو طلب خیر کے متوالوں میں بے قراری لہرا آئی اور "انسانم آرزو است" کی پکار اٹھنے لگی، ہوش مندوں کے ہاں تو یہ اعتراف بھی بڑا بلند آہنگ تھا کہ

قرن ہا باشد کہ تا یک مرد میدامی شود

بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

تصوف، اسلامی تعلیمات کے اُس توازن کا اظہار ہے جو ایک حق آگاہ انسان کو بہر حال قائم رکھنا ہے، اسلام کی تعلیمات کا حسن یہ ہے کہ ان میں انسانی مادی زندگی کو نظر انداز نہیں کیا اور روحانی زندگی سے تعلق بھی استوار رکھا گیا ہے، انسان کی یہ تقسیم تو بہت بڑے اضطراب کا سبب بنی ہے کہ وہ مادہ پرست ہو یا ماورائیت پسند، انسانی فکر ہر دور میں ان دو انتہاؤں کی اسیر رہی ہے، مادی تصور حیات نے انسان کو جنس، مکان، زمان اور رنگ و روپ کی تنگ ناؤں کا قیدی بنائے رکھا ہے جس سے نسلی، گروہی، ملکی، جغرافیائی یا کالے گورے کی حد بندیاں قائم ہوئی ہیں۔ ماورائی طرز حیات نے مادی آلودگیوں سے بچنے کی کوشش تو کی مگر اس سے بے عملی، معاشرتی ذمہ داریوں سے فرار حتیٰ کہ اپنے وجود سے نفرت کے جذبات کو تقویت ملی، نتیجہ یہ نکلتا رہا کہ انسان، انسانوں سے بیزار، ملک و قوم سے متنفر اور آباد و شاداب دنیا سے فرار میں راحت پانے لگا، یہ دو متضاد رجحانات نے

ہر قوم اور ہر نسل کو ایک دوسرے کا حریف بنائے رکھا، اسلام دین فطرت ہے کہ انسانی فطرت کے تمام تقاضوں کی مناسب حفاظت بھی کرتا ہے اور مستحسن ظہور کا موقعہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام کا مطلوب ایک ایسا انسان ہے جو مادی حوالوں سے قوت کا نشان اور جمال کا مظہر ہو اور باطنی طور پر بالیدگیوں کا مظہر اور شرفِ انسانیت کا پیکر ہو، اسی لیے جب عبادت کا ذوق، پنہائیاں تلاش کرنے لگا تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان پر ایسی تمنائیں حرف اجازت بن کر سامنے آئیں تو ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے جذبوں کو آداب آشنا رہنے کی تلقین فرمائی مثلاً

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے دربار رسالت میں عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میرا دل کہتا ہے کہ میں دنیا چھوڑ دوں، پہاڑوں میں جا کر رہبانیت اختیار کرلو، زمین پر گھومتا رہوں اور مال و دولت سے دستبردار ہو جاؤں، بیوی کو طلاق دے دوں، گوشت نہ کھاؤں اور خوشبو نہ لگاؤں۔'' ترکِ دنیا کی یہ خواہش پوری جولانی پر تھی، خواہش بھی شدید تھی اور نیت بھی کچھ کر گزرنے کی تھی مگر رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت نہ دی اور دنیاوی روابط برقرار رکھنے کی نصیحت فرمائی، اصحاب صفہ کی جماعت تو عملاً اس کا مظاہرہ بھی کر رہی تھی، حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے رویوں میں ترک دنیا کی جھلک بڑی نمایاں تھی، یہ سب خواہشات خلوص کے جذبات کی ترجمان تھیں مگر اسلام چونکہ ایک معاشرتی دین ہے اس لیے ایسے رویوں کی اجازت نہ دی گئی، بھری دنیا سے منہ موڑ لینا تو فرار ہے اور اسلام کسی صورت فراریت کا قائل نہیں، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں مادی حوائج اور روحانی تقاضوں کے توازن کا مظہر رہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ماحول سے اثر لیتا ہے کہ وہ معاشرتی وجود رکھتا ہے، عہد صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہ صرف یہ کہ استقامت کردار کی آبیاری کی بلکہ ایک متحرک وجود کی تعمیر اور تشکیل میں بھی کامیاب رہنمائی فرمائی۔ رویوں کا یہ توازن اس دور کا وہ کارنامہ ہے جو بعد کے ہر دور میں راہنمائی عطا کرتا رہا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد زریں کے بعد اسلامی تعلیمات کی سطوت تو قائم رہی مگر عمل کا وہ جذبہ قائم نہ ہوسکا جس کو اسلام کی شناخت قرار دیا جاتا تھا۔ خلافت راشدہ کے بعد مادیت کی گرفت مضبوط ہونے لگی تو کردار کا حسین توازن قائم نہ رہ سکا جو تعلیماتِ اسلامیہ کا مقصود تھا، انفرادی حسنات میں تو نمایاں کمی نہ ہوئی مگر مجموعی اثرات کمزور پڑنے لگے، ان حالات نے بعض نیک دل اصحاب عزیمت کو بدظن کیا اور آہستہ آہستہ بے رغبتی کی فضا طاری ہونے لگی، یہ حالات کی بے رخی کا شاخسانہ بھی تھا اور عمر رسیدگی کا اثر بھی کہ بعض اکابر لاتعلقی محسوس کرنے لگے، حضرت عبدالرحمٰن بن عمر رضی اللہ عنہ جیسے برگزیدہ صحابی بھی دنیا سے بے رغبتی میں عافیت محسوس کرنے لگے، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جہاں دیدہ سپہ سالار بھی گوشہ نشینی کے میلان کو ترجیح دینے لگے، ان جذبات کو شاید مزید تقویت ملتی اگر اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری سدِ راہ نہ بنتی، یہ تعلیمات کی گرفت ہی تھی جو ایک مضبوط حصار کا کام دے رہی تھی اسی لیے نہ بے رغبتی ترک دنیا کی راہ دکھا سکی اور نہ مادیت کی یلغار روحانی دلپذیری سے روگرداں کرسکی، زاویے، خانقاہیں، اور عزلت خانے ضرور آباد ہوئے مگر شریعت اسلامیہ ان بند حصاروں میں بھی انسانی رویوں کو مستقیم کرنے میں کامیاب رہی، یہ بجا کہ عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سی جامعیت عام نہ رہی مگر بے توفیقی اتنی خودسر بھی نہ ہوئی کہ اتباع شریعت کی بساط لپیٹ دی جائے، تقسیم کار ضرور ہوئی کہ ترجیحات نے اپنے میدان انتخاب کر لیے، مسند شاہی پر قابض حکمران اسلامی ریاست کو شخصی انا اور خودغرضی کی دلدل میں ضرور اُتار لے گئے مگر سلطنت قلب ونظر کے حکمرانوں نے سطوتِ دین کو مضمحل نہ ہونے دیا، بنو امیہ اگرچہ حکومت پر قابض ہو گئے مگر وہ پناہ گاہِ یقین کو دھلا نہ سکے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فیضان اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حسن تربیت خصوصیت سے ان مراکز کا وقار بنا، یہ تو باطن کی ریاست تھی، ظاہری حکمرانی میں بھی ائمہ تفسیر، ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ کی سطوت مکمل سلامتی سے طاری رہی۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ دین سے محبت کرنے والوں نے اپنی

اپنی بساط اور اپنے اپنے عملی رجحان کے حوالے سے خدمت دین کا بیڑا اٹھایا۔ مفسرین نے قرآن مجید کی حکمتوں اور ہدایتوں کو انسانی رویوں کی استقامت کے لیے عام کیا تو محدثین نے نورِ نبوت کی راعنائیوں سے سارے ماحول کو بقعۂ نور بنا دیا، تربیت اذہان اور تشکیل کردار کے یہ ادارے اس قدر اثر آفریں تھے کہ آج تک ان کی مساعی خراجِ محبت وصول کر رہی ہے، تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت کے کفیل یہ ادارے ہر دور میں امت کے راہنما رہے۔ صوفیاء نے تزکیہ نفس کے منصب کی پاسداری کو اپنا مشن بنایا، یہ تقسیم عملی میلان کے حوالے سے ہوئی اگرچہ یہ سب مناصب ایک ہی شجر طیب کی شاخیں تھیں، یہ بھی نہیں کہ جس نے ایک منصب کی ذمہ داری سنبھال لی وہ دیگر ذمہ داریوں سے لاتعلق ہو گیا، ائمہ فقہ کی شناخت اگرچہ فقہی استنباطات ہیں مگر اُن کی تزکیہ نفوس کے حوالوں سے مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۰۵ھ) کو اس استخراج کی سب سے بڑی عملی حقیقت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۸۰ھ) علم فقہ کا سب سے بڑا حوالہ ہیں مگر اس سے اُن کے روحانی فیضان اور اُن کی باطنی تابناکیوں کا انکار ممکن نہیں، یہی دعویٰ صوفیاء کرام کے بارے میں بھی کیا جا سکتا ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۶۱ھ) کی باطنی منزلت کسی صورت بھی آپ کے فقہی مقام کی نفی نہیں کرتی، سوانح نگاروں یا سیرت نگاروں نے شخصیات کی جو حد بندی کی ہے وہ رجحانات کے بیش وکم ہونے کی بنیاد پر کی ہے۔

تصوف پر گفتگو کو ایک اور حوالے سے بھی احتیاط کے دائرہ میں رہنا چاہیے کہ یہ تقسیم صرف طریق کار کی شناخت اور سہولت مطالعہ کے لیے ہے، اس سے علماء اور صوفیاء کے درمیان کسی قسم کی معاندت کی کھوج لگانا سراسر نازیبا بلکہ مکروہ طرزِ فکر ہے، علم کسی طور بھی تزکیہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور تزکیہ کسی صورت علم کے بغیر متحقق نہیں ہوتا، اس لیے حضرت امام مالک، امام دارالہجرۃ رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۷۹ھ) کا فیصلہ نہائت وقیع ہے۔ فرماتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''جس نے علم فقہ حاصل کیے بغیر راہِ تصوف اختیار کی وہ زندیق ہوا
اور جس نے علم فقہ حاصل کیا اور تصوف کے راستے پر نہیں چلا وہ
فاسق ہوا، جس نے دونوں کو جمع کیا وہ صحیح مؤمن ہے۔''

(تحصیل التصرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف: ص ۲)

یہ تو چلن ہو گیا ہے کہ مسند نشین حضرات کے ہاں علماءِ دین صرف دین کے پوست پر ٹھہر گئے ہیں اور اصل دین تو اندر کا اُجالا ہے جو اُن کا منصب ہے، اس طرح دینی علوم کی تحقیر و تخفیف کا پہلو نکلتا ہے جو قرآن مجید اور احادیث رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات سے کھلا تضاد ہے، یہ تسلیم کہ علم فروشی عام ہو گئی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ مسند نشینی بھی ایک مادی روایت بن گئی ہے، امت کا مفاد اس میں ہے کہ علم و عمل کو یکجائی نصیب ہو، حیرت تو اس بات پر ہے کہ علماء کے خلاف صف بندی تو مدت سے ہو رہی تھی، اب دورِ بے توفیق میں مسندوں کا ٹکراؤ بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح اسلامی تعلیمات ذاتیات کے غبار میں سمٹ رہی ہیں اور ملت کو راہِ راست کی جستجو نے بے چین کر رکھا ہے۔

دوسرا المیہ جو جسد ملت کا ناسور بنتا جا رہا ہے وہ شریعت سے بے رغبتی کا ہے، مسند اعزاز تو کم ہے ذمہ داری زیادہ ہے اور جب ہمتیں ذمہ داری سے فرار کو ترجیح دینے لگتی ہیں تو احکام سے روگردانی اور شریعت سے بے اعتنائی عام ہونے لگتی ہے حالانکہ اکابر صوفیاء کے ہاں اس حوالے سے کوئی ابہام نہ تھا، اُن کے ہاں شریعت کی پاسداری شرط اول تھی کہ اس پاسداری کے بغیر دعویٰ تصوف دین نہیں، دین سے انحراف ہے، اس انحراف نے نہ صرف دین کی متابعت کو کمزور کیا ہے بلکہ نت نئے فتنوں کو جنم دیا ہے، جوگیوں کا سا طرز زیست، راہبوں جیسی بے لباسی اور پروہتوں جیسی خود پسندی ملت کے لیے زہر قاتل ہے، اس بے مایہ تصور نے نبوت کے ساتھ تعلق کو بھی گہنا دیا ہے۔ مقامِ نبوت کی اہمیت اس قدر کم کر دی گئی ہے کہ نسبت نبوت کے بغیر مقام الوہیت تک رسائی کے نعرے لگائے جانے لگے ہیں، حالانکہ اہل دانش

اور صاحبانِ نظر ہمیشہ سے یہ کہے آئے ہیں ؎

خلافِ پیغمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

اس مقام پر کسی ابہام کی پرورش کے بجائے مناسب ہوگا اکابر صوفیاء سے راہنمائی حاصل کی جائے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۶۱ھ) فرماتے ہیں:

- ''جو شخص نبی اکرم ﷺ کی پیروی نہیں کرتا، ایک ہاتھ میں شریعت اور دوسرے ہاتھ میں قرآن مجید نہیں تھامتا، اس کی رسائی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک نہیں ہوسکتی۔'' (فتوح الغیب: ص ۴۰۶)

حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۳۲ھ) کا ارشاد ہے:

- ''جس حقیقت کو شریعت رد فرمائے وہ حقیقت نہیں بے دینی ہے۔''

(عوارف المعارف: ۱/۱۳۹)

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۳۳ھ) فرماتے ہیں:

- ''شرح محمدی ﷺ میں یہ حکم ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اُسے بجا لایا جائے اور جس چیز سے منع کیا ہے اس سے پوری طرح بچا رہے۔''

(تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق نظامی: ۱/۴۰۱)

حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۳۸ھ) تنبیہ فرماتے ہیں:

- ''خبردار علم ظاہر جو شریعت کی میزان ہے اسے ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔''

(الیواقیت والجواہر، شیخ عبدالوہاب شعرانی: ص ۲۲)

یہاں یہ سوال بھی اہم ہے کہ کسی صوفی، فقیر یا مرشد کی پہچان کیا ہے کہ لوگ ہر گدری پوش کو راہ یاب طریقت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس پر حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۴۳ھ) کا ارشاد قولِ فیصل ہے فرماتے ہیں:

''اے برادر! اگر تم آج کے فقراء کے مراتب کا پتہ لگانا چاہو تو اُن کے اتباع شریعت پر نظر رکھ کہ شریعت معیار ہے، اس کسوٹی پر فقیر کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔''

(تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق نظامی: ۱/۶۰)

شریعت کی حتمی عظمت پر ایمان کے باوجود فرار کی راہیں تلاش کرنے کا شوق بعض دعویداران تصوف کے ہاں موجود ہے، کبھی تاویلات کا سہارا لیا جاتا ہے تو کبھی کسی شیخ کے کسی قول کا، بس بہانہ مل جائے تو بڑی قوت اور بڑے اعتماد سے یہ اعلان ہونے لگتا ہیں کہ پیر کا قول بھی تو حجت ہے، یہ رویہ اسلاف کے ہاں بالکل نہ تھا بلکہ متاخرین صوفیاء جو راہِ سلوک کی منزلت سے آگاہ تھے، ایسا دعویٰ کبھی نہ کرتے تھے، اُن کے ہاں اصل ثابت یہی رہا کہ قول نبی اکرم ﷺ ہی حجت ہے اور اس کی اتباع ہر حال میں لازم ہے۔ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۵۷ھ) اپنے دور میں سلگتے ہوئے فتنوں کو بھانپ گئے تھے اور آپ کی نگاہ دور بین آنے والے فتنوں کو بھی دیکھ رہی تھی اس لیے بڑے وثوق سے ارشاد فرمایا:

''مشرب پیر حجت نہیں، دلیل کتاب وسنت سے ہونی چاہیے۔''

(تاریخ مشائخ چشت، پروفیسر خلیق نظامی: ۱/۵۸)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۳۴ھ) کی غیرت ایمانی میں فاروقی تمازت بھی موجزن تھی اس لیے آپ نے تو قدم قدم پر اتباع شریعت کا درس دیا، انکار کرنے والوں بلکہ قدرے تساہل کرنے والوں پر آپ کا غضب دیدنی ہے۔ فرماتے ہیں:

''شریعت تمام کمالات کی ماں اور تمام مقامات کا اصل ہے۔''

(مکتوبات، جلد دوم، مکتوب: ۴۶)

- ''صوفیاء کرام کا عمل حل وحرمت میں سند نہیں ہو سکتا۔'' مزید فرمایا: ''یہاں تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ و امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بہتر ہے۔ نہ کہ

ابو بکر شبلی (رحمۃ اللہ علیہ) اور ابو الحسن نوری (رحمۃ اللہ علیہ) کا عمل۔

(مکتوبات، جلد اول، مکتوب: ۲۶۶)

یہاں تک ارشاد فرمایا:

- ''کل قیامت کے روز شریعت کی بات پوچھیں گے اور تصوف کی بات کچھ نہ پوچھیں گے، جنت میں داخل ہونا اور دوزخ سے بچنا شریعت کے احکام بجالانے پر منحصر ہے۔'' (مکتوبات جلد اول، مکتوب: ۲۱۰)

کشف والہام کے کلمات کا بے محابا استعمال نہ صرف یہ کہ شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے میں رکاوٹ بنتا ہے بلکہ عقائد کی حتمیت کو بھی مشکوک بناتا اور ملفوف قسم کی ویدانت کو تقویت پہنچاتا ہے، اس پر مجدد (رحمۃ اللہ علیہ) کا بے باکانہ فیصلہ وہ راہِ مستقیم ہے جس پر چل کر منزل بھی ملتی ہے اور راست روی کی ضمانت بھی مہیا ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

- ''کشف والہام، وحی کے ساتھ ثابت ہوئے احکام کے مخالف ہونے کی صورت میں سراسر خطا اور غلط ہیں، پس اپنے کشف کو علماء کے قول پر مقدم کرنا، حقیقت احکام قطعیہ منزلہ پر مقدم کرنا ہے اور یہ عین گمراہی اور محض خسارا ہے۔''

(مکتوبات، جلد اول، مکتوب: ۲۸۶)

اکابرین کے ان نظریات اور تنبیہات کو پیش نظر رکھا جائے تو تصوف نہ صرف ایک بلند پایہ درجہ علم ہے بلکہ اعمال و افعال کی صیانت کا کفیل بھی ہے، یہی وہ راہِ مستقیم تھی جو اہل تصوف کے ہاں معتبر قرار پائی، اسی کی ترویج و اشاعت خیر کی موجب ہے، بدقسمتی سے بعض ناپختہ کار لوگ اس چشمہ صافی کو اپنے اعمال کی بے توفیقی سے گدلا کر دیتے ہیں جس سے معاندین کو حرف گیری کا موقعہ ملتا ہے، اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ بعض خودسر افراد جن کو اپنے علم و استخراج پر اس قدر ناز ہوتا ہے کہ وہ اپنی جسارت طرازیوں سے اکابر علماء و صوفیاء تک دست درازیاں کرتے ہیں، ایسے لوگ لائق توجہ اس لیے نہیں ہوتے کہ اُن کی حرف گیری سے تو بعض اوقات صحابہ کرام علیہم الرضوان بھی محفوظ نہیں رہے، تصوف

کومتوازی دین قرار دینے والے یہ مدعیانِ دانش وحکمت خودمتوازی دین تراش رہے ہوتے ہیں، صوفیاء کرام ایسے لوگوں کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھے، کیا یہ کم عظمت ہے کہ قرآن وحدیث کے شارحین ان صوفیاء کے دامنوں سے وابستہ رہے اور ان سے کسب فیض کا برملا اظہار فرماتے رہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۶۱ھ) کا یہ ارشاد تو تصوف کی منزلت اور صوفیاء کے حسن عمل کا والہانہ اظہار ہے، آپ حضرت ابو ہاشم کوفی (م:۱۵۱ھ) جن کو سب سے پہلے صوفی کہا گیا کے بارے میں اس قدر عقیدت مندانہ رویہ رکھتے ہیں کہ فرماتے ہیں:

''اگر ابو ہاشم نہ ہوتے تو میں دقائق ریا سے آگاہ نہ ہوتا۔''

اکابر صوفیاء اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ اس سلسلہ الذہب میں کئی سنگریزے بھی شامل ہونے کے مدعی ہیں اس لیے ان کا تحریکی وترغیبی رویہ بعض تنبیہات کو بھی واضح کرتا ہے اگر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۷۲ھ) اس قدر رشدت کے ساتھ متنبہ کر رہے ہیں کہ پکار اٹھتے ہیں ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

تو صوفیاء کے امام مرشد ہجویر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (م: ۴۵۶ھ) تصوف کے دعویداروں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور گروہ اصفیاء کی واضح نشاندہی کرتے ہیں، آپ کا فیصلہ کہ یہ تین گروہ اس طرح تربیت پاتے ہیں:

1- صوفی: یہ وہ شخص ہے جو آپ سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہو، اپنی طبیعت کے قبضہ سے رہائی پائے ہوئے ہو اور حق کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

2- مُتَصَوِّف: وہ متکلّف صوفی جو مجاہدے اور تکلف سے صوفیاء کی صف میں شامل ہو (یعنی ایسا انسان جو صوفیت کے مقام ارفع تک تو نہیں پہنچ سکا مگر

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

خواہش رکھتا ہے کہ یہ بلند مرتبہ پالے، اسی لیے اس کے لیے مجاہدے بھی کرتا ہے اور تکلف کرتا ہے کہ صوفیاء کی صف میں شامل ہو جائے، یہ انسان دھوکے باز نہیں ہوتا خواہش مند ہوتا ہے۔)

3- متصوف: وہ انسان جو دنیاوی مال ومتاع اور عزت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کرے، صفا اور تصوف سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، یہ وہ جعلی صوفی ہے جو صوفیاء کے نزدیک حقیر مکھی کی طرح ہے جو آلودگی پسند ہے مگر یہ شخص غیر لوگوں کے سامنے بھیڑیا ہے کہ اُن سے مال ہتھیا لیتا ہے۔''

(کشف المحجوب، ترجمہ سید غلام معین الدین نعیمی، مکتبہ زاویہ: ص ۷۹)

تصوف اگر تزکیہ نفوس کی تحریک ہے تو اسے ہر حال میں مادی آلائشوں سے پاک رہنا چاہیے، یہ تو حدیث جبرئیل علیہ السلام کے مصداق، تلاشِ احسن کا سفر ہے، خود صوفیاء کرام نے اس کو صفائے قلب کی ایک تحریک ہی سمجھا ہے، یہ الگ بات کہ ہر کار خیر کو یونان، ہند یا مغرب کی خیرات قرار دینے والے اس کی لغوی ترکیب پر بھی کئی رائیں قائم کر چکے ہیں اور اس میں عناصر خیر کو کسی غیر اسلامی تحریک کا چربہ تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر ایک اساسی نقطہ نظر انداز ہوتا ہے کہ اصطلاحات کو یوں منسوب کر کے محدود کرنے کی روش کسی صورت علمی نہیں ہے، یہ اصطلاحی ترکیب، عالم اسلام کے یونان سے تعلق سے پہلے ہی وجود میں آ چکی تھی اور پھر یہ اُن صاحبانِ علم کا حق ہے کہ اپنی اصطلاحات کے مفاہیم کی تحدید کریں، جو صوفی کہلاتے تھے یہ انہی کا حق ہے کہ وہ بتائیں اُن کا یہ نام کیوں پڑا اور کس نسبت سے متعین ہوا، حیرت ہے کہ صوفیاء کرام اس خارجی نسبتوں سے تو آگاہ ہی نہ تھے، اس لیے یہ بحث صرف موشگافی ہی قرار پائے گی۔

آیئے خود اکابر صوفیاء میں سے چند بزرگوں سے اس کلمہ کا مفہوم متعین کرالیں۔

ان اکابر میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد سب کے لیے لائق تسلیم بھی ہے اور گروہ صوفیانہ کے میلانات کی سچی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

- ''تصوف باب تفعل سے ہے جس کی خاصیت تکلف ہے۔ صوفی اپنے نفس پر تکلف اٹھاتا ہے۔ اس لیے صوفی ہے۔''

پھر فرماتے ہیں:

- ''صوفی وہ ہے جو اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب کر لیتا ہے اور اپنی طبیعت کو آلائشوں سے پاک کر لیتا ہے۔''

ایک شیخ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

- ''وہ شخص جو محبت میں مصفا ہوتا ہے صافی ہے اور وہ شخص جو محبت میں غرق ہو اور غیر سے بیزار ہو صوفی ہے۔''

ابو الحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

- ''تصوف تمام نفسانی لذات سے ہاتھ کھینچنے کا نام ہے۔''

حضرت محمد بن علی بن امام حسین رضی اللہ عنہم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ

- تصوف خلق ہے جو تم سے خلق میں برتر ہے وہ تم سے تصوف میں بھی برتر ہے۔''

(کشف المحجوب، باب سوم، تصوف)

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ تصوف کوئی درآمد کی گئی جنس علم و عمل نہیں، یہ خالصۃً اسلامی تعلیمات سے ترتیب پایا ہوا طریقہ عبادت ہے جو انسان کے باطن کو مصفی کرتا ہے اور ظاہر کو مہذب بناتا ہے، صوفی معاشرے کا وہ برگزیدہ فرد ہوتا ہے جس کی ہر ادا سے شریعت اسلامیہ کا حسن آشکار ہوتا ہے اور جس کا وجود انسانی معاشرے کی تطہیر کے عمل کو خیر و برکت عطا کرتا ہے، تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کتنے معاشرے ایک صوفی کی تشریف آوری سے فلاح پانے والے بن گئے اور کس قدر باغی معاشرے اطاعت شناسی کے جوہر سے تابدار ہو گئے، اسلام عرب سے خیر و فلاح کا پیغام بن کر معلوم دنیا کے طول و عرض میں پھیلا تو اس کے تمکن اور رسوخ میں صوفیاء نے بھی اپنا کردار انجام دیا، گفتگو کو برصغیر کے حوالے سے محدود کرتے ہوئے آئیں صوفیاء کی برصغیر میں آمد کا جائزہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

لیں تا کہ اُن کی کرم بخشیوں کے اعتراف میں کوئی وسوسہ حائل نہ ہو مگر اس سے پہلے ایک نظر اکابر صوفیاء کے عہد بہ عہد تسلسل پر، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ تحریک محبت کسی ایک دور کی اسیر نہیں رہی، یہ اہل درد اسلامی تاریخ کا وہ حوالہ ہیں جو کبھی منقطع نہیں ہوا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی اس تحریک کے بانی ہیں مگر انہوں نے صحابیت کے سوا کوئی تعارف پسند نہ کیا، صوفی کہلانا دورِ صحابہ کے بعد کی بات ہے جیسے وہاں مفسر، محدث، فقیہ، متکلم غرضیکہ کوئی نسبت بھی رواج نہ پا سکی، تو کیا اس بنیاد پر مفسرین، محدثین اور فقہاء کو نظر انداز کر دیں گے؟ تعارف وشناخت حالات وضرورت کے حوالے سے رواج پاتے ہیں، اسی طرح تصوف اور صوفیاء کے لاحقے بھی اختیار کئے گئے، یہ غیر اسلامی اقدام نہ تھا، شناخت کے مراحل کی ضرورت تھی جو دورِ اول ہی میں شہرت پا گئے تھے، حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۰ھ) کا اسم گرامی اس سلسلۂ رشد میں سرفہرست ہے، آپ کی شناخت علم حدیث اور عربی ادب کے حوالے سے بھی معتبر ہے مگر آپ کا اہم تر حوالہ تصوف قرار پایا کہ متعدد سلاسل اولیاء آپ سے ہی منسوب ہوئے، آپ کے ہی فیضان سے حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۲۸ھ) اور حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۵۶ھ) دنیائے تصوف کے امام قرار پائے، یہ تصریح کی جا چکی کہ سب سے پہلے جس بزرگ کو صوفی کا لقب ملا وہ حضرت ابو ہاشم کوفی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۵۱ھ) تھے جن کی بے ریا اطاعت شعاری کا اعتراف کیا گیا، حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۶۰ھ)، حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۵۶ھ)، حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۹۴ھ) دنیائے تصوف کے آفتاب و ماہتاب ہیں، یہ سلسلۂ کرامت ابتدا ہی سے معروف ہو گیا تھا اور ملت اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، ان کے بعد یہ قافلۂ رشد مسلسل رواں دواں رہا، حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۰۱ھ) حضرت حاتم الاصم رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۳۷ھ)، حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۴۰ھ)، حضرت حارث المحاسبی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۴۳ھ)، حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۵۳ھ)، حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۶۱ھ) جو شیخ الطائفہ کہلائے اور جن

کے ظہور کو علامہ اقبال مرحوم نے مردانِ حق میں ایک معتبر وجود قرار دیا، حضرت سہل تستہری رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۸۳ھ)، صاحب علم وحکمت اور حامل کمال و جمال حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۹۷ھ) اور خواجہ ممشاد علو دینوری رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۹۸ھ) اور ایسے ہی دیگر اکابر کے نام سے تیسری صدی ہجری جگمگا رہی ہے، چوتھی صدی ہجری کی ابتداء ایک ہنگامہ خیز اعلان سے ہوئی کہ انا الحق کے دعوے نے پوری ملت اسلامیہ میں ارتعاش کو جنم دیا، حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ (م:۳۰۹ھ) صوفیاء کرام کی صف میں ایک ایسا نام ہے جس کے حوالے سے گروہ بندی بھی ہوئی اور علمی جدلیت کے معرکے بھی ہوئے، اس تمام اضطراب سے یہ بات تو نمایاں ہوگئی کہ ملت ہر دعوے کو اسلامی تعلیمات کی میزان پر پرکھتی ہے اور تصوف کے بڑے سے بڑے نام کو بھی ماوراء شریعت شمار نہیں کرتی، اس رویہ سے جہانِ تصوف میں شریعت کی بالادستی کا قرار ملتا ہے، یہی دین کا تقاضا ہے کہ اعلان ہو یا عمل سب کو مطیع ومنقاد رہنا چاہیے، حضرت ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ (م:۳۲۹ھ) جو خواجہ ممشاد رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے سلسلۂ چشتیہ کا اولین حوالہ اور شناخت قرار پائے، ابو القاسم القشیری رحمۃ اللہ علیہ (م:۴۶۵ھ) نہ صرف یہ کہ خود صوفی تھے بلکہ آپ حلقۂ تصوف کی معروف ومعتبر کتاب رسالہ قشیریہ کے مؤلف بھی تھے، یہ دور اگرچہ سیاسی اعتبار سے نمایاں رہا مگر تصوف کے آستانوں میں پہلے سا جلال موجود نہ تھا۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (م:۴۶۵ھ) کا نام پانچویں ہجری کے اکابر صوفیاء میں سرفہرست ہے جن کی تالیف کشف المحجوب کو علم تصوف کا شاہکار گردانا گیا ہے، کشف المحجوب کا حرف حرف شہادت دے رہا ہے کہ اس کا مؤلف علم شریعت سے بھی آگاہ تھا اور علم طریقت کی راہوں کو بھی پہچانتا تھا، ایسا مؤلف جو موضوع کے ہر گوشے پر نظر رکھتا اور اس کو واشگاف کرنے میں مہارت رکھتا تھا، کشف المحجوب، دورِ تالیف سے آج تک اپنی علمی سطوت برقرار رکھے ہے کہ یہ مرشد ہجویر کی عطاؤں کا خوانِ نعمت ہے۔

چھٹی صدی ہجری تصوف کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے اس لیے کہ

عباسی حکومت دورِ عروج سے گزر کر عصرِ زوال میں داخل ہو چکی تھی، مرکزیت کی سطوت لڑکھڑا رہی تھی اور علاقائی قوتیں سر اٹھا رہی تھیں سیاسی انتشار تھا ہی مگر اس میں ذہنی پراگندگی اور قلبی بے قراری بھی شامل ہوگئی تھی، نظریات، فلسفیانہ حملوں کے سامنے پسپا ہو رہے تھے، ملت زبوں حال تھی اور علمی دنیا بے توفیق ہوتی جا رہی تھی کہ ایک نابغۂ عصر ظہور پذیر ہوا، حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۰۵ھ) کا وجود ایک لائق اعتماد سہارا ثابت ہوا، تصوف کا چشمہ صافی متعدد تعفن آفرین غلاظتوں سے اٹا جا رہا تھا، امام جو حجۃ الاسلام کہلائے، نے اس کو نہ صرف یہ کہ پاکیزگی عطا کی بلکہ اس کے پھیلاؤ کو بے کنار ہونے سے بچا لیا اور حدود آشنا کیا، داخلی منظر نامہ جو غبار آلود ہو رہا تھا اُسے یوں صاف کیا کہ ہیجانی رویئے خالص علمی مباحث بن گئے، حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جب اپنی علمی تب و تاب کو سمیٹتے ہوئے بغداد سے رخصت ہو رہے تھے تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بغداد کی آبرو بن کر تشریف لا رہے تھے، آپ نے علمی رویوں کو استحکام بھی عطا کیا اور ان کی علمی صورت گری کو روشن تر بھی بنایا، تصوف ایک مرتبہ پھر پوری آب و تاب سے دلوں کو تسخیر کرنے لگا۔

ساتویں صدی ہجری میں شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۲۷ھ)، شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۲ھ)، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۳ھ)، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۳ھ)، حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۶۴ھ)، حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۶۱ھ)، حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۷۲ھ)، حضرت شیخ حمیدالدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۷۳ھ)، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۷۸ھ)، حضرت علاؤ الدین علی بن احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۸۹ھ)، حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۹۲ھ) اور کئی دیگر اکابر آسمانِ تصوف کے نیر تاباں بن کر طلوع ہوئے اور مسلم امت کو راہ ہدایت پر قائم رہنے کا حوصلہ عطا کرتے رہے، یہ وہ دور ہے جس

میں سلاسل تصوف کی الگ الگ شناخت بھی قائم ہوئی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے قادریہ سلسلہ کی نسبت بھی قائم ہوئی اور اس کو فروغ بھی حاصل ہوا، شیخ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۳۲۹ھ) سے سلسلہ چشتیہ معروف ہوا، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے سہروردی سلسلہ منسوب ہوا، حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلہ نقشبندیہ کو شناخت ملی، یوں کہہ سکتے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری کے اختتام سے پہلے ہی معروف سلاسل تصوف اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

صوفیاء کرام برصغیر میں

۶۰۳ھ سے عالم اسلام سیاسی زوال کی طرف بڑھنے لگا اور جب منگول حملہ آور ہونے لگے تو زوال تیز تر ہو گیا ۹۳۲ھ تک پورا عالم اسلام سیاسی موت مر چکا تھا، ریاستیں ایک ایک کر کے سپر انداز ہو رہی تھیں۔ منگول جو خون آشامی کی نئی روایات قائم کر رہے تھے کہ انہیں گردنیں کاٹنے کے سوا کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بڑے بڑے سرفراز خاک کا رزق بنے، اس دور کا ادب ملت کے کراہنے کی آوازوں سے اٹا پڑا ہے، خلفشار کے اس ہولناک عہد میں نہ سماج رہا نہ سماجی رویہ، علم کی دنیا بھی اجڑی اور عمل کی بساط بھی لپیٹ لی گئی، عقائد تھرانے لگے تو نظریات بے قیمت ہونے لگے، افراد جب جان کی حفاظت کی تگ و دو کرنے لگیں تو اجتماعی فلاح کا تصور کب قائم رہتا ہے، عالم اسلام کی حالت ایک ادھ کٹے مینڈھے کی سی تھی کہ نہ کھڑے ہونے کی ہمت تھی اور نہ اُسودۂ خاک ہونے کی سہولت تھی، ایسے میں سب سرمایہ ملت اجڑ رہا تھا یہ وہ لمحۂ اضطراب تھا جب بالغ نظر مصلحین کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت صرف صوفیاء باتمکین ہی پوری کر سکتے تھے مگر مشکل یہ تھی کہ صوفیاء کے مراکز خیر، چوپائی شر کے گھیرے میں تھے، وقت مہلت نہ دے رہا تھا اور فیصلوں کی تاخیر کا متحمل نہ تھا، یہ صوفیاء کی بالغ نظری تھی کہ انہوں نے مراکز صحت کو یقین کے ماحول سے دور لے جانے کا فیصلہ کر لیا، جب زاویہ نشینی بھی محفوظ نہ رہی تو عافیت کدہ تلاش کیا جانے لگا، اس عہد ناصبور میں برصغیر ہی پُرامن خطہ تھا جہاں شخصی ہی سہی مسلمان حکومت قائم تھی جو منگول حملوں سے محفوظ تھی چنانچہ صوفیاء کی بڑی تعداد برصغیر آ گئی اور پورے خطہ میں پھیل گئی، یہیں سے برصغیر کی حیات نو کی ابتداء ہوئی۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

برصغیر میں ہندومت کا غلبہ تھا اگرچہ بعض تحریکیں اس کے ردعمل میں پیدا ہوئی تھیں جیسے بدھ مت اور جین مت مگر ہندو ویدانت اور ہندو طرز حیات اس قدر غالب تھا کہ کوئی تحریک بھی برصغیر پر اپنی سطوت برقرار نہ رکھ سکی بلکہ جلد یا بدیر ان کو دیس نکالا ملا، مسلمان جب برصغیر میں آئے تو اسی غلبہ کے آثار نمایاں تھے، ہندومت کئی مذاہب کو ہڑپ کر چکا تھا کہ ان گنت خداؤں کو پتھروں میں اُتار کر مندر بھر دیئے گئے، ان میں کسی نئے مذہب کے بانی یا راہبر کے بت کا اضافہ کوئی مشکل مرحلہ نہ تھا، عقیدت مند جب اپنے بڑوں کو مندر کی زینت پاتے تھے تو اُن کے اندر سپر انداز ہونے لگتا تھا اس طرح مذہب کھائے گئے اور تہذیبیں نگلیں گئیں، مسلمانوں کو اس نازک مرحلہ کا سامنا تھا، یہ تو نبی اکرم ﷺ کی منفرد ذات تھی جو ہندو صنم تراشوں سے تراشی نہ جا سکی، بے مثل وجود ان فنکارانہ مثلیت کی تراش سے بھی محفوظ رہا اور یوں عقیدت کی جبینوں کو کوئی امتحان درپیش نہ ہوا، یہ ضرور ہوا کہ ایسی تحریکیں اٹھائی گئیں جن سے وحدتِ ادیان کے تصور کی آبیاری ہوتی رہی اور بعض خام خیال دعویدارانِ تصوف میں عقائد کا جھول بھی پیدا ہوا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تصوف کے جس دعویدار نے اپنی متجسس نگاہ کو دربارِ رسالت کا حصار عطا کیے رکھا وہ اس فریب کا شکار نہ ہوا، یہی تاریخی حقیقت اہل تصوف کو رسالت کی پناہ میں رہنے کی تحریک دیتی رہی۔

برصغیر میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے ورود سے تاریخ تصوف کو وقار حاصل ہوا، اگرچہ آپ سے پہلے بھی برصغیر اہل علم اور اہل دل حضرات کی قدم بوسی سے مشرف ہو چکا تھا مگر جس کی آمد سے تہذیب اسلامی کو استحکام، استقلال اور دوام حاصل ہوا وہ آپ ہی ہیں، برصغیر کو درس و تدریس کی احتیاج بھی تھی جو آپ کی آمد سے پوری مگر اصل ضرورت ایک ایسے مستند نوشتہ کی تھی جو ہمہ وقت راہبری کر سکے، کشف المحجوب اسی ضرورت کے ازالے کے لیے لکھی گئی، تاریخ فکر اسلامی کا ورق ورق گواہ ہے کہ اس کتاب نے ہر دور میں فکر ملت کو توازن عطا کیا، ہمارا موضوع گفتگو چونکہ ایک چشتی بزرگ کی ذات ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ ایک مختصر جائزے کے بعد اسی تذکار پر اپنے آپ کو محدود کر لیا جائے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

برصغیر میں سلسلۂ ہائے تصوف ___ ایک مختصر جائزہ

سلطنت عباسیہ کے زوال ۶۵۶ھ میں مکمل ہوگیا مگر اس کے آثار بہت پہلے سے ہویدا ہونے لگے تھے، ایک کہرام تھا جو پورے عالم اسلام کو محیط ہو رہا تھا، حکومتیں مغلوب ہوتی جارہی تھیں اور فرماں روایا تو قتل ہو رہے یا اذیت ناک قید میں ڈالے جارہے تھے، عباسیہ کی آخری صدی میں یوں محسوس ہوتا ہے، موت نواح بغداد ہی میں ٹھہر گئی تھی، تخت نشینی کا خمار ابھی تازہ ہی ہوتا تھا کہ موت کی جھنکار سنائی دینے لگتی تھی، یہ فضا کسی مثبت رویے کی متحمل نہ رہی تھی اس لیے ہجرت ایک معمول بن گیا تھا، برصغیر کو نسبتاً گوشۂ عافیت خیال کیا گیا اس لیے اس جانب ہجرت کرنے والے قافلے رواں ہوگئے، ان قافلوں میں اصحاب علم بھی تھے اور ارباب فن بھی، انہی کے ساتھ عالم اسلام نے اپنے قلبی طبیب بھی روانہ کر دیئے تھے، اکابر صوفیاء چشت میں جو بزرگ تشریف لائے اُن کے سرخیل حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے دم قدم سے برصغیر سلسلۂ چشتیہ کی جولاں گاہ بنا، پھر ایک طویل اور نمایاں سلسلہ برصغیر کے گوشے گوشے میں دین مبین کی خدمت میں مشغول ہوا اور چشتیہ ذوق کی خوب آبیاری ہوئی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ تو صف مہاجرین میں سے ہی تھے، آپ سے یہ سلسلہ اجمیر سے دہلی آ گیا اور مرکز حکومت میں اشاعت دین کا فریضہ انجام دینے لگا، دہلی سے اس سلسلہ کے امام حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے پاکپتن کو مرکز بنایا، آپ سے یہ سلسلہ خوب پھیلا بلکہ زیادہ تر خانقاہیں آپ ہی سے فیض یاب ہوئیں مثلاً حضرت علاؤ الدین صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ

اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ، اسی چشمۂ تصوف سے فیض یاب ہوئے، جن کی مساعی نے برصغیر کو ترویج اسلام کے لیے موافق ماحول مہیا کر دیا۔

آٹھویں صدی ہجری میں حضرت بوعلی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۲۴ھ)، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۶۵ھ)، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۵۷ھ)، حضرت سید علی الھمدانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۸۳ھ)، حضرت سید جلال الدین مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۸۵ھ) کے نام آسمانِ تصوف کے درخشندہ ستارے ہیں۔

نویں صدی ہجری میں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۰۸ھ)، حضرت خواجہ گیسودراز رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۲۵ھ) کا فیض خیرہ کن رہا، یہی دور تھا کہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۰۰ھ) کے افکار ونظریات نے برصغیر کو متاثر کیا، آپ کا ذکر مقامی خانقاہوں میں اس محبت وعقیدت سے ہوا کہ آپ برصغیر کے فرد ہی شمار ہونے لگے، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کے مراکز میں مدح رسالت کو یوں رواج دیا کہ استقامت عقیدہ کو حیاتِ تازہ ملی،

دسویں صدی ہجری میں جو بزرگ نمایاں ہوئے اُن میں سے چند کے اسمائے گرامی ہیں:

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۴۴ھ)، آپ ہی کے بعض فرمودات تصوف کے حلقوں میں وجہ مجادلت بنے، حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۷۹ھ)، حضرت سید موسیٰ پاک شہید قادری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸۵ھ)، آپ برصغیر پاک وہند کے سب سے بڑے محدث حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۷۳ھ) کے مرشد تھے۔

گیارہویں صدی ہجری میں نمایاں تر بزرگوں میں سلسلۂ نقشبندیہ کے برصغیر میں سرخیل حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۱۲ھ)، خاندان قادریہ کے معروف بزرگ حضرت شاہ ابو المعالی قادری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۲۴ھ) اور برصغیر پاک وہند ہی نہیں افغانستان اور ماوریٰ نہر

تک شریعت وطریقت کی ترویج و اشاعت کا نادر وجود حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۳۴ھ) شامل ہیں، حضرت میاں میر قادری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۰۴۵ھ)، خواجہ معصوم رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۰۷۹ھ) اور حضرت شاہ نعمت اللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۷۵ھ) بھی ان اکابر میں معروف اور لائق استفادہ بزرگ تھے۔

بعد میں حضرت سلطان باہو قادری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۰۳ھ) نے تصوف کے حلقوں میں بڑی منزلت پائی، حضرت مولانا فخر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۱۹۹ھ)، خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۲۰۵ھ) کی وساطت سے چشتیہ سلسلہ تونسہ شریف، کوٹ مٹھن شریف، حاجی پور شریف، ملتان شریف، سیال شریف، کولڑہ شریف اور کئی دیگر آستانوں کی زینت بنا، حضرت خواجہ نور محمد چوراہی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۲۶۸ھ) سے سلسلہ نقشبندیہ اس قدر عام ہوا کہ علی پور سیداں کے دونوں گھرانے، الوہار، ملکھڈ کے علاوہ متعدد آستانے آباد ہوئے شرق پور، کرموں والا، کیلیاں والا اسی سلسلۂ فیض کے مظاہر ہیں، ترویج اسلام اور صیانت عقائد کے یہ مراکز کئی صورتیں اختیار کر چکے ہیں انحطاط کا عمل بھی تیزی سے جاری ہے مگر امیدیں بھی انہیں آستانوں سے لگی ہوئی ہیں۔ ہماری اس ساری گفتگو کا مقصود یہ ہے کہ ہر صاحب نسبت اُن کارناموں سے آگاہ رہے جو صوفیاء کرام نے بے پناہ محبت اور عقیدت سے اشاعت دین کے لیے انجام دیئے ہیں تاکہ یہ ولولہ ہر دور میں اصحاب عقیدت میں برقرار رہے اور فیضانِ رسالت کی منور مہکار ایمانی جذبوں کو شاداب رکھے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

متوجہ کرنے لگی، یہ تو قسمت و توفیق کی بات تھی کہ کون سعادت مند ہوا، یہاں نقشبندی بزرگ آئے، قادری اکابر بھی تشریف لائے، سہروردی سلسلہ کے بعض زعماء بھی وارد ہوئے اور سلسلہ چشتیہ کے نمایاں راہنما بھی، جس بزرگ یا گروہ کا بھی تذکرہ کریں باعث خیر و برکت ہے مگر چونکہ گفتگو کا سلسلہ صرف چشتیہ اکابر تک محدود ہے کہ ہمارا مطلوب فرد فرید اسی سلسلۂ تصوف سے اتصال رکھتا ہے۔

تاریخ تصوف کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سلاسلِ تصوف کا مرکز وحید اور وجود اساسی حضور اکرم ﷺ کا وجود ہی ہے اس لیے اس تاریخ دلپذیر کا آغاز نبی محترم ﷺ کے حوالے سے ہی کرتے ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

محمد رسول اللہ ﷺ

تخلیق کائنات کا وہ شاہکار وجود، جو وجہِ تخلیق بھی ہے اور باعث تکوین بھی، وہ وجود گرامی حضرت محمد ﷺ کا ہے، اولین تخلیق کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے اور خاتم رسولاں ہونے کا شرف بھی آپ کو عطا ہوا ہے، حیات ظاہرہ میں اس وقت تشریف لائے جب مخلوق کا ہر فرد اور ہر مظہر کسی ہمہ کرم وجود کے لیے سراپا دعا تھا، انبیاء کرام علیہم السلام مسلسل نوید سحر دے رہے تھے اور رحمت پروردگار سب کو حصار رحمت میں لینے پر آمادہ ہو رہی تھی، ۱۲ ربیع الاول، پیر کا دن جبکہ ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا کہ آثار رحمت کے سحر آسا آثار نمودار ہونے لگے تھے، مکہ مکرمہ کا مقدس شہر، حرم کی اطاعت آشنا وادی، قریش کا برگزیدہ گھرانہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، جو عظمت آثار گھرانے کے چہیتے فرزند تھے کا سایہ اور حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی طہارت مآب اور وفا آشنا کود تھی کہ آپ تشریف لائے

بصد انداز یکتائی بغایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہ کی کود میں آئی

مضطرب دنیا کو راحت و آرام کا پیغام ملا، شرک مست ماحول کو توحیدی فضا کی نوید ملی، خیانت امانت میں بدلی تو کذب نے صداقت میں ڈھلنے کا انقلاب دیکھا ؎

وہ آئے جن کے آنے کی زمانے کو ضرورت تھی
وہ آئے جن کے آنے کے لیے بے تاب فطرت تھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

عرب ہی نہیں پوری دنیا میں اخلاقی و روحانی انقلاب برپا ہوا، شوریدہ سر کفر نے راستوں میں کانٹے بچھائے، انانیت پرست شرک نے پتھروں کی بارش کی مگر ردعمل باوقار بھی تھا اور پُر جلال بھی ؎

وہ نبی جو پاک تھا معصوم تھا نردوش تھا
قوم پتھر مارتی تھی اور وہ خاموش تھا

ظلمت کے بادل، نور کی برسات سے یوں چھٹے کہ ہر طرف اخلاق و کردار کی نورانیت ہویدا ہوئی، پھر کیا تھا چند ماہ وسال ہی گزرے تھے کہ وہ ہاتھ جو سنگ لیے گھات میں ہوتے، سر راہ کھڑے عقیدتوں کے پھول نچھاور کر رہے تھے، حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کی باکرامت رضاعت سے شعب ابی طالب کی مشقتوں تک کا سفر تاریخ عزیمت کا درخشاں باب ہے، اس میں سفر تجارت کی راعنایاں بھی ہیں اور حلف الفضول کی حمایت کی تابانیاں بھی، حجر اسود کی تنصیب میں صدق و امانت کا اعتراف بھی ہے اور شعب ابی طالب کی جانگسل منزلوں کا اعلان بھی، مکہ مکرمہ میں صداقت نا آشنائی کا ایک غبار ہے جو مسلسل گھیرا تنگ کر رہا ہے، پتھروں کا حصار ہے جو راستوں کو مسدود کر رہا ہے، کانٹوں کے ڈھیر ہیں جو ''حمالة الحطب'' کی صورت ہر راہ گزر پر کھڑے ہیں، کفر مجتمع ہو کر خیر کے آگے بند باندھ رہا ہے۔ تلواریں بے نیام ہو کر خوں آشام ہونے کو بے تاب ہیں مگر وہ وجود محترم سب سے بے نیازیوں اپنے مشن پر رواں دواں ہے کہ تاریخ انسانی کا قاری دم بخود ہے، استقلال کا اک کوہ گراں ہے کہ معاند ہواؤں کو کسی شمار میں نہیں لاتا، فیض بخشی کا کوئی لمحہ، حالات کے جبر سے گریزاں نہیں، دین کی قوت مسلسل ظفر مندی کے نشان ثبت کر رہی ہے کہ یہی مقصود مشیت ہے، نبوی قوت کو فاتح قرار پانا ہے اور رسالت کے سایوں کو وسیع تر ہونا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت ہی اس شان کا تھا کہ

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

''اور ہم نے آپ کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

لازم تھا کہ ''رحمت تمام'' سب حصار توڑ ڈالے تا کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کی غایت کو

پا سکے اور احسن تقویم ہونے کا حق ادا کر سکے، اسی فیضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا ؎

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم یدیم
از رسالت مصرعہ موزوں شدیم
از رسالت درجہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

تیرہ سال کی مسلسل محنت کے بعد مرکز یقین مدینہ منورہ منتقل ہو گیا، یہ حالات کا تقاضا بھی تھا، اشاعت دین کی برق رفتاری کا وسیلہ بھی اور تا قیامت راہنمایانِ ملت کے لیے کامرانیوں کا ایک باوقار اُسوہ بھی، ہجرت سے راستوں میں کشائش آئی، غزوات کا ایک طویل سلسلہ تو شروع ہوا مگر ہر غزوہ کامرانیوں کی تمہید بنتا گیا، بدر ہو یا اُحد، حربی کیفیات کے مظاہر مختلف مگر بباطن ایک ہی معیار کے حامل تھے کہ حالت جنگ ہو یا لمحۂ امن قوم کہ ہر حالت میں اتباع رسالت، کے مشن پر کاربند رہتا ہے، غزوہ احزاب، کفر کی چیرہ دستیوں کا آخری شاخسانہ تھا، استقامت جب معیار قبولیت کو پالیتی ہے تو قدرت کا ہر مظہر معاون بن جایا کرتا ہے، یہی ہوا کفر کی مجموعی قوت کا شیرازہ یوں بکھرا کہ بکھرتا ہی گیا، صلح حدیبیہ جو ۶ ہجری میں واقع ہوئی، اعترافِ قوت کا علان تھی، فتح مکہ (۸ ہجری) جزیرہ نمائے عرب ہی نہیں پوری دنیا میں شوکتِ اسلام کا مظہر تھا، حجۃ الوداع (۱۰ھ) نے تعلیماتِ اسلام کی جامعیت کا پرچم یوں لہرایا کہ خطبۂ حج، ہر دور کے لیے منشور انسانیت قرار پایا،

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئس سالہ اعلان نبوت کی زندگی کا ہر لمحہ تو مژدۂ نجات تھا ہی مگر آپ کی مکی زندگی کے شب و روز نے بھی دین کی سطوت کو راسخ کرنے کے لیے وہ تمہیدی کردار انجام دیا کہ ان ایام کو بعد کی تبلیغی زندگی کے لیے لائق حجت قرار دیا گیا،

WWW.NAFSEISLAM.COM

یوں ایک ایسی **ملت** تشکیل پائی جو انسانیت کے لیے راہنما تھی، یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ انسانی فلاح کا ہر پہلو نبوی حیات سے ہی سرخرو ہوتا ہے، کہ اسی کو اُسوہ بنایا گیا ہے، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی جانب ارشادہ کرتے فرمایا تھا ؎

حلقۂ ملت محیط افزا ستے
مرکز او وادیٔ بطحا ستے
مازحکم نسبتِ او ملیتم
اہل عالم راہیام رحمتم

یہ ضرورت کس طرح پوری ہوئی؟ پیام رحمت کس طرح اہل عالم تک پہنچی؟ یہ تاریخ کے طالب علم کے لیے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے، تاریخ کا تناظر واضح کر رہا ہے کہ اگر کسی فرد یا قوم کو انسانی عظمتوں کے جلو میں زندہ رہنا ہے تو اُسے قاسم نعمت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کو مستحکم اور آپ کی اطاعت کو لازم کرنا ہوگا، یہی پہلی نسلوں کی ضرورت تھی اور یہی آئندہ اور موجود نسلوں کی ضرورت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سادہ زندگیاں کس طرح ارفع منزلتوں کی حق دار ٹھہریں یہ ہر قاری کے سامنے ہے، سب کو غور کرنا ہے کہ کس طرح

- بوریا نشیں، مسند نشیں بنے۔
- آداب سے نا آشنا، معلم آداب بنے۔
- علم کی دولت سے محروم بستی، مرکز علم و دانش بنی۔
- جو خود راہ شناس نہ تھے دوسروں کے راہبر بنے۔
- جن کو ایک قبائلی ریاست قائم کرنے کی توفیق نہ تھی عالمی ریاست قائم کرنے کے اہل قرار پائے۔
- اعتراف کرنے والے ابو بکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم ہوئے تو
- انکار کرنے والے ابو الحکم کہلاتے ہوئے بھی ابو جہل ہو گئے۔
- اپنی اصلاح سے غافل، دوسروں کی اصلاح کی کفالت کرنے لگے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

یہ سب اس لیے ہوا کہ بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

دین فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کا ہر گوشہ اصلاح انسانیت اور انقلابِ خیر کی ضمانت بنا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نسخۂ کیمیا کو حرزِ جاں بنایا تو وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو انسانی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے، سب جانتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس ماحول میں زندگی گزار چکے تھے وہ تہذیبی نشو ونما کا ماحول نہ تھا، وہاں علم کدے آباد نہ تھے، وہاں صنعت وحرفت کے مراکز موجود نہ تھے، ایک صحرائی زندگی جو ہمیشہ بقائے ذات کے حصار میں رہتی ہے، ایک بے آب وگیاہ خطۂ زمین جہاں کونپل کونپل کی محتاجی راہ کاٹتی ہے، وہ سرزمین کا ٹکڑا جو بقول مولانا حالی ؏

جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا

ریت کے سمندر تھے اور بے توفیق سطح ارض، اسی لیے تو کسی طالع آزما نے کبھی ادھر کا رُخ نہ کیا تھا مگر پھر کیا ہوا ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

ایسی رحمت کی گھٹا چھائی کہ توفیق کا ہر در اسی سرزمین پر وا ہوا، رحمت عالمین ﷺ کی آمد نے عرب کو مرکز حیات بنایا، ہر سعادت وہاں سے پھوٹی اور اصلاحِ انسانیت کی ہر تحریک نے وہاں سے جنم لیا، نبی کریم ﷺ کے نبوی فرائض میں تزکیہ کو اہم مقام حاصل ہے کہ اس کے بغیر تعلیم کا کوئی رُخ بارآور نہیں ہوتا، قرنِ اول کا ہر فرد ہر چہار فرائض کی بجا آوری میں شریک ہوا مگر جب شخصیات میں ہمہ جہت راہنمائی بہر طور یکساں نہ رہی تو تقسیم کار ہوگئی، اس طرح تعلیم کے شعبے بھی مختلف بزرگوں میں مختلف روپ لیتے رہے، اگر کسی نے تلاوتِ آیات کو مشن بنایا تو کسی نے تعلیم کتاب پر زیادہ توجہ دی کوئی تعلیم

WWW.NAFSEISLAM.COM

حکمت کا ماہر قرار پایا تو کسی نے تزکیہ کے منصب پر زیادہ توجہ دی۔ اس طرح تزکیہ نفوس کے شناور اپنی الگ شناخت کرنے لگے اور مختلف سلاسل صوفیاء وجود میں آئے۔ ہمارا مقصود چونکہ سلسلہ چشتیہ کے فرد فرید کا تذکرہ ہے اس لیے اس سلسلۂ تصوف پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اکثر سلاسل اولیاء کی باب رسالت تک رسائی حضرت کے وسیلے سے ہے، سلسلہ چشتیہ بھی آپ ہی کی نسبت سے اپنے سلسلہ کی شناخت رکھتا ہے اور اس حوالے سے رسالت مآب ﷺ سے روحانی فیض کا داعی ہے اس لیے مرکز کائنات ﷺ کے ذکر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

اللہ تعالیٰ اس سلک مروارید محبت سے فیض رسانی کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا وجود متعدد حیثیتوں سے تاریخ انسانیت میں معتبر قرار پایا ہے، داستانِ عزم و ہمت ہو یا حکایت صبر و استقلال، نیک نفسی کا تذکرہ ہو یا ایثار و قربانی کا بیان، عظمت کردار کی روایت ہو یا تعمیر سیرت کا مرحلہ، معاشرتی رویوں کا ذکر ہو یا سماجی امانت و دیانت کا حوالہ، ہارونِ رسول ﷺ کی ذات بہر طور نمایاں ہے۔ ترسٹھ سالہ زندگی کا ورق ورق شہادت دے رہا ہے کہ رفعت و عظمت ہمہ وقت ہالہ کناں رہی ہے، ولادت سے شہادت تک کا ہر لمحہ منزلتوں کے چراغ روشن کر رہا ہے، مولود کعبہ ہونا ہی وہ شرف ہے جو ہر مقیاس سے بالاتر ہے، شہید مسجد ہونے کا اعزاز بھی فوز و کامیابی کی ہر نوید سے عظیم تر ہے، سیرت و کردار کا ہر پہلو تابدار ہے کہ اُس پر بندۂ مولا صفات ﷺ کا دست شفقت ہر آن مہربان رہا ہے۔ تاریخ عزیمت شاہد ہے کہ حیدر کرار رضی اللہ عنہ کی ساری زندگی اور آپ کی ذات و صفات کا ہر پہلو، حصار نبوت میں رہا ہے، اسی لیے تو کسی پہلو کا تذکرہ کریں مہکار اُسی رحمت تمام ﷺ کی ہی عطر بیز ہے۔

آپ کا اسم گرامی ''علی'' آپ کے علو منزلت کی دائمی شہادت ہے، والد گرامی حضرت ابو طالب، نبی اکرم ﷺ کے چچا، حضرت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے، والدۂ محترمہ فاطمہ بنت اسد، نبی آخر الزمان ﷺ کی نہایت مہربان چچی تھیں، روایت ہے کہ والدہ محترمہ نے ہی آپ کا نام اسد رکھا تھا، ۱۰ھ قبل اعلان نبوت آپ کی پیدائش ہوئی،

WWW.NAFSEISLAM.COM

اعلان نبوت کا پہلا آوازہ ہی گوش گزار ہوا تو حظیرۂ اسلام میں آ گئے، خوش بختی کی انتہاء یہ ہوئی کہ بچپن ہی میں کفالت کی ذمہ داری نبی رحمت ﷺ نے اٹھالی، اس طرح تربیت کے تمام مراحل سایہ نبوت میں طے ہوئے، پچیس سال کے ہوئے تھے کہ خاتون جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہو گیا، آپ کا سارا گھرانہ ہی دین کی خدمت اور رسالت مآب ﷺ کی خدمت کے لیے وقف رہا، حضرت ابو طالب کے ایثار کو کون نظر انداز کر سکتا ہے کہ آپ نے تقریباً چوالیس سال حفاظت و رفاقت کا حق ادا کیا، حضرت عقیل اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم کی قربانیاں تاریخ اسلام کا زریں باب، ہیں، بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا کی رسالت پناہ ﷺ سے عقیدت و محبت کا تو زمانہ معترف ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں ہر غزوہ میں نمایاں خدمات انجام دیں، غزوہ بدر میں مبارزت میں پیش قدمی کرنے والے آپ تھے تو غزوہ خیبر میں علم دار اسلام ہونے کا اعزاز بھی آپ کو حاصل ہے، نبی اکرم ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد عہد خلفاء ثلاثہ میں آپ کا کردار حامیٔ اسلام، غازی ملت اور مشیر خلافت کا رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ مسند خلافت پر خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے رونق افروز ہوئے، معاشرتی حالات حد درجہ دگرگوں تھے، بلوائیوں نے ہر طرف ایک شورش بپا کر رکھی تھی۔ حیدر کرار رضی اللہ عنہ نے نہایت دردمندی کے ساتھ ملت کے اضطراب کو فرو کرنے کی سعی کی مگر حالات بیرونی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے گھمبیر ہو چکے تھے، خوارج جان کے دشمن تھے اور پوری ملت کے خلاف متشددانہ رویہ اپنا چکے تھے، آخر یہ سازش انتہا کو پہنچی۔ ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ھ کو ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم فجر کے دھندلکے میں مسجد کوفہ میں تیز تلوار کی ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا، سر کے درمیان پوری قوت سے پڑنے والی تلوار نے سر کو دو قاش کر دیا اور ملت اسلامیہ کا مرد میدان فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَۃ کا اعلان کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا اور شہادت کی منزلت کو سرخرو کر گیا،

حضرت علی رضی اللہ عنہ، فیضانِ نبوت سے انتہائی قرب کی کیفیات سے فیض یاب

ہوئے ہیں، خود نبی اکرم ﷺ نے آپ کی منزلت اور قرب کا اظہار فرماتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اے علی رضی اللہ عنہ تیرا میرے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا، یہ بھی فرمایا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کے دروازے ہیں" بابِ علم سے علم کی نمود اور اشاعت اس قوت سے ہوئی کہ اک جہان مستفید ہوا آپ کے صاحبزادگان دین کی نشر و ترویج میں ہمہ وقت مصروفِ عمل رہے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لختِ جگر حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کے رخِ کردار کا ہر گوشہ نورِ علی نور ہے، ان سے ہی فیضانِ مرتضوی کو وہ استحکام حاصل ہوا کہ اہل نظر کو بھی اعتراف رہا ع

حقا کہ بنائے لا الہ است حسین رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ارشادات و خطبات کے ذریعے سے حکمت دین کے کئی در وا کیے ہیں اس لیے نبوی سرپرستی اور قرآنی آیات سے مسلسل شغف نے آپ کے اندر جہاں فصاحت کلام کا جوہر پیدا کیا تھا وہاں قلب و نظر کی روحانی تربیت کی صلاحیت بھی اُجاگر کر دی تھی، یہی وجہ ہے کہ سلسلہ ہائے تصوف کے بیشتر مظاہر کا آپ کی ذات ہی سے تعلق ہے، خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اسی بحرِ علم سے فیض یاب ہیں جو صوفیاء کے امام اور سرخیل قرار پائے، سلسلۂ چشتیہ کے موسس اور بانی آپ ہی ہیں۔

حضرت خواجہ حسن البصری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۱۰ھ)

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دنیائے تصوف میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، فتوحاتِ عراق کے زمانے میں آپ کے والد اسیر ہوکر مدینہ منورہ آئے تھے، کہا جاتا ہے کہ اُن کا نام پیروز تھا اور انہوں نے ''خیرہ'' جو حضرت خواجہ حسن رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ہیں سے شادی کر لی تھی، آپ کی پیدائش 21ھ میں ہوئی، مدینہ منورہ کے علمی ماحول میں پرورش پائی، ہونہار تھے اس لیے بہت جلد عربی زبان وثقافت کے ساتھ ساتھ روحانی منازل بھی طے کر لیں اور علمی وادبی حلقوں میں معروف ہوئے، عربی نثر کے جو نمونے آپ سے منسوب ہیں وہ فصاحت وبلاغت کے نادر نمونے ہونے کے ساتھ ساتھ فکر ودانش کے منفرد نثر پارے ہیں اسی لیے روحانی منزلتوں کے ذکر کے ساتھ آپ کی ادبی حیثیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، عربی نثر کا ذکر آپ کے تذکرے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا، ان نثری نگارشات میں حکمت ودانش کے نایاب جواہر ہیں اور ساتھ ساتھ تربیت فہم وفکر کے بیش بہا آداب ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فیض یابی کے ایصال پر شک کا اظہار کیا تھا جس کا مدلل اور عالمانہ جواب حضرت مولانا فخر جہاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا اور اتصالِ فیض کو ثابت کیا ہے۔ آپ کے نصائح جو عربی ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں دینی کتب کی ہی زینت نہ بنے بلکہ عربی ادب کے طالب علموں کے لیے بھی نثر جمیل کا بلند تر حوالہ ہیں، تقریباً ۸۹ سال کی عمر میں رجب ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات ہوئی اور بصرہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

ی میں دفن ہوئے۔ مخزنِ چشت کی روایت کے مطابق آپ کے مریدانِ باصفا سے تقریباً چودہ سلاسل اولیاء وجود میں آئے۔ پانچ حضرت عبدالواحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے اور نو حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق سے اور یہی سلاسل تابعین کے دور کے بعد امت مسلمہ کی راہنمائی کے نگران قرار پائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحابیت کا فیضان منتقل ہوا تو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے تابعیت کی عظمتیں معاون ہدایت رہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ ابوالفضل عبدالواحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۷۷ھ)

حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں، ابوالفضل کنیت تھی، سید الاقطاب کی روایت کے مطابق خرقۂ خلافت، حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پایا ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک اور خلیفہ حضرت کمیل بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت ارادت حاصل تھی، مخزن چشت کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی شرف نسبت حاصل تھا، حد درجہ زہد و عابد تھے، بقول پروفیسر خلیق نظامی حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، کی مجلس معارف و حقائق کے رکن رکین تھے، محدث حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اُن سے روایت کی ہے، طبقاتِ کبریٰ میں بھی اُن کا قول نقل کیا ہے:

''عبداللہ بن زید فرماتے ہیں: اے طالبانِ خدا صرف روٹی اور نمک کھایا کرو کہ اس سے گردہ کی چربی دور ہوتی ہے اور ایمان و یقین زیادہ ہوتا ہے۔''

(مشائخ چشت ادارہ ادبیات دہلی: ص ۱۹۵)

آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا تھا مگر نماز اور وضو میں فرق نہ آیا، استقامت کی حد یہ تھی کہ ایک مرتبہ کوئی معاون موجود نہ تھا کہ وضو کرا سکے، دل تڑپا کہ فرض میں کوتاہی ہو جائے گی، قدرت کی طرف سے ایسی ہمت ملی کی اٹھے اور خود وضو کیا، یہ موت کا وقفہ اس جذب صادق کا ثمر تھا جو عمر بھر آپ کا شریک سفر رہا تھا، ۲۷ صفر ۱۷۶ھ یا ۱۷۷ھ میں وفات پائی اور بصرہ میں دفن ہوئے اور معرفت الٰہیہ کا بیش بہا ترکہ چھوڑ گئے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ ابوالقیض فُضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۸۷ھ)

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ تاریخ تصوف میں اُن نامور بزرگوں میں سے ہیں جن کی زندگی کا ہر گوشہ نصیحت افروز ہے، کہا جاتا ہے کہ ابتداء جوانی میں طاقت و قوت کا ایسا خمار رکھتے تھے کہ راہ چلتوں کو لوٹ لیتے تھے، ایک دہشت کا نشان تھے مگر جب ایک ایسی ہی سرکشی کی حالت میں "آیۃ الکرسی" تحریری صورت میں نظر نواز ہوئی تو بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا اور جب گناہ کے ارادے میں سرمست کسی کے گھر کودنے کا ارادہ کر رہے تھے تو ایک آیت کریمہ سماعت نواز ہوئی، فرمانِ پروردگار تھا:

﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (الحدید:۱۶)

"کیا ایمان والوں پر وہ لمحہ نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے خشوع اختیار کرلیں"

بس پھر کیا تھا اندر کا جذبہ خیر میں ڈھلا اور ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی،

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق آپ کی کنیت ابوعلی تھی، اصل وطن کوفہ تھا، اگرچہ بعض نے خراسان کا علاقہ مرو کہا ہے، کہا جاتا ہے کہ سمرقند میں پیدا ہوئے، طبقہ اولیٰ کے صوفیاء سے ہیں، صاحب علم صوفی ہیں کہ راستی کے سفر میں علم کدوں کا بھی رُخ کیا، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں مدتوں قیام رہا اور علم فقہ میں دسترس پائی اس طرح فقیہہ بھی بنے اور صوفی بھی، بصرہ آئے تو حضرت عبدالواحد بن زید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضری ہونے لگی، شیخ اس قدر خوش ہوئے کہ خرقہ خلافت عطا فرما دیا، پھر مکہ مکرمہ چلے گئے اور علوم دینیہ کی تحصیل میں مسلسل مشغول

رہے، بڑے اصحاب قوت ویقین حاضر خدمت ہوتے رہے، سیر الاقطاب میں ہارون الرشید کی حاضری کی تفصیل بھی دی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ آپ کس قدر مستغنی ہو گئے تھے کہ ہارون الرشید سے کسی قسم کا نذرانہ بھی وصول نہ کیا۔ (ص: ۲۷)

مکہ مکرمہ میں ۳ ربیع الاول ۱۸۷ھ میں وفات پائی اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مزار کے قریب جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

(مخزن چشت: ص ۱۳۸)

پروفیسر خلیق نظامی لکھتے ہیں:

"خواجہ فضیل بن عیاض علیہ الرحمۃ تبع تابعی تھے اور ایک روایت کے مطابق امام اعظم علیہ الرحمۃ کے شاگرد تھے اکابر محدثین میں اُن کا شمار ہوتا تھا، تہذیب التہذیب میں اُن کے شیوخ حدیث اور تلامذہ کی طویل فہرست درج ہے، ہارون الرشید کہا کرتا تھا "علماء میں امام مالک علیہ الرحمۃ سے زیادہ باہیبت اور فضیل بن عیاض علیہ الرحمۃ سے زیادہ پرہیزگار میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔"

(تاریخ مشائخ چشت: ص ۱۹۵)

ہارون الرشید نے جب ایک ہزار اشرفی کی تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے فرمایا: "امیر المومنین! افسوس ہے کہ میری کسی نصیحت نے تم پر اثر نہیں کیا۔ میں تجھے راہ نجات تک لانے کا خواہش مند ہوں اور تم مجھے تباہی و بربادی میں دھکیلنا چاہتے ہو" ہارون آبدیدہ ہو گیا اور کہنے لگا: "آپ فی الواقع خواجہ ہیں۔" (مخزن چشت: ص ۱۳۸)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت سلطان ابراہیم ادھم بلخی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۶۱ یا ۱۶۶ھ)

مولانا جامی نفحات الانس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ پہلے طبقہ میں ہیں، کنیت ابو اسحاق ہے، شاہان بلخ کی اولاد ہیں، ایک ایسے شہزادہ ہیں جنہوں نے جوانی میں توبہ کر لی تھی، ایک مرتبہ شکار کے لیے نکلے تھے کہ کسی (ہاتف) کی آواز آئی ''اے ابراہیم تم کو اس لیے پیدا نہیں کیا گیا، متنبہ ہو گئے اور راہ طریقت اختیار کی۔'' (نفحات الانس: ص ۴۶)

کہا جاتا ہے کہ آپ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، روایات کے اختلاف کے باوجود یہ واضح ہے کہ شہزادے نہ بھی ہوں مگر دولت مند گھرانے سے ضرور تھے اور یہ کہ کوئی غیبی قوت اُن کے اندر ہنگام اٹھاری تھی اس لیے سب سے کنارہ کش ہوئے، علم حاصل کیا رواۃ حدیث میں شمار ہوئے اور ثقہ قرار پائے، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ سے تلمذ بھی تھا۔ پروفیسر خلیق نظامی لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم بن ادھم بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''مفاتیح العلوم ابراہیم ادھم'' (یعنی علوم کے خزانوں کی چابیاں ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ ہیں) وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر تھے اور بقول شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اُن سے پڑھا بھی ہے۔'' لکھتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''یا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اختلاط داشتہ وعلم از وے آموختہ۔''

(تاریخ مشائخ چشت: ص ۱۹۵)

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ان گنت کرامات منسوب ہیں اور صوفیانہ طرز فکر کے متعدد مشاہدات کا بھی تذکرہ ملتا ہے، تاریخ تصوف میں حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کا نام صف اول کے صوفیاء میں ہوتا ہے، آپ سے بعض اقوال بھی روایت ہوئے ہیں جن سے منزلت علم اور رفعت مقام کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً فرماتے ہیں کہ

''فقر ایک خزانہ ہے جسے اللہ نے آسمان میں رکھ چھوڑا ہے، اور وہ یہ خزانہ ان لوگوں کے سوا جن سے وہ محبت کرتا ہے، کسی کو عطا نہیں کرتا۔''

مزید ارشاد ہے کہ

''اللہ کو پہچاننے والے کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہر وقت نیکی اور عبادت کے فکر میں رہتا ہے اور اس کا بیشتر کلام (خدا کی) حمد وثنا پر مشتمل ہوتا ہے۔''

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱/۳۵۵)

وصال کے مقام اور تاریخ وصال کے بارے میں اختلاف ہے، بعض کا کہنا ہے کہ وصال ۱۶ جمادی الاولیٰ ۱۶۲ھ کو ملک شام میں ہوا بعض کی رائے ہے کہ ۱۶۶ھ میں ہوا۔ علامہ جامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ہی ترجیح دی ہے، یہ بھی کہا گیا کہ قبر حضرت لوط علیہ السلام کے پہلو میں موجود ہے۔ (یہ مزار بغداد میں ہے) تاریخ بیت المقدس میں لکھا ہے کہ آپ نے مدینہ منورہ میں وفات پائی۔'' (مخزن چشت: ص ۱۵۱، ۱۵۲)

روایت ہے کہ ایک روز آپ اور حضرت خواجہ شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے کہ ایک ایسا درویش آیا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ صاحب کشف ہے، آپ نے درویش سے پوچھا کہ اس کے معاشی رویے کیسے ہیں، کہنے لگا، جب کچھ پاتا ہوں تو شکر بجالاتا ہوں اور جب کچھ نہیں پاتا تو صبر کرتا ہوں، حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایسا

تو خراسان کے کتے بھی کرتے ہیں تو پھر امتیاز اور شرف کیا ہوا، اس کے بعد آپ نے حضرت شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے عرض کیا، جو پاتا ہوں ایثار کر دیتا ہوں اور جب نہیں پاتا تو شکر کرتا ہوں، حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کی پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا یہ فقر ہے۔" (سید الاقطاب: ص ۴۴)

سلسلہ چشتیہ کی روحانی منزلت میں آپ کے زہد و تقویٰ کو بلند مقام حاصل ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ سدید الدین حذیفۃ المرعشی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۵۲ھ)

حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ترین احباب میں حضرت خواجہ سدید الدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام آتا ہے، حذیفہ نام تھا سدید الدین لقب اور مرعش کے رہنے والے تھے جو دمشق کے مضافات کا ایک قصبہ ہے، ایک صاحب علم صوفی تھے بلکہ متعدد کتب کے مصنف بھی ہیں، مؤرخین نے اختصار ذکر کے باوجود محبت وعقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں، خلیق نظامی نے سیر الاولیاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ

''از کبار مشائخ روزگار وسرور نامدار بود۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ص ۱۹۶)

روایت ہے کہ آواز غیب نے آپ کی بارگاہ خواجہ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی طرف راہنمائی کی تھی اس لیے حاضر ہوئے فیض یاب ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے، نہایت عجز وانکسار آپ کی سیرت کا نمایاں پہلو ہے حتیٰ کہ روایت ہے کہ فرماتے تھے۔

''اِذَا جَاءَنِی رَجُلٌ فَقَالَ: وَاللّٰہِ تَعَالٰی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَا حُذَیْفَۃُ مَا عَمَلُکَ عَمَلٌ مَنْ یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ فَاَقُوْلُ لَہٗ یَا ھٰذَا لَا تَکْفُرْ یَمِیْنَکَ فَاِنَّکَ لَا تَحْنَثُ''

(سیر الاقطاب ص ۴۸)

''اگر کوئی شخص میرے پاس آئے اور کہے، اللہ تعالیٰ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اے حذیفہ، تیرے کوئی عمل ایسا نہیں جو اس

شخص کے عمل جیسا ہو جو یوم حساب پر ایمان رکھتا ہے تو میں اسے
کہوں گا کہ کفارہ ادا نہ کرنا کیونکہ تو اپنی قسم میں جھوٹا نہیں۔"

اللہ اکبر، کس قدر فروتنی کا مظاہرہ ہے کہ کسی عمل پر ناز نہیں اور کسی پر اجر کا دعویٰ نہیں، عجز کا یہ پیکر جمیل شوال ۲۵۳ھ کی ۲۴ شوال کو بارگاہِ حمدیت کا راہی ہوا اور دمشق میں استراحت فرما ہوا۔ شجرۃ الانوار کے حوالے سے لکھا گیا کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آپ سے بیعت تھے اور آپ سے خلافت بھی پائی تھی۔ (حضور قبلہ عالم، پروفیسر افتخار حسین: ص ۷۸)

حضرت خواجہ امین الدین، اُبی ہبیرۃ بصری رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۸۷ھ)

حضرت خواجہ سدید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص جن کو آپ نے خرقۂ خلافت عطا کیا حضرت خواجہ امین الدین، بصرہ کے رہنے والے تھے اور ہبیرہ خاندان سے تعلق تھا، کہتے ہیں آپ نے بہت لمبی عمر پائی ہے، سیر الاقطاب نے ایک سو بیس سال عمر لکھی ہے۔ (ص: ۴۸) جبکہ مخزن چشت میں ۱۳۰ سالوں کا حوالہ بھی ہے (ص:۱۵۷) کہا گیا کہ مسلسل تلاوت کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ ایک روز میں دو قرآن مجید ختم کر لیتے، یہ بھی لکھا گیا کہ تقریباً ساٹھ سال ذکر حق میں مسلسل مشغول رہے، سات شوال تاریخ وفات ہے، سال وفات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ۲۸۷ھ ہے۔

حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۹۹ھ)

آپ خواجہ ابو ہبیرہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اعظم ہیں، یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے حضرت شیخ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خرقۂ خلافت پایا تھا اور بہت عرصہ اُن کی صحبت میں رہے تھے بلکہ حضرت عبداللہ خفیف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خلافت پائی تھی، اس طرح آپ کی نسبت مختلف سلاسل تصوف سے ہے، آپ کے مرشد عظیم نے اسی عظمت کا خیال کرتے ہوئے آپ کو 'علو' کا اختصاص بھی عطا کیا تھا، علامہ جامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ آپ حضرت جنید بغدادی، حضرت شیخ محمد رویم اور حضرت ابوالحسن نوری علیہم الرحمۃ کے ہم عصر تھے۔ (حلیہ الاقطاب: ص ۱۰۵)

پروفیسر خلیق نظامی کی روایت کے مطابق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو "شمس الفقراء" لکھا ہے۔ (تاریخ مشائخ چشت: ص ۱۹۶)

حضرت خواجہ ممشاد رحمۃ اللہ علیہ حد درجہ زہد وتقویٰ اختیار کیے رہے یہاں تک کہ عمر بھر دن کے وقت نہ کچھ کھایا نہ پیا حتیٰ کہ بچپن میں بھی دن کو کبھی دودھ نہ پیا، تمام عمر روزہ دار رہنا ایسی سعادت وشرف ہے جس کی مثال خال خال ملتی ہے۔ (سیر الاقطاب: ص ۵۳)

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا ایک ایسا قول نقل کیا ہے جو آپ کے مشرب تصوف کا آئینہ دار ہے، خواجہ ممشاد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''مرید کے آداب میں ہے کہ مشائخ کی حرمت وعظمت کو لازم رکھے، بھائیوں کی خدمت کرنا ہے، اسباب سے خرچ یعنی بے نیازی اور اپنے اوپر شرعی آداب کی حفاظت کرنا ہے۔'' (نفحات الانس، مولانا جامی: ص ۱۰۶)

آپ نے ۱۴ محرم الحرام ۲۹۹ھ میں وفات پائی اور دینور میں سپردِ خاک کیے گئے جہاں آپ کا مزار زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

Nafse Islam
نفس اسلام
www.nafseislam.com

حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۳۲۹ھ)

خواجہ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ چشتیہ کے اُن نامور صوفیاء میں سے ہیں جن پر کسی سلسلے کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ خواجہ ممشاد دینوری رحمۃ اللہ علیہ سے جب یہ سلسلہ خواجہ ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو منتقل ہوا تو اس کو ایک شناخت حاصل ہوگئی، روایت یہی ہے کہ حضرت خواجہ ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کافی عرصہ غور وفکر کے مراحل سے گزرے حتیٰ کہ استخارہ بھی کیا اور جب وجدان سے ایک واضح اشارہ پالیا تو آپ حضرت ممشاد دینوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، شیخ کی نظر پڑی تو نام دریافت کیا، عرض کیا ابو اسحاق شامی، فیض لٹانے والے مرشد نے ارشاد فرمایا: آج سے تم ابو اسحاق شامی چشتی کہلاؤ گے کہ میں تمہارے وجود سے اہل چشت کو فیض یاب ہوتا دیکھ رہا ہوں، بس یہی وہ لمحہ قضا تھا کہ چشتی ہو گئے، پھر سلسلہ در سلسلہ یہ لاحقہ اہل چشت کی شناخت بنا، اس شناخت نے اس قدر عظمت و پذیرائی عطا کی کہ فیضانِ چشت پہاڑی ندی کی طرح خروش کا حامل ٹھہرا۔ شیخ کامل نے نصیحت کی کہ فقر وفاقہ اختیار کریں اور ذکر الٰہی میں مشغول رہیں، یہ ارشاد مرید کامل کے لیے ہمیشہ حرز جاں رہا، آپ نے نہایت قوت اور شعور کے ساتھ مشربِ چشت کو عوامی اصلاح کا ذریعہ بنایا، یہ کیونکر ہوا مخزن چشت کے مولف کا ارشاد ہے:

"بزرگوں کا یہ گروہ جن اذکار وعبادات کو اپنے لیے لازم قرار دیتا، زندگی بھر اس پر بڑی سختی سے پابند سنت والجماعت حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش

قدم پر چلنا اور اہل سنت والجماعت کے عقائد سے وابستگی اپنا مقصد حیات سمجھتے، ان کے آداب اس قدر عمدہ ہوتے کہ کوئی گروہ بھی شکوہ نہ کرتا اور باطنی جمعیت کو اپنا مشرب خیال کرتے۔" (ص:۱۶۲)

حضرت خواجہ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ ربیع الثانی ۳۲۹ ھ کو جہانِ فانی سے دار البقاء کو سدھارے مکہ مکرمہ میں دفن ہوئے اور آنے والی نسلوں کو راستی کا دائمی درس دے گئے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ ابو احمد ابدال بن فرسنافتہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۳۵۵ھ)

خواجہ ابو احمد رحمۃ اللہ علیہ حسنی سادات سے تعلق رکھتے تھے اور فرسنانہ کے امراء میں سے تھے، خلیفہ عباسی معتصم باللہ کے عہد خلافت میں ۲۶۲ھ کو آپ کی ولادت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ خواجہ ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ کی بشارت بن کر دنیا میں تشریف لائے کہ آپ نے یہ خبر آپ کے والد گرامی کی ایک نیک سیرت بہن کو بہت پہلے دے دی تھی، پیدائش ہوئی، ابھی ابتدائی ایام عمر تھے کہ حضرت ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے گھر آتے تو فرماتے، اس لڑکے سے ایسی خوشبو آتی ہے جس سے عجیب وغریب آثار دیکھنے میں آئیں گے، یہی ہوا کہ بہت سی کرامات ظاہر ہوتی رہیں، ۹۵ سال کی عمر میں ۳۵۵ھ یکم جمادی الاولی کو آپ نے عزت وجلال کے سایوں میں وفات پائی۔ مزار شریف مرکز چشتیاں، چشت شریف میں ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ ابو محمد بن ابی احمد رحمۃ اللہ علیہ (م:۴۱۱ھ)

حضرت خواجہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے جلیل القدر والد حضرت خواجہ ابو احمد رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور خلیفہ ہیں، یہ مسند آپ کو اس وقت ہی نصیب ہوگئی تھی جب آپ صرف چوبیس برس کے تھے۔(نفحات الانس:ص۳۵۵)

ہونہار تھے اس لیے آغازِ عمر سے ہی علم شریعت وطریقت میں دسترس پائی تھی، کہا جاتا ہے کہ ولادت شب عاشور ہوئی تھی، شاید یہی اثر تھا کہ تارک الدنیا رہنا ہی زیادہ پسند تھا مگر اصلاحِ خلق اور فلاحِ امت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محمود غزنوی کے حملہ سومنات میں مدد کے لیے ہندوستان آئے تھے حالانکہ آپ کی عمر اس وقت ستر سال تھی مگر اس کے لیے انہیں خواب میں اشارۂ غیبی ملا تھا۔

(نفحات الانس:ص۳۵۵)

اس کا ذکر پروفیسر خلیق نظامی نے بھی کیا ہے بلکہ اکثر مصادر تصوف اس کا تذکرہ کرتے ہیں، اس شرکت سے واضح ہوجاتا ہے کہ صوفیاء کے ہاں ترک دنیا کا مفہوم دنیاوی آلائشوں سے مجتنب رہنا تھا وگرنہ وہ ملت کے ہر درد میں پوری قوت اور بساط کے مطابق شریک رہے ہیں، ایک طویل عمر کے بعد آپ نے ۴ ربیع الثانی ۴۱۱ھ میں انتقال فرمایا، مزار آپ کے والد گرامی کے مزار کے قریب چشت شریف میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔

حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۴۵۹ھ)

حضرت خواجہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ کے خواہر زادے ہیں، والد گرامی کا نام محمد سمعان ہے جو حسنی سادات میں سے تھے، یہ شادی کافی تاخیر سے ہوئی تھی کہ آپ کی والدہ کی عمر اکتالیس سال ہو چکی تھی، شاید اور بھی تاخیر ہو جاتی کہ بہن، بھائی کی خدمت میں لگی رہیں مگر والد گرامی کی اس ہدایت پر جو خواب میں دی گئی آپ کی شادی ہوئی جس سے خواجہ ناصر الدین ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ متولد ہوئے، ماموں کی پرورش میں رہے کہ آپ کے والد گرامی چشت میں ہی آباد ہو گئے تھے، خواجہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بہت دیر سے یعنی ۶۵ سال کی عمر میں شادی کی، اولاد بھی ہوئی مگر جوانی کو نہ پہنچی، اس لیے خواہر زادے پر ساری تربیتی توجہ رہی اور خلافت بھی انہیں کو عطا کی گئی، حضرت خواجہ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ خواجہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے، عبادت کا ذوق تو نوعمری سے تھا، اب مزید جلا ملی، ایک جلیل القدر بزرگ خواجہ مکی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار سب بزرگوں کی توجہ کا مرکز رہا تھا کہ حضرت ابو اسحاق شامی رحمۃ اللہ علیہ بھی حاضری دیا کرتے تھے، آپ وہاں ۱۲ سال تک چلہ کش رہے، کہا جاتا ہے کہ ہم عصر بزرگ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ آپ سے ملنے آئے تھے اور خواجہ ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے نامور صوفی بھی شریک صحبت رہے تھے۔ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ خواجہ ابو یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو قرآن مجید حفظ نہ تھا جس کا قلق تھا، ایک رات خواب میں خواجہ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی، خواہش کا اظہار کیا فرمایا

WWW.NAFSEISLAM.COM

سوتے وقت سو بارہ سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو، اس کی برکت سے حافظ قرآن ہو جاؤ گے، چنانچہ آپ نے اپنے شیخ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا تو قرآن مجید حفظ ہو گیا۔

(مخزن چشت: ص ۱۷۳)

آپ نے مسند ارشاد کو ایک عرصہ رونق بخشی، چوراسی سال کی عمر پائی، ۳ رجب ۴۵۹ھ میں آپ نے وفات پائی اور چشت شریف میں ہی دفن ہوئے۔

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۲۷ھ)

خواجہ ناصر الدین ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات ہی میں اپنے صاحبزادے خواجہ قطب الدین مودود رحمۃ اللہ علیہ کو خلیفہ اور نائب نامزد کر دیا تھا، وفات پر خواجہ مودود رحمۃ اللہ علیہ مسند نشین ہوئے اور سلسلہ چشتیہ کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی، یہ بھی روایت ہے کہ اپنے والد گرامی کے علاوہ آپ کو شہرۂ آفاق بزرگ شیخ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ سے بھی سند خلافت حاصل ہے، صرف چھبیس سال عمر تھی کہ مسند نشینی کے اعزاز اور ذمہ داری کے حامل ٹھہرے، جب شیخ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ ہرات تشریف لائے تھے تو ابتداءً کچھ تشویش ہوئی مگر جب ملاقات ہوئی تو مختصر سے تعارف کے بعد ایک دوسرے کے لیے خلوص نمایاں ہو گیا، قرآن مجید سات سال کی عمر میں ہی حفظ کر چکے تھے اور تحصیل علم میں مشغول بھی رہے تھے مگر علم کے بہت سے مدارج باقی تھے کہ مسند نشین ہو گئے تھے حضرت احمد جام رحمۃ اللہ علیہ نے جب شفقت کا اظہار فرمایا تو نصیحت بھی کی فرمایا:

''پہلے خلوص سے توبہ کرو پھر یہ مصلیٰ لپیٹ کر کسی کونہ میں رکھ دو اور علم دین حاصل کرو، کیونکہ علم کے بغیر زہد بے کار شے ہے، جب حصولِ علم سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے خاندان کا نام زندہ کرنا کیونکہ تمہارے آباؤ اجداد بے حد نیک اور اصحاب کرامت تھے.....''

چنانچہ حصولِ علم اور تکمیل معرفت میں مصروف ہو گئے، بلخ اور بخارا گئے اور چار سال وہاں قیام کیا۔'' (مخزن چشت: ص ۱۷۹)

WWW.NAFSEISLAM.COM

پھر چشت شریف واپس آ گئے اور مریدوں اور طالب علموں کی تربیت میں مشغول ہو گئے اور عمر بھر خلق کے مسائل حل کرنے، معتقدین کو راہِ ہدایت پر لانے اور متذبذبین کو دولت اعتماد عطا کرنے میں مشغول رہے۔ آخری عمر میں بیمار رہنے لگے یکم رجب ۵۲۷ھ کو انتقال فرمایا اور چشت شریف میں ہی دفن ہوئے، دو نامور خلفاء نے اس منصب ارشاد کو اگلی نسلوں تک وقار کے ساتھ قائم رکھا، ان میں ایک آپ کے صاحبزادے خواجہ ابو احمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو اپنے والد گرامی کی مسند پر جلوہ افروز ہوئے اور دوسرے خواجہ حاجی شریف زندنی رحمۃ اللہ علیہ تھے جن سے چشتیہ سلسلہ مزید آگے بڑھا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۱۲ھ)

حضرت خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص تھے، جب نسبت ارادت کے لیے حاضر ہوئے تھے تو مستقل آپ کے ہاں ہی قیام کر لیا، ایک روز مرشد کامل نے ارشاد فرمایا

''اے حاجی نیک بختے از خدای عزوجل خواستہ ام کہ بمقام نشینی و دست بیعت بخلق دہی و ہر کہ مریدت شود صاحب نعمت گردد۔''

(سیر الاقطاب: ص۹۰)

''یعنی اے نیک بخت حاجی، میں نے خدائے عزوجل سے دعا کی ہے کہ تو میری مسند پر بیٹھے اور مخلوق کے لیے دست بیعت پیش کرے اور یہ کہ جو بھی تیرا مرید بنے صاحب نعمت ہو۔''

یہ دعا قبولیت کی ایسی منزلت سے نوازی گئی کہ حاجی شریف زندنی عمر بھر اس کی مثال بنے رہے، شریف آپ کا نام تھا، حاجی کا لاحقہ شروع ہی سے ساتھ رہا، بخارا کے نواح میں ایک قصبہ زندنہ سے تعلق کی بنا پر زندنی کہلائے، کہا جاتا ہے کہ ''چالیس سال تک خلقت کے ہجوم سے علیحدہ رہ کر مجاہدات کیے تھے اور درختوں کے پتے اور جنگل میں اُگنے والے میووں پر گزر اوقات کی تھی، علماء، فضلاء اور اہل حقیقت سب اُن سے عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔'' (تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی: ص۱۹۷)

یہ بھی کہا گیا کہ ''آپ ہمیشہ روزہ رکھتے اور ساگ کے تین پتوں اور نمک سے افطار کرتے۔'' (حضور قبلہ عالم: ص۸۲)

۱۰ رجب ۶۱۲ھ میں وصال ہوا، اپنے قصبے زندنہ ہی میں دفن ہوئے، قبر زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۱۷ھ)

حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور کے قصبہ ہارون کے رہنے والے تھے، برخوردنے لکھا کہ

''درعلم شریعت وطریقت وحقیقت اعلم وقت بود'' (تاریخ مشائخ چشت: ص ۱۹۷)

عثمان اسم مبارک تھا اور ابو النور کنیت، صاحب علم وفضل تھے اور حافظ قرآنِ مجید بھی، خواجہ شریف زندنی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، خلیفہ اور جانشین ہوئے اگرچہ حضرت خواجہ مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی فیض یاب تھے، آخری عمر میں مکہ مکرمہ چلے گئے وہاں ہی ۵ شوال المکرم ۶۱۵ھ کو انتقال فرمایا اور جنت المعلیٰ کے قریب دفن ہوئے، آپ اکابر صوفیاء میں سے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ

''وہ شخص اللہ تعالیٰ کی نظر میں عزیز ہے جو دریا کی سی سخاوت، آفتاب کی سی شفقت اور زمین کی سی تواضع رکھتا ہو'' (حضور قبلہ عالم، پروفیسر افتخار چشتی: ص ۸۳)

آپ کی بارگاہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ تقریباً بتیس سال رہے کہ صرف بیس سال کی عمر میں حلقہ ارادت میں آئے اور باون سال کی عمر میں خلافت سے نوازے گئے، ان ایام میں حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشادات سماعت فرمائے وہ مرشد کے حکم سے انیس الارواح میں محفوظ کر دیئے جو ملفوظاتِ مشائخ میں ایک اہم نوشتہ ہے، حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ سے چشتیہ کا فیضانِ تصوف اُن وجودِ محترم کو حاصل ہوا جس سے برصغیر کے در و دیوار دمک اٹھے، سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۳ھ) کے حضور گریز پائی ممکن نہیں، چشتیہ کا نشانِ وقار آپ کا وجود ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس بارگاہ میں کچھ دیر حاضری دے دی جائے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۳ھ)

سلطان الہند کے لقب سے عیاں ہے کہ برصغیر کی روحانی فضا میں حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکمرانی ہے، روحانی ایقان وقوت کا یہ فرد وحید جسے دنیا نے خواجہ معین الدین حسن سنجری اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے پکارا خاندانِ سادات سے نسبت فاخرہ رکھتا تھا، والد کا نام سید غیاث الدین ہے جن کا شجرۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، والد گرامی حسینی سادات میں سے تھے جبکہ والدہ محترمہ جن کا نام مناقب المحبوبین میں ماہ نور لکھا گیا ہے، حسنی سادات میں سے تھیں، ولادت خراسان کے ایک علاقے سیستان جو سجستان بھی کہلایا میں ۵۳۴ھ کو ہوئی، اسی نسبت سے سجزی یا سنجری کہلائے، ابتدائی تعلیم خراسان ہی میں پائی، صرف پندرہ سال کے تھے کہ والد گرامی کا انتقال ہوگیا، وراثت میں ایک پن چکی اور ایک باغ پایا جو ذریعہ معاش بنا، باغ میں مصروف تھے کہ ایک روز ایک درویش ابراہیم قندوزی مجذوب ادھر آنکلے، آپ نے انگور کے خوشے پیش کیے، مجذوب نے لعاب دہن سے مس کیا اور واپس کر دیئے، آپ نے کھائے ہی تھے کہ اندر کہرام بپا ہوگیا، سب کچھ راہِ حق میں نثار کر دیا اور تلاش حق میں نکل پڑے، اسی دوران قرآن مجید حفظ کیا (مخزن چشت)، مسلسل سفر میں رہتے، اسی دوران میں عراق کے ایک قصبے ہرون (جو نیشاپور کا ایک حصہ ہے) آئے وہاں حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نصیب ہوئی، یہ تعلق اسی قدر اثر آفرین ہوا کہ انہیں کے ہو رہے، حج پر بھی ساتھ گئے، حرم کے سامنے مرشد کامل نے اعلان کیا کہ وہ آپ کو سپرد خدا کر رہے ہیں، کہتے ہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

آواز آئی، قبول کیا گیا، مدینہ منورہ کی حاضری بھی اسی مصاحبت میں ہوئی، باون برس کی عمر میں خلافت سے نوازے گئے، تقریباً بیس سال کی عمر میں حلقہ ارادت اختیار کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافت کس قدر مشکل مرحلہ تھا، یہ مسلسل استقامت چاہتی ہے، یہ خلافت مستقبل کے روحانی عروج کا اعلان تھا، اگرچہ آپ کی صحبت متعدد بزرگوں کے ساتھ رہی جن میں حضرت نجم الدین کبریٰ (م: ۶۱۰ھ) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۶۱ھ) اور حضرت شیخ ابو النجیب عبدالقاہر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۶۲ھ) شامل ہیں مگر تعلق ونسبت کا مرکز حضرت عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ ہی رہے، آپ کی گوشہ نشینی کے بعد حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد سفر کیے، عالم اسلام کی معاشرتی بے کیفی اور سماجی انحطاط پر نظر رہی اور ان مشاہدات کو سمیٹتے ہوئے برصغیر آ گئے، غزنی کے راستے آئے تھے اور پہلا قیام لاہور میں تھا، محمد صالح کنبوہ مؤلف شاہجہان نامہ کے مطابق آپ ۵۸۷ یا ۵۸۸ھ میں لاہور تشریف لائے، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے قدمین کی جانب چلہ کشی کی اور خوب فیض یاب ہوئے، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا ؎

سید ہجویر مخدوم امم
مرقد او پیر سنجر را حرم

WWW.NAFSEISLAM.COM

لاہور کچھ قیام کے بعد چالیس درویشوں کی معیت میں دہلی آئے، یاد رہے کہ دہلی میں ابھی سلطنت غلاماں کی ابتداء نہ ہوئی تھی، محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی آمد نوید سحر تھی کہ جلد ہی دہلی مسلم ثقافت سے بہرہ مند ہونے والی ہے، صرف چند ماہ کا قیام تھا بقول حامد جمالی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت رشید مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کے قریب آپ کے قیام کی یادگار کے طور پر ایک حجرہ موجود ہے، بالآخر آپ اجمیر تشریف لے گئے جو چوہان راجاؤں کا مرکز تھا مگر اب اس کو ایک لازوال روحانی نسبت حاصل ہو رہی تھی، تقریباً چالیس سال اجمیر آپ کی روحانی رفعتوں سے سرفراز ہوتا رہا، اجمیر ایک ایسا مرکز فلاح بنا کہ پورے برصغیر کی نظریں اس جانب اٹھنے لگیں، سلطان التمش کے دورِ حکمرانی میں ۶۳۳ھ کی ۶ رجب کو آپ سرزمین ہند میں

اپنا نقش دوام ثبت کر کے خلد آشیاں ہوئے ''آفتاب ملک ہند'' سے تاریخ وفات نکالی گئی۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ اشاعت دین میں اس قدر منہمک رہے کہ شادی کا مرحلہ بہت مؤخر ہو گیا، آخری دور میں دو شادیاں کیں، ایک زوجہ محترمہ ایک ہندو راجہ کی صاحبزادی تھی تو دوسری زوجہ محترمہ سید وجیہہ الدین رحمۃ اللہ علیہ کی، دونوں سے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی، اولاد صرف ایک بیٹے شیخ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، شیخ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ جذب وکیف میں یوں گم ہوئے کہ دنیا سے بھی لاتعلق ہو گئے جبکہ تیسرے فرزند حضرت ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۷/۶۴۶)

شیخ فخر الدین اجمیر کے قریب منڈل میں کھیتی باڑی میں مشغول رہے، اُن کا رجحان تصوف کی جانب کم ہی رہا اس طرح روحانی نسل خلفاء سے ہی چلی جن میں چودہ کے نام ملتے ہیں، شہرت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۴ھ) اور سلطان التارکین حمید الدین صوفی ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں زیادہ آئی، حضرت شیخ اوحد الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خلیفہ شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب چند رسائل کا ذکر ملتا ہے انیس الارواح، میں حضرت شیخ عثمانی ہارونی رحمۃ اللہ علیہ سے اٹھائیس صحبتوں کے ملفوظات جمع کیے گئے ہیں، اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چشتیہ بزرگوں کے ہاں تربیت افراد پر ہی زیادہ توجہ تھی، تالیف کتب ورسائل پر نہ تھی، عوارف المعارف جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، ہی کو تعلیم تصوف کا ذریعہ بنایا جاتا تھا، برصغیر کی مقامی آبادی مادائیت کے ایسے نظام میں جکڑی ہوئی تھی کہ کسی اور دانش وحکمت کا نفوذ ممکن نظر نہ آتا تھا مگر حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دن رات کی محنت سے پوری فضا کو بدل کر رکھ دیا، تعلیم وتربیت کا وہ انسانی رویہ اپنایا کہ بڑے سے بڑے دشمن بھی سپر انداز ہو گئے کہا جاتا ہے کہ ایک روز ایک مندر میں چلے گئے، وہاں سات پروہت پوجا پاٹ میں مشغول تھے، آپ کا پُر جمال اور پُر وقار چہرہ دیکھا تو تڑپ اٹھے اور قدموں پر گر پڑے، سب نے

اسلام قبول کیا حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ سب کو حمید الدین کہہ کر پکارتے تھے، ان میں سے ایک نے ناگور میں سکونت اختیار کر لی اور حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ کہلائے (مخزن چشت)، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ساتھیوں میں وسعت قلب ونظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ تنگ نظری اشاعت دین کے راستے میں حائل نہ ہو جائے۔ اس لیے متوسلین کو حکم دیتے:

''اپنے اندر دریا کی سی فیاضی، سورج جیسی گرم جوشی اور زمین جیسی مہمانوازی پیدا کریں۔'' (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۷/ ۶۴۷)

سلطان الہند کی ذاتی زندگی ایک درویش بے نوا کی طرح تھی، نہ خواہش نفس کی گھمبیرتا، نہ آسائشوں کے حصول کا شوقِ فضول، باون سال تک تلاش علم وحکمت کا ذوق ثابت کر رہا ہے کہ ان بندگانِ باصفا کا مطلوب کیا تھا۔

ذرا توجہ، انہماک اور ہمہ تن کوش ہو کر آپ کی اجمیر میں گزاری ہوئی زندگی کا حال سنئے، لکھتے ہیں:

''خواجہ اجمیری کی زندگی بہت سادہ مگر دل کش تھی، ہندوستان کے سب سے بڑے سماجی انقلاب کا یہ بانی ایک چھوٹی سے جھونپڑی میں ایک پھٹی ہوئی دوہتی میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا، پانچ مثقال سے زیادہ کوئی روٹی کبھی افطار میں میسر نہ آتی۔'' (سید العارفین: ص ۵)

اسی فقر ومستی کے باوجود بڑے بڑے اس بارگاہ کو سلام عقیدت پیش کرتے اور آپ کے نصائح سے فیض یاب ہوتے، آپ اُن کو تاکید کرتے کہ

''عاجزوں کی فریاد کو پہنچنا، ضعیفوں اور بے چاروں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکوں کا پیٹ بھرنا۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ۱/ ۳۹۸)

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی برصغیر میں گزاری ہوئی چالیس سالہ زندگی کا ورق ورق توحید کے درس اور شریعت کی پاسداری کا آئینہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ تقویم عقائد وایمان، تہذیب اعمال اور تکریم انسانیت کا مشن اس قدر کامیابی سے جاری رہا کہ

تاریخ ہند کی نظریں آپ کی ذات پر مرکوز ہو کر رہ گئیں، ایسا مرشد راہ حیات کا کامیاب رہبر ہوتا ہے اور ایسا مرید راہِ صفا میں لائق اعتماد ساتھی بنتا ہے اسی لیے حضرت عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"معین الدین محبوب خدا است، مرا فخر است بر مریدی او۔"

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند: ۳/۱۰۴)

چشتیہ سلسلۂ تصوف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے برصغیر کے طول و عرض میں عام ہوا، آپ کے خلفاء نے دور و نزدیک زاویے قائم کیے اور اشاعت دین کے مقدس مشن کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا، بہت سے خلفاء نے دن رات یہ فریضہ انجام دیا، ان خلفاء میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست ہے، بہتر ہوگا کہ اس درویش خدا مست کے حضور چند لمحے گزار لیے جائیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۳۳ھ)

ساداتِ حسینی کا یہ نامور فرزند سید کمال الدین احمد موسیٰ کے ہاں اوش (ماوراء النہر کا علاقہ) میں پیدا ہوا، تقریباً ڈیڑھ سال کے تھے کہ والد گرامی کا انتقال ہو گیا اور پرورش کی ساری ذمہ داری 'والدہ' کو سنبھالنا پڑی، عجیب اتفاق ہے کہ تقریباً یہ معاملہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا اور یہ بھی تاریخی صداقت ہے کہ مائیں تقویٰ شناس ہوں تو اولاد ولی کامل بنتی ہے اس سے ہر ماں کو تحریک ملتی ہے کہ وہ ایک ذات کو ہی نہیں پال رہی، قوم کے ایک مخدوم کی تربیت کر رہی ہیں اس لیے اس ذمہ داری کو کس ذوق ومتانت سے نبھانا چاہیے، یتیمی کی مشکلات واضح ہیں مگر ماؤں نے تعلیم وتربیت کے تمام مراحل میں وہ کردار انجام دیا جو ہر ماں کے لیے ایک نمونہ بھی ہے اور حوصلوں کا باعث بھی، تحصیل علوم کے مراحل ہی تھے کہ قسمت نے یاوری کی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے اور بیعت کا پیمان باندھا، ایک روایت ہے کہ حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت محمود اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں حضرت شیخ ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں نسبت چشتیہ حاصل کی، (مخزن چشت) پھر مرشد کامل حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی تلاش میں اُن کے بعد برصغیر کا سفر کیا، ملتان ٹھہرے حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بھی رہی، اخبار الاخیار کی روایت کے مطابق منگول حملوں میں قید بھی رہے، ملتان ہی میں حضرت بابا فرید الدین گنج

شکر علیہ الرحمہ حاضر ہوئے، ہمراہی چاہی مگر عمر صرف اٹھارہ سال تھی اس لیے روک دیا کہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کر لیں۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۲/۱۲، ص ۳۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ کے نزدیک علوم کی کس قدر اہمیت تھی کہ وہ حلقہ ارادت اور مصاحبت کے اعزاز سے قبل علوم کی تکمیل کے خواہاں تھے، علم سے نفور اور علم بس کرنے کی ریت نامعلوم کس حلقہ ارادت کا اتباع ہے، اللہ تعالیٰ ازدیادِ علم کی دعا سے مخلص رہنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ دہلی آئے تو شاہ دہلی التمش، سراپا انتظار نکلا، استقبال کو بڑھا، شاہی محل میں رہائش اختیار کرنے کی درخواست کی مگر آپ نے رہائش سے ہی انکار نہ کیا، حاضری دربار کو بھی غیر مستحسن جانا، کہا جاتا ہے کہ شیخ الاسلام، کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا، راہِ حق کے جادہ نوردوں کو بھلا القاب سے کیا سروکار! انہیں تو ایک ہی دھن رہتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کی راسخیت حاصل ہو جائے، یہی تمنا تھی کہ حضرت خواجہ بختیار علیہ الرحمہ ایک شب بھر میں تین ہزار مرتبہ درود شریف کا تحفہ پیش کرتے رہے تھے، روایت ہے کہ تین دن خانگی مجبوری کی وجہ سے تحفہ ارسال نہ کر سکے تو دربار نبوت سے پیغام آیا کہ یہ تحفہ تین رات سے نہیں پہنچا۔ (سیر العارفین: ص ۲۴)

اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ کس قدر راہ یاب تھے کہ محبوب کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے ان مشاغل سے نہ صرف خوش تھے بلکہ انتظار فرماتے تھے، اس سے بڑھ کر کامرانی کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ اُن لوگوں (جو شیخ الاسلامی کے منصب پر اترا رہے تھے) کے رویوں سے اس قدر بدظن ہوئے کہ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ تشریف لائے تو آپ کے ساتھ ہی اجمیر جانے کا فیصلہ کر لیا، ابھی روانہ ہی ہوئے تھے کہ کہرام بپا ہوا، اصحاب طریقت ہی نہیں، شہر کے تمام باسی حتیٰ کہ سلطان التمش ملتجی ہوئے کہ آپ دہلی نہ چھوڑیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمہ اس والہانہ عقیدت کو دیکھا تو فرمانے لگے:

''بابا قطب الدین تم اسی مقام پر رہو کہ تمہارے جانے سے یہاں کے لوگ

بہت پریشان اور مضطرب ہیں، میں یہ مناسب نہیں سمجھتا کہ اتنے دلوں کو صدمہ پہنچایا جائے، اس شہر کو تمہاری پناہ میں دیا۔'' (سیر العارفین: ص ۳۰)

سوچئے یہ عقیدت کا بہاؤ کس قدر اثر آفرین ہوتا ہے، خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد کہ ''اس شہر کو تمہاری پناہ میں دیا'' آج تک اپنی عظمت منوا رہا ہے، حکومتیں بدلیں، خاردار سرحدیں تیار ہوئیں، لوگ بٹ گئے مگر عقیدت کا یہ خروش آج بھی اپنی جولانی پر ہے، محبت وعقیدت کی دنیا محصور نہیں ہوتی اسی کی سرحدیں آفاقی ہوتی ہیں، حضرت خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان سر راہ بھی بٹتا رہا اور بر سر مسند حکومت بھی مگر آپ کا دامن کسی دنیاوی آلائش سے داغدار نہ ہوا، ایسی ہی کیفیت کا مولانا حالی نے ذکر کیا تھا۔

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی الگ ہے آسماں ان کا الگ

اُن کا رویہ تو یہ ہوتا ہے کہ ''رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح''
اس لیے اُن کا دامن کبھی معصیت کے سیلاب میں بھی تر نہیں ہوتا، حضرت خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ دہلی میں مستقل قیام پذیر رہے، رشد وہدایت کا فیضان دور ونزدیک کو محیط رہا، آخر دل تپیدہ ایک خنجر تسلیم سے یوں گھائل ہوا کہ دوام نثار ہو گیا، روایت ہے کہ محفل سماع تھی، حرف حرف دل مہجور ہو کر وصل آشنا کر رہا تھا کہ یہ شعر سماعت نواز ہوا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

شعر کیا تھا؟ ایک سرمستی کا پیغام تھا، از خود رفتہ ہو گئے، کئی روز اسی بے خودی میں رہے اور آخر وہ لمحہ آ گیا جس میں کوئی فنا ہو جاتا ہے اور کوئی ''جان دیگر'' کے دوام سے نواز دیا جاتا ہے، حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جاودانی کو اوڑھے حوض شمسی کے کنارے محو خواب ہیں، آپ کی سیرت کا یہ پہلو ہر عقیدت مند کے لیے مشعل راہ رہنا چاہیے کہ بے خودی کا عالم، وارفتگی کی حالت مگر نماز کا وقت آتا تو حضوری کی لذت حواس کو باخبری کے جلو میں

WWW.NAFSEISLAM.COM

لے لیتی، نماز ادا فرماتے تو پھر وہ عالم بے گانگی کی سرمستی گھیر لیتی، کیا یہ کردار اعلان نہیں کر رہا کہ ارے کس قدر بھی مدہوش ہو جاؤ، استغراق کسی نوعیت کا بھی ہو۔ بندے کو خالق نہیں بھولنا چاہیے اور نماز حضوری کا لمحہ ہے اسے کسی صورت ترک نہ کرنا چاہیے، بے خودی کے وہ دعویدار جن کو جوش جنوں کی وہ سرشاری بھی حاصل نہیں ہوتی جو مست الست اصحاب کا امتیاز ہے مگر فرضی بہانے اور باکرامت ہونے کے دعوئی نمازوں سے غافل کر دیتے ہیں۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

خواجہ قطب الدین کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان مسلسل جاری رہا، بڑے نامور بزرگوں نے حوض شمسی کے کنارے بسنے والے درویش خداست سے طہارت نفس کی توقیر پائی اور بقائے دوام کی ضمانت بھی حاصل کی، ان عالی مقام بزرگوں میں سب سے نمایاں وجود حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور ہم جس ذات تک رسائی کو اس تحریر کا متحرک سمجھتے ہیں اس کا تعلق اسی گنج شکر کی کرم بخشیوں سے ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۶۴ھ)

حضرت خواجہ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب فرخ شاہ کابلی کے واسطہ سے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، یہ خاندان کابل سے برصغیر آیا اور قصور میں آباد ہوا، قصور سے ہی آپ کے والد گرامی، جمال الدین سلیمان کوتھوال، جو ملتان کے اطراف میں تھا، کے قاضی مقرر ہوئے اس طرح یہ خاندان مستقل طور پر کوتھوال منتقل ہو گیا، اسی قصبہ میں حضرت فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ہوئی، آپ اولاد میں منجھلے تھے یعنی تین بھائیوں میں درمیانی تھے، بڑے بھائی کا نام اعزالدین محمود رحمۃ اللہ علیہ تھا جبکہ چھوٹے کا خواجہ نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ، سیر العارفین کے مصنف کا بیان ہے کہ آپ کے والد گرامی، سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے جو سلطان شہاب الدین غوری رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں ملتان آئے تھے، آپ کی والدہ محترمہ مولانا وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی تھیں، آپ پانچ برس کے ہوئے تو قرآن مجید کے حفظ پر مامور کر دیئے گئے، حفظ کے بعد اس دور کی تدریسی کتب کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے، علم فقہ کی کتاب النافع، زیر مطالعہ تھی کہ حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ وہاں تشریف لے آئے، کہتے ہیں کہ سعادت جب طلوع کرتی ہے تو وقت اور مقام کا تعین خود ہی کر لیتی ہے، حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کی نظر محبت جوان فریدالدین پر ٹھہر گئی، پیار سے پوچھا کیا پڑھ رہے ہو، عرض کیا نافع پڑھ رہا ہوں، مولانا منہاج الدین رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد محبت علم میں سرشار دیکھا تو سوال کیا تمہیں یقین

ہے کہ یہ کتاب یقیناً نفع دے گی، ہونہار طالب علم سوال میں چھپی حکمت اور اندازِ سوال کی برکات کو جان گیا برملا پکار اُٹھا "مرشد کے صدقے سے یقیناً نفع ہوگا۔" یہ جملہ کہا اور اپنے اندر کی باخبری عیاں کر دی، شناخت کا مرحلہ تھا عملاً قدموں پر گر کر اس کی تصدیق کر دی، ایسے راہ یاب جوان کو بھلا کوئی دیدہ ور نظر انداز کر سکتا ہے فوراً اپنا لیا، حضرت خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ دہلی کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے، یہ معیت قلب ونظر کا معاملہ تھا مگر اس دور کے صوفیاء صرف دعووں پر اساسِ منزلت نہ رکھتے تھے بلکہ علم کے حصول کو درجۂ افتخار گردانتے اور اس کے بغیر کسی رفعت کی امید نہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب علم کو ہی رفعتوں کا اہل قرار دیا ہے، محبت کی فراوانی بھی تھی اور شوقِ مصاحبت بھی مگر واجبات کی ادائیگی اس سفر خیر کی خشت اول ہے۔ فرمایا: "بابا فرید پہلے ظاہری علوم کی تکمیل کر لو پھر آ جانا اور مجھ سے علوم باطنہ حاصل کر لینا۔" یہ نصیحت قافلۂ فقر کے ہر صاحب عظمت کو ہمیشہ ازبر رہی، اس کے لیے تو مائیں بیوگی کے باوجود اولاد کی فرقت کے صدمے اٹھاتی رہیں، حضرت پیران پیر غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب زندگی کا یہ واقعہ تو ہر دور میں چشم کشا رہا، علم کی تکمیل کے بعد حاضر دربار ہوئے اور بے پایاں فیوض سے نوازے گئے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کوتھول ہی میں اٹھارہ سال کی عمر میں اعتبار بیعت حاصل کر لیا اور بعض نے یہ بھی لکھا کہ دہلی آ کر باضابطہ مرید باصفا بننے کا اعزاز پایا، یہ بھی روایت ہوا ہے کہ آپ حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر احباب کے ساتھ بغداد میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۲ھ) سے بھی صفائے قلب کی دولت حاصل کی تھی، صلاحیت کا وفور اس قدر عیاں تھا کہ حضرت شیخ شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بہت دعاؤں سے نوازا 'عوارف المعارف' ہمیشہ ہی حضرت فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں دلپسند کتاب رہی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ جب 'عوارف المعارف' کا درس دیتے تو اس قدر کیف طاری ہوتا کہ سامعین کے بھی ہوش اڑ جاتے، فرماتے ہیں میں نے اسی کتاب کے پانچ باب حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ سے

WWW.NAFSEISLAM.COM

پڑھے ہیں، ان کے بیان کی لذت سے مجھ پر وہ حالت طاری ہوتی کہ اگر اس حالت میں کوئی مر جائے تو اسے وصال حاصل ہو جائے۔ (سیر العارفین: ص ۷۰)

مستند علماء بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ عوارف المعارف، علم تصوف کی نصابی کتاب ہے، اس کے بغیر دعوئے تصوف بے کیف سا لگتا ہے، الحمدللہ یہ تھے پاسبانِ تصوف جن کے ہاں مجلس درس و تدریس سجتی تھی اور عوارف المعارف جیسی وقیع کتاب زیر مطالعہ رہتی تھی، کاش تصوف سے منسوب ان گدڑیوں کو اب بھی وقارِ علم حاصل ہو جائے۔

مدت سے مرید اپنے پیر کے ہمراہ سلوک کی منزلیں طے کرتا رہا، گنج شکر کی وجہ تسمیہ کئی حوالوں سے بیان کی جاتی ہے۔ کوئی بھی روایت سند اعتبار کو پہنچے یہ حقیقت ہے کہ شکر مزاجی کا یہ اعزاز آپ کے شیخ گرامی کے اسی قول کی صداقت پر حجت ہے کہ فرمایا تھا ''تم شکر کی طرح شیریں رہو گے۔'' آپ کے امتیازات عظمت کا ایک گوہر تابدار وہ ارشاد بھی ہے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے راست قدمی کی رفعتوں کو مشاہدہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''بابا قطب الدین! اس نوجوان کو کب تک مجاہدوں اور ریاضتوں کی بھٹی میں پگھلاتے رہو گے، اس کو اصل حقیقت کی پہچان کراؤ تاکہ وصال کے صاف و شفاف آب حیات سے فیض یاب ہو سکے۔'' پھر یہ اعلان بھی فرما دیا کہ

''فرید الدین ہمارا وہ چراغ ہے جو ہمارے سلسلہ کی روشنی کو زمین و آسمان تک پہنچا دے گا۔'' (گنجینہ چشت: ص ۲۲۵، ۲۲۶)

یہ ارشاد حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے لیے سند اعزاز تھا جس کی صداقت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی، یہاں تک کہ ابن بطوطہ جیسے جہان نورد نے بھی اس کا ذکر کیا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱۵/۳۴۱)

بیعت کا یہ بندھن اس قدر مستحکم ہوا کہ جب حضرت خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا لمحۂ وفات آیا تو یہ مرید کامل ہانسی میں تھا، سوال ہوا جانشینی کا شرف کسے دیا جائے، فرمایا: ''میرا خرقہ، دستار، مصلیٰ، چوبی جوتے اور میرا عصا، فرید الدین تک پہنچا دینا، وہی میرا

جانشین اور خلیفہ ہوگا۔" (مخزن چشت: ص ۲۲۷)

وفات کے بعد تمام نشانِ خلافت حاصل ہو گئے، دہلی بھی آئے تا کہ حاضری دے سکیں مگر مستقل قیام تقریباً بیس سال پاکپتن ہی میں رہا جو آپ کے قدموں کی برکت سے اجودھن سے پاکپتن ہو گیا تھا، حیرت ہے ان گنت انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے والا مرد درویش اکثر فاقوں سے رہا، ڈیلے یا کریر کے جنگلی بیر کھا کر گزر اوقات کرتا رہا بلکہ بقول حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ جس روز آپ کو اور آپ کی اولاد کو ڈیلوں یا پیلو سے کچھ مل جاتا وہ عید کا دن ہوتا، خود زیادہ تر روزہ سے رہتے تھے، رزقِ حلال کی اس قدر احتیاط تھی کہ ادھار سے بھی نفرت ہو گئی تھی، ایک روز لنگر میں ادھار کا نمک ڈال دیا گیا تو کھانا پسند نہ آیا، قوت شامہ کی یہ لطافت ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی، فرمایا کھانا بغیر نمک کے پک جاتا تو بہتر تھا، اسی قناعت کے باوجود شاہان وقت حاضری دینے سلطان نصیر الدین محمود حاضر دربار ہوا بلبن سراپا عقیدت بنا پیش ہوا، کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ اپنی بیٹی عقد میں دے دی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱۵/۳۴۱)

مرجع خلائق یہ وجود گری نے ایک طالب کے سوال پر جواب دیا تھا:

"میں چالیس سال سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف ہوں، جو وہ فرماتا ہے میں اس کی تعمیل کرتا ہوں، اب چالیس سال کے طویل عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ عنایت فرمائی ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہی کچھ ہو جاتا ہے۔" (مخزن چشت: ص ۲۲۰)

حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی ریاضت، عزلت نشینی، نفس کشی اور زہد و تقویٰ کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں، تقریباً پچانوے سال کی عمر پائی مگر زندگی کا کوئی لمحہ بھی اطاعت شعاری کے بغیر نہیں گزارا، ابتداء عمری میں قرآن مجید سے تعلق پیدا ہوا، تلاش علم میں دور دراز کے سفر کیے اور ہمیشہ بارگاہِ علم میں حاضری پر اصرار کیا حتیٰ کہ اس مرحلے پر بھی جبکہ علوم ظاہرہ پر دسترس بھی ہو گئی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ میں نے راہِ سلوک پر قدم رکھا تو دریافت کیا کہ تعلیم جاری رکھوں یا چھوڑ دوں تو فرمایا:

''من کسے را از تعلیم منع نکنم، آن ہم کن وایں ہم کن'' ہاں یہ اصول ضرور پیش نظر رہا کہ علوم کے حصول کا مقصد کیا ہے اس پر بڑا واضح اعلان فرما دیا۔

''مقصود از خواندنِ علم شریعت برائے عمل است نہ از برائے ایذاء خلق''

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند: ۳/۱۴۰)

روایت ہے کہ جب کسی سے بیعت لیتے تو سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص اور سورہ البقرہ آمن الرسول تا آخر کلمہ شہادت اور ان الذین عنداللہ الاسلام تک پڑھتے پھر فرماتے ''کہو تم نے اس ضعیف اور خواجہ خواجگان اور پیغمبر ﷺ کے دست مبارک پر بیعت لی اور اللہ تعالیٰ سے اس بات کا عہد کیا کہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ پر نگاہ رکھوں گا۔ برنہج شرع باشی یعنی شرع کے طریقہ پر چلے گا پانچ وقت کی نماز کی تاکید فرماتے اور بعض دیگر معمولات بھی ارشاد فرماتے:

حضرت فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ رشد وہدایت کا پیغام برصغیر کی سرزمین پر عام کرتے رہے، حلقہ ارادت اس کثرت سے پھیلا کہ چشتیہ سلسلہ کا مرکزی وجود قرار پائے، آخری ایام میں اپنے سب سے مقرب ساتھی خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کو بھی روانہ کر دیا کہ اشاعتِ خیر کسی صورت بھی اضمحلال کا شکار نہیں ہونی چاہیے، آپ بادل نخواستہ روانہ ہو گئے مگر ایک خدشہ تھا جو بے چین کرتا رہا، آخر وہ لمحہ وصال آ گیا، عشاء کی نماز ادا کی، بے ہوشی کا عالم طاری تھا، اچانک ہوش میں آئے تو پوچھا نماز عشاء پڑھ لی تھی؟ عرض کیا گیا، پڑھی تھی اور وتر کے ساتھ پڑھی تھی، فرمایا ایک مرتبہ پھر پڑھ لیتے ہمیں کیا معلوم موقعہ ملے یا نہ ملے، خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے لیے وہ لباس تفویض کیا جو حضرت خواجہ قطب رحمۃ اللہ علیہ سے ملا تھا، حکم دیا اسے ان تک پہنچا دیا جائے، پھر وضو کیا دوگانہ پڑھا اور سجدہ میں چلے گئے اس حالت میں وصال فرمایا، انتقال ۵ محرم بدھ کے روز ہوا۔ (سیر العارفین: ص ۷۸)

WWW.NAFSEISLAM.COM

انتقال کے سال کے بارے میں اختلاف ہے، ۶۶۴ کا ذکر ہوا اور ۶۷۰ کا بھی، اسی سال تک مسند خلافت سے خواجہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کا پیغام لوگوں تک نہایت تندہی اور خلوص سے پہنچایا، ہمیشہ للّٰہیت کو مقصود نظر رکھا، عقیدتوں کی کثرت کسی دنیاوی مفاد کا ذریعہ نہ بنی بلکہ فرماتے رہے:

''ہمارے خواجگان کی رسم ہے کہ ہم کسی کی نذر قبول نہیں کرتے۔''

ہر لمحہ خلائق کے جھرمٹ میں رہنے والا درویش برملا پکارتا رہا کہ

''کمالیت سے مراد کم خوری، کم خوابی، کم گوئی اور کم آمیزی ہے۔''

یہ بھی حکم صادر فرمایا:

''توبہ کے بعد تائب ان لوگوں سے میل جول نہ رکھے جن سے قبل از توبہ رکھتا تھا۔'' (تاریخ مسلمانان پاکستان وہند: ۱۴۲/۳)

حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا فیض کئی روشن صورتوں میں آشکار ہوتا رہا مگر جن کی ذات حضرت سے نسبت رکھنے میں ممتاز قرار پائی ان میں نمایاں تر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہے، ہم جس مردِ قلندر کے ذکر کی طرف بڑھ رہے ہیں اُن کی نسبت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اس لیے آپ کی ہی حیات مبارکہ کے چند نقوش پیش کیے جا رہے ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۲۵ھ)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان سادات کرام کی حسینی شاخ سے تعلق رکھتا ہے، یہ خاندان وسط ایشیاء کے مشہور علمی وروحانی مرکز بخارا میں قیام پذیر تھا کہ چنگیز خان نے وسط ایشیاء کے شہروں کو تباہ وتاراج کرنا شروع کیا تو خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے دادا سید علی بخاری کو ہجرت کرنا پڑی، برصغیر کا رُخ کیا، کچھ دن لاہور میں گزارے، پھر بدایوں چلے آئے اور یہیں آباد ہو گئے، خواجہ علی کے ایک دوست خواجہ عرب تھے، خواجہ علی نے ترک وطن کیا تو خواجہ عرب بھی ساتھ تھے،.....اکٹھے ہی بدایوں میں آباد ہوئے، یہاں دوستی نے پائیدار رشتے کی حیثیت اختیار کر لی، خواجہ علی کے ایک ہی صاحبزادے تھے خواجہ احمد، خواجہ عرب کی صاحبزادی بی بی زلیخا ان سے منسوب ہوئیں۔

(دبستان نظام، ڈاکٹر اسلم فرخی: ص ۱۲)

بی بی زلیخا کے ہاں بدایوں ہی میں ۲۷ صفر ۶۳۶ھ/۹۔اکتوبر ۱۲۳۹ء کو حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، صرف پانچ سال کے تھے کہ والد گرامی شیخ احمد دانیال وفات پا گئے اس طرح تربیت کی ساری ذمہ داری بیوہ ماں کو نبھانا پڑی، عجیب ہم رنگی ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ بیوگی کے باوجود ان مقدس ماؤں نے یوں حق تربیت ادا کیا ہے کہ تاریخ ان مامتاؤں کے حسن کفالت کی آج تک معترف ہے، والدہ نے ہونہار بردا کے چکنے چکنے پات کا اندازہ کر لیا

تھا اس لیے لائق احترام اساتذہ کی خدمات حاصل کرلیں، علامہ علاؤ الدین اصولی رحمۃ اللہ علیہ کے علم کا عام چرچا تھا ان کے سامنے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے زانوئے تلمذ طے کیا، اُن سے علم فقہ کی تعلیم پائی، کہا جاتا ہے کہ صرف بارہ سال کے ہی تھے کہ قدوری پڑھ لی تھی، ۱۶ سال کے ہوئے تو مزید تعلیم کے لیے اپنی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ صاحبہ کے ساتھ دہلی آ گئے، دہلی ان دنوں مرکز علم بھی تھا اور منبع حکمت بھی، وہاں خواجہ شمس الدین خوارزمی، امام لغت وحدیث رضی الدین حسن صاغانی اور متعدد دیگر علماء سے علم حدیث، علم تفسیر، علم اصول، علم فقہ، علم منطق، علم معانی اور علم ہندسہ میں قابل اعتماد مہارت حاصل کی، اپنی علمی استعداد کی بنا پر کبھی منطقی، کبھی اصولی کہلائے اور مولانا نظام الدین مقرر محفل شکن کے لقب سے معروف ہوئے۔ (مخزن چشت: ص ۲۴۰)

خوش قسمتی کی انتہا یہ ہوئی کہ دہلی میں جہاں قیام رہا وہاں پڑوس میں قطب وقت حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے برادر عزیز حضرت شیخ نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ رہائش پذیر تھے، حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا اُن کے ہاں آنا جانا ہوا، جلد ہی صحبت کے اثرات ہویدا ہونے لگے، انہی ایام میں والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تو تنہائی کے سارے لمحات حضرت نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گزرنے لگے، درویشانہ زندگی نے تحریک دی، والدہ مرحومہ کی تربیت کے ایام سامنے تھے کہ وہ کس طرح قناعت و توکل کا عملی درس دیتی تھیں، تنگ دستی تو تھی ہی، کبھی فاقے بھی ڈیرا ڈال لیتے تھے مگر والدہ محترمہ کا پروقار لہجہ راہنمائی کرتا، فرماتیں ''آج تو ہم اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں''، اسی تلقین نے روزہ دار رہنے کی دعوت دی، ایسی عادت پڑی کہ زندگی بھر یہی معمول رہا، حضرت نجیب الدین متوکل رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقام ومنصب سے آگہی نصیب ہوئی، ایک بے خود کرنے والی تڑپ بیدار ہوئی تو سفر کا ارادہ کرلیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بیس سال کے تھے کہ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ کو اجودھن حاضر ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ اس زری زربخش کے

WWW.NAFSEISLAM.COM

مدت سے منتظر تھے، نہایت شفقت سے پناہ میں لے لیا، اس دور کے آستانے علمی مراکز ہوتے تھے خود صاحب سجادہ تدریسی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے پوری کوشش ہوتی تھی کہ مرید باصفا کسی طور علمی مفلسی کا شکار نہ رہے، حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ تو علوم وفنون کے نامور اساتذہ میں تھے اس لیے آپ کی درگاہ نشر علم کا بہت بڑا حوالہ تھی، اس بارگاہِ علم میں آپ نے متعدد کتب پڑھیں۔ ان میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق کتاب عوارف المعارف کے پانچ باب وابوشکور سالمی کی تمہید المبتدی نمایاں ہیں، بابا جی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق قرآن مجید حفظ کیا، اللہ اللہ۔ کیسے شیخ ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کے حفظ کی تاکید فرماتے تھے اور علم کی بارگاہ میں ہمہ وقت تیاز مند رہنے کا درس دیتے تھے ع

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اجودھن (پاکپتن) میں کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس چلے گئے مگر چند روز بعد پھر تشریف لائے، کہا جاتا ہے کہ کل تین مرتبہ حاضر ہوئے، ہر مرتبہ شفقت ومحبت سے نوازے گئے، ۶۵۱ھ میں تیسرا سفر محبت تھا کہ خلافت عطا ہوئی اور 'نظام الدین' کا لقب ملا، اگرچہ حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر موجود نہ تھے، مگر بابا جی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا جامہ، مصلیٰ اور عصا اُن کو دیئے جانے کی وصیت فرمائی، یہ گویا بابا صاحب کی جانشینی اور خواجہ صاحب کے خصوصی مقام کی طرف اشارہ تھا۔

حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دہلی میں مستقل مقام بنانے کا حکم دیا تھا جس پر آپ نے مشکل حالات کے باوجود عمل کیا، ابتداء میں آپ امیر خسرو کے نانا کے ہاں تقریباً دو سال رہے مگر ایک روز نانا کی عدم موجودگی میں امیر خسرو کے ماموں نے آپ کو گھر سے نکال دیا، وہ رات آپ نے ایک چھپر دار مسجد میں گزاری اور پھر غیاث پور میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۲۲/۳۵۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بندگانِ بے ریا کبھی بھی آسودگی کو مقصودِ نظر نہ رکھتے تھے، کہا جاتا ہے کہ آپ نے نہایت عسرت اور تنگ دستی سے زندگی کا سفر طے کیا،

WWW.NAFSEISLAM.COM

خود فرماتے تھے" چالیس سال سے نہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور نہ پانی پیا۔" اور جب فتوحات کی کثرت بھی ہوگئی تو بھی قناعت کا وہی معیار قائم رہا کہ روزہ دار ہی رہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرشد کامل سے وفا شعاری کا عہد تمام عمر نبھایا ہے، خود صاحب علم تھے، ایک باعظمت ووقار عالم دین تھے، علم کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ 'مشارق الانوار' جیسی حدیث کی کتاب زبانی یاد تھی، فوائد الفواد کا ورق ورق شہادت دے رہا ہے کہ مجلسی گفتگو میں کس قدر علمی وکلامی مباحث ہوتے تھے، ہر پیش آمدہ مسئلہ پر مضبوط اور نا قابل تردید دلائل آپ کے علمی تفوق کا برملا اعلان ہے، نحوی اشکال پر گہری نظر تھی مگر عقیدتِ شیخ کا عالم یہ تھا کہ حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دعا پڑھنے کا ارشاد فرمایا:

"خواجہ نظام نے دعا پڑھی تو شیخ (حضرت بابا جی رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک اعراب کی اصلاح فرمائی، فرمایا اس طرح پڑھو، خواجہ نظام نے ارشاد شیخ کے مطابق وہ اعراب پڑھا، اگرچہ جس طرح انہوں نے پہلے پڑھا تھا وہ بھی بامعنی تھا لیکن ارشاد شیخ پر عمل کیا۔" (وہ دعا یاد کر لی اور دوبارہ سنائی تو اعراب میں ارشاد شیخ کا التزام رکھا) اس پر مولانا بدرالدین اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے کہا، تم نے اچھا کیا کہ وہ اعراب اسی طرح پڑھا جس طرح شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا، خواجہ نظام جواب میں کہنے لگے "اگر سیبویہ اور دوسرے وہ سب علماء جو اس علم کے بانی ہیں آئیں اور کہیں کہ اعراب اسی طرح ہیں جس طرح تم نے پڑھے تھے تب بھی میں اسی طرح پڑھوں گا جس طرح شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔" (دبستان نظام: ص ۳۶)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے پاکپتن سے روانہ کرتے ہوئے فرمایا تھا "برو ملک ہند بگیر" جاؤ ہندوستان کو تھام لو تاریخ آج تک اس ارشاد کی صداقت پر شاہد ہے۔

ایک عملی تربیت کا واقعہ ہے کہ لنگر خانہ کے لئے کھانا پکاتے وقت نمک دستیاب نہ ہوا حضرت خواجہ نظام رحمۃ اللہ علیہ ایک قریبی بقال سے نمک ادھار لے آئے، شوربہ تیار ہوا،

WWW.NAFSEISLAM.COM

لقمہ اٹھایا ہی تھا کہ حضرت باباجی رحمۃ اللہ علیہ نے واپس رکھ دیا، تشویش ہوئی فرمایا اس میں کچھ شبہ ہے، انکشاف ہوا کہ نمک ادھار کا ہے تو اس پر حضرت باباجی نے فرمایا:

''درویش چاہے فاقہ سے مرجائیں مگر عزت نفس کے لیے قرض نہیں لیتے اس لیے کہ قرض اور توکل میں بُعد المشرقین ہے۔'' (سیر العارفین: ۸۴)

یہ تربیت حضرت نظام رحمۃ اللہ علیہ کے کردار کا جزو لاینفک بن گئی، بادشاہوں نے قرب چاہا تحائف پیش کرنے چاہے مگر صاف انکار کرتے رہے حتیٰ کہ ملاقات سے بھی گریز رہا مگر ترویج دین کا مشن پوری قوت سے جاری رکھا ایسے ایسے لوگ حلقہ بگوش ہوئے جو خود مقام عزیمت پر تھے، ان میں

- مولانا شمس الدین یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ جن کے علم کا اعتراف خواجہ نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے یوں فرمایا:

سَالْتُ الْعِلْمَ مَنْ اَحْیَاکَ حَقًّا
فَقَالَ الْعِلْمُ شَمْسُ الدین یحییٰ

- مولانا حسام الدین ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، جو ایک باکمال فقیہ تھے۔
- مولانا فخر الدین زرّادی رحمۃ اللہ علیہ جن کے علم کی عظمت کا اعتراف حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا۔
- قاضی محی الدین کاشانی رحمۃ اللہ علیہ — اودھ کے قاضی خاندان کے نامور سپوت
- مولانا علاؤ الدین رحمۃ اللہ علیہ — اودھ کے مشہور عالم
- امیر حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ — فوائد الفواد کے مؤلف، نامور وقائع نگار
- مولانا ضیاء الدین برنی رحمۃ اللہ علیہ — مؤلف تاریخ فیروز شاہی
- امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ — نامور شاعر اور شہرہ آفاق انشا پرداز
- اُخی سراج رحمۃ اللہ علیہ — بنگال میں سلسلہ چشتیہ کے لائق اعتماد شیخ
- مولانا برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ — دکن میں سلسلہ کی ترویج کا سبب
- مولانا وجیہہ الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ

- شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، جن کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

بعض تذکروں میں خلفاء کی تعداد سات سو تک بتائی جاتی ہے، اس ہمہ جہت نشر خیر ہی کا نتیجہ تھا کہ سلسلہ چشتیہ برصغیر کے ہر شہر بلکہ ہر قصبے تک پھیلتا چلا گیا، اس وسعت اور ہمہ گیری کا بیشتر انحصار حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے رویوں پر ہے کہ کس طرح آپ نے صوفیاء کے اس سلسلہ کو ہر ذی شعور تک پہنچایا اور کس طرح ہر کسی کو متاثر کیا، مجلسی زندگی میں حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا کردار بڑا اہم ہے، ہر کسی کے درد و غم کا مداوا کرنا آپ نے اپنے فرائض میں شامل کر رکھا تھا، مزاج کے اعتبار سے لوگوں میں آسانیاں بانٹتے تھے، تقویٰ شعاری کے حوالے سے بھی زیادہ بوجھ ڈالنا پسند نہ کرتے تھے، مگر خود مشقت برداشت کرنے پر مائل رہتے تھے مثلاً

- غیاث پور سے کیلوگری روزہ کے ساتھ پیدل سفر کرتے تاکہ وہاں نماز جمعہ ادا کر سکیں۔ سوچئے اگر دیوار سے جڑی یا نشست کے سامنے مسجد تک جانا نصیب نہ ہو تو نظامی ہونے پر فخر کیونکر؟
- جھوٹا نامی بدزبان شخص کے جنازے پر گئے اور دعا کی

''اے پروردگار اس شخص نے میرے بارے میں جو کہا اسے معاف کر دے اور میری وجہ سے اسے عذاب نہ دے۔

- مجلس میں چند لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے تو احباب کو اکٹھا ہونے کا فرمایا اور کہا

''میں دھوپ میں بیٹھنے والوں کو دیکھ کر جل رہا ہوں۔''

- ایک شخص سامنے آیا اور آپ کے خلاف بولنے لگا، جب جانے لگا تو تحفہ دیا، فرمایا، لوگ مجھے تحائف دیتے ہیں، کسی کو تو مجھے بھی دینا ہے۔''

اس ہمدردانہ رویے کے باوجود شریعت مطہرہ کی پاسداری کا ہمیشہ خیال رہتا، کہا جاتا ہے کہ جب بھی لوگ ملنے آتے اور رمضان مبارک کا مہینہ ہوتا تو صدقہ فطر اور

تراویح کا ضرور پوچھتے، آپ کے معمولات میں

اوابین، ایام بیض کے روزے، تماز چاشت، صلوٰۃ السعادت (چار رکعت)

قرآن مجید کی تلاوت، مولانا شہاب الدین کو امام مقرر کیا ہوا تھا اس لیے کہ وہ بہت دلکش آواز میں قرآن مجید کی تلاوت/قراءت کرتے تھے۔

بہتر ہوگا اس شیریں گفتگو کا اختتام آپ کے چند فرمودات پہ کیا جائے تا کہ طلب خیر کی تحریک کو مہمیز لگے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

- جب کسی امیر حکمران کے آنے کی خبر سنتے تو فرماتے

''آہ'' یہ لوگ کیوں آتے ہیں، نہیں چاہتے کہ فقیر آرام سے بیٹھے۔

اور آخر پر ایک اسی قسم کا واقعہ سنئے:

''سلاطین کے ہاں جانا پسند نہ تھا، علاؤالدین خلجی نے خواہش کی، انکار کر دیا اُس نے امیر خسرو سے کہا بغیر اطلاع دیئے، جائیں گے، امیر نے بتا دیا تو آپ راتوں رات اجودھن کی طرف روانہ ہو گئے، سلطان کو معلوم ہوا تو امیر خسرو پر ناراض ہوا، امیر نے عرض کیا

''از رنجش بادشاہ ہمیں خوف جان باشد، اما از رنجش سلطان المشائخ خوفِ سلب ایمان باشد۔''

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ایک مدت ریاضت و اطاعت کی زندگی گزار چکے تو بیمار رہنے لگے، احباب کو بلایا، ہدایا سے نوازا اور برصغیر کے مختلف علاقوں کی طرف روانہ کیا۔ ''بدھ کا روز تھا کہ نماز عصر کے بعد حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کو بلایا، خرقہ، عصا، مصلیٰ، تسبیح، لکڑی کا پیالہ اور جو کچھ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو ملا تھا سب شیخ نصیر الدین محمود کو عطا فرما دیا اور کہا ''تم کو شہر دہلی میں رہنا چاہیے اور لوگوں کے ظلم و جور برداشت کرنے چاہئیں۔'' (سیر العارفین: ص ۱۲۳)

نماز مغرب کا وقت نہ ہوا تھا کہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین دہلویؒ ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قدر بھرپور زندگی گزاری کہ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا، مسلسل تلقین، بے انقطاع عبادت اور بلا وصل ہدایت، تبلیغ دین اور کرداری سازی کے مشن پر اس قدر پختہ رہے کہ کوئی راستے کی رکاوٹ بڑھتے ہوئے قدم نہ روک سکی یہاں تک کہ شادی بھی نہ کی کہ اس کی فرصت ہی نہ ملی۔

اللہ اللہ کس قدر محویت کے عالم میں رہے کہ لمحہ لمحہ خیر کی نوید بنتا رہا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت نصیر الدین محمود اودھی المعروف بہ چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(م: ۷۵۷ھ)

حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور خلیفہ، مسند نشین اور سلسلہ چشتیہ کے گل سرسبد حضرت شیخ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ کے دادا محترم شیخ عبداللطیف یزدی، خراسان سے ہجرت کر کے لاہور آ بسے تھے، یہاں آپ کے صاحبزادے یحییٰ پیدا ہوئے جوانی ہی میں لاہور چھوڑ کر اودھ آ گئے، یہاں پشمینے کی تجارت کرتے رہے، اودھ ہی میں حضرت نصیر الدین ۶۷۵ھ میں پیدا ہوئے، نو برس کے ہوئے تھے کہ والد محترم کا انتقال ہو گیا اور تربیت کی ساری ذمہ داری والدہ محترمہ پر آ پڑی، والدہ محترمہ کی علم دوستی اور تقویٰ شعاری نے ابتداء عمر ہی میں مستقبل کی عظمت کا اہتمام کر دیا تھا، اس دور کے معروف عالم، مولانا عبدالکریم شروانی کو اس نونہال کی علمی پیش رفت کا کفیل بنایا۔ آپ نے استاد گرامی سے ہدایہ اور اصول البزدوی ہی پڑھی تھی کہ مولانا عبدالکریم شروانی کا انتقال ہو گیا، پھر دیگر اساتذہ سے کسب علم میں مشغول رہے ان میں افتخار الدین محمد گیلانی بھی شامل تھے، کہا جاتا ہے کہ بیس سال کی عمر تھی کہ تمام مروجہ علوم سے فارغ ہو گئے تھے، یہ اس دور کا تقاضا رہا تھا کہ علوم ظاہریہ کی تکمیل کے بعد ہی علوم معرفت کی طرف بڑھا جائے، اس طرح اس عصر سعید میں بے علمی کا جھول اور جہالت کا غیر متوازن رویہ کہیں نظر نہیں آتا۔ حضرت نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ بھی علوم سے فارغ ہو کر تلاش حق کے روحانی سفر

WWW.NAFSEISLAM.COM

پر روانہ ہوئے، تنہائیوں میں فکر و ریاضت کا عمل جاری رہتا، ویرانوں، صحراؤں اور جنگلوں میں گھومتے اور کسی فکری یافت کے منتظر رہتے، فاقہ کشی کے مہ و ایام، روزے کا مسلسل دورانیہ اور لذاتِ دنیا سے کنارہ کشی نے حواس کو مجتمع کرنے اور روح کو بیدار رکھنے کی سعادت نصیب فرمائی، تجسس و تلاش جب اضطراب و تموج کی صورت اختیار کرنے لگا تو کسی راہ نورد کی جستجو ہوئی، تینتالیس سال کے ہوئے تھے کہ دہلی کا رُخ کیا اور حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں حاضر ہو گئے، حضرت سلطان المشائخ اس نو وارد عقیدت مند کا تیور ہی بھانپ گئے تھے اس لیے کچھ ہی عرصہ بعد بلایا اور ارادت مندی کو خلعت نوازی سے مشرف فرما دیا، پھر تو یہی درگاہ مسکن ٹھہری، کہا جاتا ہے کہ دہلی میں قیام شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر ہوتا، اس مسلسل خیال میں والدہ کی محبت جوش مارتی تو حضرت سلطان المشائخ سے اجازت لے کر چلے جاتے اور والدہ کی خدمت میں مشغول رہتے، جب اس نیک سیرت والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تو دہلی میں ہی مستقل قیام کر لیا اگرچہ بہن کو ملنے پھر بھی آتے رہے۔ حیرت ہے استغراق و محویت کے عالم میں بھی حقوق کی ادائیگی کا مسلسل خیال رہا۔ طبیعت عزلت پسند تھی اس لیے تنہائیوں میں ڈوب جانا چاہتے تھے مگر مرشد کامل کا حکم بجالانے ہی میں عافیت سمجھی، امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ تنہائی کے اجازت مانگی تھی مگر حکم یہ ملا:

"شیخ نصیر الدین سے کہہ دو کہ تمہیں خلق میں رہنا اور لوگوں کے جور و ظلم کے مصائب جھیلنے چاہئیں اور ان کے عوض میں بذل و ایثار اور سخاوت و بخشش کرنا چاہیے۔ (تاریخ مشائخ چشت، خلیق نظامی: ص ۲۳۶)

دہلی اُن دونوں درویش کے لیے سازگار نہ رہی تھی، بادشاہ انانیت پسند ہو گئے تھے اور گردنوں کو جھکا دیکھنا چاہتے تھے اور یہ کہ انکار سننے کا حوصلہ بھی نہ رکھتے تھے اس لیے تنہائیاں اچھی لگنے لگی تھیں مگر مرشد کامل کا فرمان تھا، انہی مصائب میں رہنا ہے کہ حالات کا جبر اگر اصحابِ عزیمت کو فرار کی ترغیب دینے لگے تو دین کی اشاعت کیسے ہوگی اور اصلاح

کا عمل کیسے جاری رہے گا، یہ بزرگ رخصتوں پر نہیں عزیمتوں پر عمل کرنے کا ذوق رکھتے تھے اسی لیے حضرت نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ناسازگار ماحول میں بھی علم حق بلند رکھنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا، اب تو شاید زبان حال سے یہی اعلان فرما رہے تھے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا بادِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ صرف خیالی ماحول نہ تھا، واقعتاً یہ ہوا کہ آپ کی تنہائی میں ایک خودسر اور بے باک قلندر گھس آیا، کوئی محافظ نہ تھا اور کوئی خادم بھی نہ تھا، عالم استغراق میں تھے کہ قلندر نے چھری سے وار کرنا شروع کر دیا، اس دیدہ دلیر نے جسم حضرت پر گیارہ زخم لگائے، خون بہا کہ باہر تک آ گیا، عقیدت مند دوڑے اور قلندر کو پکڑ لیا، فرمایا اسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچایا جائے، سزا کے بجائے بیس تنکہ عطا کیے کہ شاید چھری مارتے تکلیف ہوئی ہو۔ (تاریخ مشائخ چشت: ص ۲۳۸، ۲۳۹)

حضرت خواجہ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ نے اشاعت دین اور ترویج سلسلہ میں وہ انہماک دکھایا کہ ہر صاحب ایمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، برصغیر تو آپ کی جولاں گاہ تھا ہی، برصغیر سے باہر بھی یوں ذکر پھیلا کہ عوام ہی نہیں بڑے بڑے اصحاب علم گرویدگی کا اظہار کرنے لگے، روایت ہے کہ

''حضرت مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ المعروف سید جلال سیاح بیت اللہ کی زیارت کے لیے مکہ مکرمہ گئے تو وہاں آپ حضرت امام یافعی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے بھی بہرہ ور ہوئے، انہوں نے فرمایا آپ سے قبل دہلی میں بزرگانِ دین تو بہت ہوئے لیکن اب دہلی میں جس چراغ نے روشنی پھیلائی وہ شیخ نصیر الدین رحمۃ اللہ علیہ ہیں، پس اسی دن سے آپ چراغ مشہور ہو گئے۔''

(مخزن چشت: ص ۲۶۸، تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند: ۳/۱۶۲)

یقیناً آپ کا وجود روشنی کا مینار تھا، چراغِ ہدایت تھا اور گم کردہ راہ لوگوں کے

WWW.NAFSEISLAM.COM

لیے آفتاب جہانتاب تھا، حمید قلندر نے آپ کے معمولات وملفوظات کو 'خیر المجالس' میں جمع کیا ہے، یہ ہم عصر عقیدت مند کا نذرانہ محبت بھی ہے اور قارئین کے لیے طلب خیر کا ذریعہ بھی، حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عمل اور رویے سے ثابت کر دکھایا کہ آپ یقیناً چراغ ہیں، ایک باکمال صوفی ہوتے ہوئے ایک حقیقت آشنا عالم ہونے کا ثبوت بھی دیا، صرف ایک مثال جو اس دعویٰ کی بہترین مؤید ہے۔

''آپ کے خدام نے آپ سے دریافت کیا کہ حضرت: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ'' (یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا) تو اس حدیث میں صورتہ میں ہاء کی ضمیر کا مرجع کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ضمیر کا مرجع آدم علیہ السلام ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس کی اپنی خاص صورت پر تخلیق کیا کیونکہ آدم علیہ اسلام قد قامت کی بلندی کی وجہ سے دوسرے تمام انسانوں سے الگ صورت رکھتے تھے نیز آدمیوں میں ہوتا ہے کہ عام آدمی پہلے بچہ ہوتا ہے پھر جوان اور پھر بوڑھا ہو جاتا ہے تو آدمیوں کی صورت ایک حال پر قائم نہیں رہتی لیکن حضرت آدم علیہ السلام میں عمر کی ان تبدیلیوں کی وجہ سے تبدیلی نہیں آتی تھی۔''

(مخزن چشت: ص ۲۷۸، ۲۷۹)

حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کی محفلوں میں ''ابوحنیفہ ثانی'' بھی کہا جاتا ہے کہ شریعت کی پاسداری اُن کا وہ امتیاز ہے جو ہر دور میں آپ کا حوالہ رہا ہے، آپ کی محافل میں درس وتدریس کا بھی خاص اہتمام ہوتا تھا، ملا کمال الدین کی تالیف ''طرفۃ الفقہاء'' میں اس روش کی تصدیق کی گئی ہے کہ آپ کی مجلس میں

ہر طرف درسہا زفقہ و اصول ہر طرف ذکر از خدا و رسول

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۷/ ۶۲۱)

آپ کی مجلس کا عمومی مزاج درس وتدریس کا تھا اس لیے محافل سماع کا

انعقاد و معمول نہ رہا تھا حتیٰ کہ آپ کے شاگرد و مرید قاضی عبدالمقتدر تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت شیخ نصیر الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ کے سماع میں مزامیر ہرگز نہیں ہوتا تھا۔

(سیر العارفین: ص ۱۲۹)

سماع سے خاص دلچسپی نہ تھی اور مزامیر کے تو سخت خلاف تھے البتہ ذوق سماع ضرور تھا اور کبھی کبھی وجد کی حالت بھی طاری ہو جاتی تھی، حفظ شریعت کا پاس بہر حال تمام امور پر غالب تھا۔

(تاریخ ادبیات مسلمان پاکستان و ہند: ۳/۱۶۲)

دیگر صوفیاء چشتیہ سے اس معاملے میں الگ روش کے قائل تھے، آلات موسیقی کے تو کسی طور حق میں نہ تھے پھر بھی، کہا جاتا ہے کہ ''آخر عمر میں مرشد کے طریقہ کے مطابق سماع سن لیا کرتے تھے۔''

۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ جمعۃ المبارک کے روز دہلی میں انتقال فرمایا اور دہلی میں ہی مدفون ہیں، شاید مرشد کریم کی پیروی مقصود تھی یا کوئی اور رکاوٹ کہ عمر بھر مجرد ہی رہے، کہا جاتا ہے کہ حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہی سلسلہ چشتیہ کا دورِ اول مکمل ہو گیا، یہ شاید اس لیے کہا گیا کہ آپ نے کسی کو خلافت عطا نہیں کی بلکہ وصیت یہ فرمائی:

''جب مجھے قبر میں رکھا جائے تو حضرت شیخ و مرشد کا عطا کردہ خرقہ اور عصا میرے سینہ پر رکھ دینا لکڑی کا پیالہ اینٹ کے بجائے میرے سر کے نیچے رکھ دینا، تسبیح میرے ہاتھ میں ڈال دینا اور جوتے قبر میں میرے قریب رکھ دینا۔''

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ (مخزن چشت: ص ۲۷۹)

پروفیسر خلیق نظامی کا خیال ہے کہ ''حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس کر لیا تھا کہ ان حالاتِ گرد و پیش میں کوئی ایک شخص کل ہند کے نظام کا بار گراں نہ سنبھال سکے گا چنانچہ

انہوں نے وصیت فرمائی کہ مشائخ سلسلہ کے تبرکات ان کے ساتھ دفن کر دیئے جائیں۔''

(تاریخ مشائخ چشت: ص ۲۴۳)

الغرض اپنے مرشد و شیخ کے بعد بتیس سال یہ سلسلہ رشد و ہدایت آپ کی زیر نگرانی راہِ سلوک پر مضبوطی سے کاربند رہا جس کے اثرات آج تک ہر کہیں دیکھے جا سکتے ہیں، آپ کے مریدوں میں قاضی عبدالمقتدر تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا خواجگی، شیخ کمال الدین علامہ، حضرت سید محمد گیسودراز علیہم الرحمۃ اور دیگر کئی بزرگ مشہور و معروف ہوئے اور سلسلہ چشتیہ کے فروغ کا سبب بنے، موضوع کے حوالے سے ہم اپنے تذکرے کو حضرت شیخ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ تک محدود کر رہے ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت شیخ کمال الحق والدّین علامہ رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۵۶ھ)

حضرت شیخ چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بظاہر کسی کو جانشین نامزد نہیں کیا، درخواست بھی کی گئی جیسا کہ شیخ زین الدین رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا تھا؟

''مخدوم، آپ کے بہت سے مرید صاحب حال اور اہل کمال ہیں، اُن میں سے کسی ایک کے لیے اشارہ ہوجائے تو آپ کی جگہ پر بیٹھ جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ سلسلہ بالکل ہی ختم ہوجائے۔''

فرمایا جن درویشوں کو اہل سمجھتے ہو نام لکھو، تین فہرستیں تیار کی گئیں، اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مطالعہ کے بعد فرمایا:

''شیخ زین الدین، ان لوگوں سے کہہ دو کہ اپنے ہی ایمان کا فکر کریں، دوسروں کا بوجھ سر پر لینے سے کیا حاصل۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ص۲۴۳)

اس انکار کے باوجود یہ بات یقینی ہے کہ بعض اشارے واضح طور پر اس فریضہ کی تکمیل کا پیغام دے رہے تھے، یہ ضرور ہوا کہ مختلف علاقوں کے لیے الگ الگ مرید مقرر فرمائے مثلاً بنگال کے لیے حضرت اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ، دکن میں شیخ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ اور گجرات میں نمایاں نام شیخ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

حضرت شیخ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ، اپنے پیر و مرشد حضرت چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے بھی تھے اور ان کے والد گرامی عبدالرحمٰن آپ کے حقیقی چچا کے صاحبزادے

بھی تھے، اس طرح بھتیجے بھی ہوئے، اس تعلق سے کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، گجرات اور دیگر علاقوں میں ہدایت و راہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے، آخر دہلی آ گئے اور یہیں ۲۷ ذوالقعدہ ۷۵۶ھ کو انتقال فرمایا اور اپنے مرشد کے قریب ہی دفن ہوئے۔

خواجہ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذوقِ علم اس قدر فراواں تھا کہ مروجہ علوم کی ہر شاخ میں مہارت حاصل کی، اس قدر تبحر تھا کہ ہر خاص و عام 'علامہ' کے لقب سے پکارتے تھے، عبادات میں انہماک بھی حد درجہ کا تھا، حج و زیارت مدینہ منورہ کے لیے بھی گئے، بیت المقدس بھی حاضر ہوئے، راستے کی محبتیں سمیٹتے ہوئے واپس آئے۔

پروفیسر خلیق نظامی شجرۃ الانوار سے نقل کرتے ہیں کہ

''آپ ابتداء جوانی ہی میں فنونِ علمی سے بہرہ یاب ہو چکے تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس قدر کمال پایا کہ کوئی علم باقی نہ رہا، علم تفسیر، علم حدیث اور علم فقہ سے وافر حصہ پایا تھا، اس دور کے علماء، مفسرین، محدثین اور فقہاء میں علامہ، کے لقب سے معروف تھے۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ۲۶۳)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت شیخ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ (م:۸۱۷ھ)

شیخ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ کمال الدین علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے تھے، خواجہ چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے چار سال کی عمر میں بیعت ہو گئے تھے مگر جوان ہو کر اپنے والد گرامی سے نسبت چشتیہ حاصل کی، صاحب علم وکمال تھے، مولانا احمد تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ (جو عربی زبان کے مایہ ناز شاعر تھے)، مولانا عالم پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عالم سنگریزہ سے علوم حاصل کیے اور ایک لائق اعتماد تبحر حاصل کیا، سلطان فیروز شاہ جو بہمنی حکومت کا نامور تاجدار تھا، نے دکن آنے کی دعوت دی کہا جاتا ہے کہ سات ہزار کی رقم بطور زادِ راہ بھی پیش کی مگر صوفی بے ریا نے نہایت استغناء کا اظہار فرماتے ہوئے رقم واپس کر دی۔ (مخزن چشت: ص ۲۸۸) اور فرمایا: ''حق تعالیٰ مرا ور گجرات ہر چہ ضرورت است عطا می فرماید۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ص ۲۶۴)

والد گرامی نے وفات کے وقت تنہائی میں پاس بلا کر خرقہ خلافت عطا فرما دیا تھا، گجرات کے گرد و نواح میں اشاعت دین کا فریضہ بڑے سلیقے سے ادا فرمایا، یہ بھی روایت ہوا ہے کہ فکر سخن بھی فرماتے تھے، ایک غزل کا مقطع ہے ؎

بارِ دیگر ہم ہمیں گوئم سراج　　قبلۂ من نیست الا روئے دوست

(تذکرہ خواجگان تو نسوی: ص ۵۲)

۲۱ جمادی الاولیٰ ۸۱۷ھ بروز جمعرات وصال فرمایا، پیران پٹن گجرات میں مزار مرجع خلائق ہے۔ (حوالہ مذکورہ)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ علم الدین رحمۃ اللہ علیہ (م:۸۲۹ھ)

اپنے والد گرامی خواجہ سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مسند ارشاد پر جلوہ گر ہوئے، حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی خلافت حاصل تھی، علوم وفنون سے آراستہ بزرگ تھے اور تمام متوسلین کو بھی اس کی نصیحت فرماتے تھے، روایت ہے کہ

''آپ بے علم اور ناخواندہ افراد کو علم طریقت سے آگاہ نہ فرماتے تھے، کیونکہ آپ کا ارشاد تھا کہ ہمارے خاندان میں اگرچہ علم باطن کو فضیلت حاصل ہے لیکن اس کے لیے ظاہری علوم کا حصول لابدی ہے۔ علوم ظاہری سے دینی علوم مراد ہیں، یہ علوم اس قدر تو ضرور آنے چاہئیں کہ قرآن پاک کی عربی آیات اور احادیث پر عبور ہو۔'' (مخزن چشت: ص۲۹۲)

اعمال پر بہت تاکید فرماتے مگر احتیاط کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے، جو شخص اپنی مرضی سے کسی وظیفے کی اجازت طلب کرتا تو آپ اس کو وہ وظیفہ کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے، نوافل کی تاکید فرماتے کہ یہ اس سلسلے کا مدت سے معمول تھا، درود پاک کثرت سے پڑھنے کی تلقین فرماتے، کہا جاتا کہ

''حضرت شیخ را کرامتے بود، ہر کہ از کافراں وفاسقاں ومنکراں یک بار در صحبت او نشستے و از وکلام شنیدے وباہم کلام گشتے از افعالِ مذموم خود متنبہ گشتہ وتوبہ نمودہ، مرید او شدے۔'' (تاریخ مشائخ چشت: ص۲۶۴)

اللہ اللہ صحبت کی برکات اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہیں۔ آپ نے ۲۶ صفر ۸۲۹ھ وصال فرمایا، اپنے والد کے قریب ہی پیران پٹن گجرات میں مدفون ہیں۔

حضرت خواجہ محمود راجن رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۰۰ھ)

خواجہ محمود راجن رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد گرامی خواجہ علم الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مسند نشین ہوئے، چشتیہ نسبت کے علاوہ شیخ خازن رحمۃ اللہ علیہ سے خرقۂ سہروردیہ بھی پایا تھا بلکہ سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ ابوالفتح رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ عزیز اللہ (خلیفہ مجاز حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ) سے بھی خلافت عطا ہوئی تھی۔ (تذکرہ خواجگان تونسوی: ۵۳)

ذہنی میلان یہ تھا کہ یک گیر محکم گیر پر عمل پیرا رہا جائے، اہل علم سے تھے اور علم کے قدر دان تھے، روایت ہے کہ

"جو شخص بھی آپ سے کسب فیض کے لیے آتا آپ پہلے اسے دینی علوم کی طرف لگاتے اور اگر اس شخص میں علم کی رغبت و محبت ہوتی تو اس پر بے شمار انعامات کرتے، کتابیں اور نقدی اپنی گرہ سے عطا فرماتے اور پھر جو شخص علوم دینیہ کے حصول کے بعد آپ کا مرید ہو جاتا اسے قلیل مدت میں بغیر کسی مجاہدہ کے درجات اعلیٰ تک پہنچا دیتے۔" (مخزن چشت: ص ۲۹۳)

اللہ اللہ! کس قدر علم دوستی کے مظاہر ان بزرگانِ سلف سے ہویدا ہوتے رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلۂ عظیم کے تمام نامور شیوخ علم کے بغیر کسی مقام و مرتبہ کے قائل نہ تھے، انہیں خوب یاد تھا کہ فرمانِ الٰہی یہی ہے کہ علم اور بے علم برابر نہیں ہو سکتے، یہ تو عام متوسلین کے حوالے سے تھا خلافت کے لیے تو علم بنیادی شرائط میں سے تھا، علم، عمل اور

اخلاص ان بزرگوں کے نزدیک خلافت کے لزومات میں سے تھے، ایسا نہ ہوتا تو انکار کر دیتے جیسا کہ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کیا ہے، روایت ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدین کو خلافت سے سرفراز فرمانے لگے تو لوگوں نے اس (یعنی اخی سراج رحمۃ اللہ علیہ) کا نام بھی پیش کیا، شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اس کام میں سب سے پہلا درجہ علم کا ہے۔'' مولانا فخر الدین زرادی رحمۃ اللہ علیہ کو رحم آ گیا اور انہوں نے چھ مہینے کے اندر اس کو عالم متبحر بنانے کا دعویٰ کیا اور ایسا کر دکھایا، تحصیل علم کے بعد جب انہیں شیخ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے ''آئینہ ہند'' کا خطاب دے کر خلافت سے سرفراز فرمایا۔ (تاریخ مشائخ چشت: ص ۲۵۴)

یہ تھا وہ معیار جو شیخ راجن رحمۃ اللہ علیہ کے ہمیشہ پیش نظر رہا۔

حضرت شیخ راجن رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ صفر ۹۰۰ھ کو انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے کہ احمد آباد میں دفن کیا گیا مگر بعد میں آپ کے مرید باصفا شیخ چمن رحمۃ اللہ علیہ نے مزار کھود کر آپ کا جسد نکال لیا اور آبائی قبرستان پیراں پتن میں دفن کیا جو آج بھی زیارت گاہ ہے۔

حضرت شیخ جمال الدین چمن رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۴۰ھ)

شیخ جمال الدین عرف شیخ چمن اپنے والد گرامی شیخ محمود راجن رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہوئے، ان کی تربیت والد گرامی نے بہت توجہ سے فرمائی تھی کہ اس سلسلہ کی تمام ذمہ داری ان پر تھی، صاحب علم بزرگ تھے، علوم ظاہری اور باطنی میں کمال حاصل تھا، ایک معرکہ میں کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے، شاعر بھی تھے ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے "شہید خنجر تسلیم عمر جاوداں وارد" سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ ۳۰ ذوالحجہ ۹۴۰ھ میں وفات پائی اور احمد آباد گجرات میں دفن ہوئے۔

(تذکرہ خواجگان تونسوی: ص ۲۳۵، مخزن چشت: ص ۲۹۷)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت شیخ حسن محمد رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۸۲ھ)

شیخ حسن محمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ جمال الدین جمن کے بھتیجے اور خلیفہ تھے، والد گرامی شیخ احمد تھے جو میاں جیو کے نام سے معروف تھے، والد گرامی سے بھی خلافت ملی تھی، قادریہ سلسلہ میں شیخ محمد غیاث نور بخش رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت حاصل تھی، ایک لائق استناد عالم تھے کئی تصانیف یادگاری چھوڑی ہیں، تفسیر بیضاوی کا حاشیہ بھی لکھا تھا جس سے علمی منزلت کا اندازہ ہوتا ہے، کرامات کی پوشیدگی کے قائل تھے، بزرگوں سے نقل کرتے کہ سلوک کے سو مراتب ہیں اور کرامت کا حصہ ان سو میں صرف ساتواں ہے اگر سالک اسی میں لگا رہے تو باقی ترانوے درجات کیسے طے کرے گا، حضرت سید گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے کہ جو شخص صوفی ہونا چاہے اسے روزانہ ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار بار سورہ اخلاص پڑھنی چاہیے، تہجد کو فرض نمازوں کے بعد افضل تر نماز قرار دیتے تھے،

حضرت شیخ حسن محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۸ ذوالقعدہ ۹۸۲ھ ہفتہ کے روز انتقال فرمایا، والد گرامی کے قریب احمد آباد گجرات میں مدفون ہیں۔

(تاریخ مشائخ چشت اور تذکرہ خواجگان تونسوی میں قدرے تفصیلی حالات ہیں)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۰۴۰ھ)

آپ شیخ حسن محمد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور خلیفہ ہیں، صاحب تصنیف وتالیف بزرگ تھے تقریباً بیالس کتابیں تحریر فرمائیں جو سب کی سب تصوف کے حوالے سے صوفیانہ افکار ونظریات کی ترجمان ہیں، ان میں آداب الطالبین، راحت المریدین، تحفۃ السلوک اور تفسیر حسینی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، فرماتے تھے:

- کھانا شروع کرو تو ہر لقمہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھو، اس سے تمہارے باطن میں نورانیت پیدا ہوگی۔
- سونے لگو تو وضو کرلیا کرو، ممکن نہ ہو تو تیمم کرلو، تمام رات عبادت میں شمار ہوگی۔
- اتباع رسالت سے ہی رب العالمین کے محبوب بن سکیں گے۔
- انسان کو چاہیے کہ وہ صرف رضائے الٰہی کا طالب ہو اور دنیا کی حرص وطمع سے اپنا دامن چھڑالے۔
- نماز ہر شخص کے پیچھے پڑھ لینا جائز ہے مگر بیعت ہر کسی سے کرلینا جائز نہیں ہے۔

یہ باکمال صوفی ۲۹ ربیع الاول ۱۰۴۰ھ کو راہی ملک عدم ہوا، مزار احمد آباد گجرات میں والد گرامی کے ساتھ ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ شیخ یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۱۰۱ھ)

خواجہ ابو یوسف محی الدین، یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت اپنے دادا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ملی، کہا گیا کہ جد امجد نے اپنے صاحبزادوں سے آپ کو ترجیح دی، یہ ترجیح اعلان کر رہی ہے کہ آپ کی سیرت اور آپ کا صوفیانہ رویہ جد محترم کو زیادہ پسند آ گیا تھا، اگرچہ اجازت شیخ کی زندگی ہی میں مل گئی تھی مگر آپ نے سلسلہ بیعت اُن کی وفات کے بعد جاری کیا کہ ادب کا خیال رہا، روایت یہی ہے کہ اشارہ پایا تھا اس لیے شیخ حج و زیارت کے لیے روانہ ہو گئے، مدینہ منورہ یوں مقیم ہوئے کہ مستقل قیام کر لیا تقریباً چودہ سال حاضر دربار رہے اور وہیں ۲۸ صفر ۱۱۰۱ھ کو وفات پائی۔ جنت البقیع میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قریب دفن ہوئے، ''زہے قسمت''

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۴۲ھ)

چشتیہ سلسلہ کے دورِ انحطاط کو دورِ عروج میں بدلنے کا سہرا خواجہ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کے سر ہے جو حاجی نور اللہ کے فرزند تھے آپ ایک باکمال معمار تھے، لال قلعہ، جامع مسجد دہلی، حاجی نور اللہ اور ان کے والد جن کا نام احمد تھا کے فن تعمیر کے شاہکار ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے، دہلی اُن دنوں علمی ثروت سے محروم نہ ہوا تھا، متعدد اصحاب علم موجود تھے جن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بزرگ بھی تھے، اُن سے کسب علم کیا، اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی سے آٹھ سال قبل پیدا ہوئے تھے جبکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اورنگ زیب کی وفات سے چار سال قبل پیدا ہوئے، تحصیل علم کے بعد کسی برتر نسبت کی طلب ہوئی تو ایک صاحب علم بزرگ "رسول نما" کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کے خواستگار ہوئے، صاحب بصیرت وعرفان بزرگ نے جواب دیا تمہارا حصہ سلوک یہاں نہیں حضرت یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہے اور وہ مدینہ منورہ میں ہیں، وہاں جاؤ اور اس دسترخوان سے خوشہ چینی کرو، بس پھر کیا تھا طالب راہ حق، مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوگیا اور مدینہ منورہ میں حضرت یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں کچھ عرصہ قیام رہا، خرقۂ خلافت پہنا اور دہلی واپس آ گئے، قیام حجاز کے دوران آپ نے امیر محترم لاہوری سے نقشبندیہ نسبت حاصل کی اور سید محمد کبردی رحمۃ اللہ علیہ سے قادریہ کی خلافت پائی۔ (تذکرہ خواجگان تونسوی: ص ۵۵)

WWW.NAFSEISLAM.COM

دہلی میں واپسی پر خانم بازار کی ایک مسجد میں قیام کیا اور تعلیمی بساط بچھائی، علمی استطاعت تو حد درجہ کی تھی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب علم چچا ابوالرضا محمد رحمۃ اللہ علیہ سے علم حاصل کر چکے تھے۔ مدینہ منورہ میں حضرت یحییٰ مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شرح وقایہ کا بھی درس لیا تھا، آپ کا درس علم و معرفت کا لٹتا دریا تھا، دور دور سے طلبہ شریک ہوتے، کھانے پینے کا سارا انتظام مفت تھا، حدیث کے درس کی شہرت پھیل چکی تھی، کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ صوفی شاعر مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ ملاقات کے لیے آئے تو آپ صحیح بخاری کا درس دے رہے تھے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۱۷/۲۹۰)

روایت ہے کہ شاہ دہلی فرخ سیر نے کئی بار بڑی عاجزی سے اصرار کیا کہ حضرت اپنی ضروریات کے لیے سرکاری خزانہ سے رقم لے لیا کریں لیکن آپ نے ہر بار پیشکش مسترد کر دی اور فرمایا مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔" اسی نے ایک بڑی حویلی دینے کا بھی ارادہ کیا مگر آپ نہ مانے، اس نے حاضری کی اجازت چاہی مگر آپ نے ٹال دیا، فرمایا بذات خود آنے کی ضرورت نہیں اس سے مجھے الجھن ہوگی، بادشاہ نے اس کے بعد یہ وطیرہ اختیار کر لیا تھا کہ بروز جمعۃ المبارک جب حضرت شیخ مسجد میں جمعہ کے تشریف لے جاتے تو وہ بھی اجازت لے کر بڑی عاجزی اور تعظیم سے آپ کی قدم بوسی کر لیتا۔" (مخزن چشت: ص ۳۲۷)

حضرت کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تصنیف بزرگ تھے، تیس کے قریب تصانیف کا نام ملتا ہے جن میں عشرہ کاملہ عربی میں (رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کے حوالے سے) سواء السبیل (تصوف وصوفیاء) کشکول (ذکر، فکر اور مراقبہ کے بارے میں)، مرقع (نماز ونوافل اور وظائف کے حوالے سے) کئی اور کتب جن میں علم منطق کا ذکر بھی ہے، یہ بھی روایت ہوا کہ شعر کہتے تھے، "قرآن القرآن" تفسیر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تفسیر جلالین کے ہم پایہ ہے فرق یہ ہے کہ وہ شافعی

WWW.NAFSEISLAM.COM

نقطہ نظر ہے اور یہ حنفی۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۳۸۲/۱۷)

ان کے علاوہ ''مکتوب کلیمی'' ہے جو ۱۳۲ مکتوبات کا مجموعہ ہے، ان کتب میں رسالہ کشکول اور مرقع شریف کی چشتیہ بزرگ اپنے مریدوں کو باقاعدہ اجازت دیتے ہیں۔

ایک دلچسپ حقیقت کہ حضرت نے اپنے تمام بیٹوں کو سلسلہ قادریہ میں بیعت کیا۔ فرماتے کہ سلسلہ چشتیہ میں بے پناہ ریاضتیں اور مجاہدے ہیں لیکن غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا دامن اس لحاظ سے بہت وسیع ہے اور تمام ناقصوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔'' (مخزن چشت: ص ۳۲۹)

آپ نے ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ کو وفات پائی، دہلی میں قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اپنی ہی خانقاہ میں دفن ہوئے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ خانقاہ مسمار ہوگئی صرف قبر باقی رہی، ''تقریباً چالیس سال بعد خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے جو تواب بہاول پور کے مرشد طریقت تھے، اس کی تعمیر نو کے لیے معتدبہ رقم دی۔ شاہ صاحب کے ورثاء میں سے ایک نے بعد میں اس کی مرمت کرائی اور اسے ازسرنو تعمیر کرایا، مقبرہ ابھی تک موجود ہے ہر سال عرس ہوتا ہے، دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور شہزادگان اس میں باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے تھے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ: ۳۸۱/۱۷)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۴۲ھ)

حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ صدیقی خاندان کے چشم و چراغ تھے، سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے، بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل وطن "غور" تھا، ہجرت کر کے یہ خاندان ہندوستان آ گیا تھا، پورب میں قیام کہا جاتا ہے اس میں علاقہ کون سا تھا اس بارے میں آراء مختلف ہیں سرسید احمد خاں کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ مضافاتِ لکھنؤ میں مکراون گاؤں مسکن تھا، نگراؤں بھی لکھا گیا اور رکاکوری بھی کہا گیا، قصبات پورہ کا ذکر بھی آیا ہے، پورب کے علاقے سے آپ تحصیل علم کے لیے دہلی آ گئے اور شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، پہلی ہی نشست میں صلاحیتوں کا اعتراف ہو گیا تھا، شاہ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دریافت کیا علوم ظاہرہ حاصل کرنا ہیں یا فوائد باطنی، بے ساختہ عرض کیا

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

(تذکرہ حضرت فخر جہاں دہلوی: ص۱۸۲_۱۸۵)

بیعت ہوئے اور منازل سلوک طے کیں، خلافت ملی اور دکن جانے کا حکم ملا، اورنگ آباد میں قیام کیا اور سلسلہ رشد و ہدایت پوری تابانیوں سے جاری ہوا، ذکر و فکر کی محافل کا اجراء

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہوا، خلق خدا جوق در جوق شریک ہونے لگی اور بہت جلد خانقاہ مرکز عوام وخواص بن گئی، لنگر کا اہتمام ہوتا، خود دوستوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے، نماز کے بعد خلوت نشین ہوتے اور ذکر میں مشغول رہتے، صاحب علم تھے مگر علمی حقائق کو بیان کرتے وقت ماخذ کا حوالہ دیتے بلکہ ارشاد فرماتے کہ مزید تشریح کے لیے فلاں کتاب پڑھ لو، طبیعت میں استغراقی کیف حد درجہ کا تھا مگر معاشرتی معاملات میں اپنے ہوں یا بے گانے سلوک ایک جیسا تھا، آپ کی تصنیف نظام القلوب جو تصوف کے قاری کے لیے عمدہ راہنما ہے، اکیس فصول پر محیط ہے یہ کتاب قیمتی اقوال اور لائق عمل احکام پر مبنی ہے، مخزن چشت میں ہے:

''آپ کی ذات بابرکات سے دنیا کو جتنا فیض پہنچا ہے اتنا فیض اس دور میں کسی اور شخصیت سے نہیں پہنچا، آپ کے کریمانہ اخلاق اور فضائل کی پوری تفصیل بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔'' (ص:۳۳۹)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ صاحبزادوں سے نوازا، سارے دین متین کے مبلغ ثابت ہوئے، ان میں ایک صاحبزادے حضرت خواجہ فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی نسبت سے نوازا، سب سے بڑے بیٹے کو خواجہ کا مگار رحمۃ اللہ علیہ کا مرید بنایا باقی حضرت فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہی بیعت ہوئے، اس طرح خلافت اور مسند نشینی کا خود فیصلہ فرما دیا، اکہتر سال کی عمر پا کر حضرت شاہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲ ذوالقعدہ ۱۱۴۲ھ کو سفر آخرت اختیار کیا اور اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔

حضرت خواجہ، مولانا محمد فخر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(م:۱۱۹۹ھ)، محبّ النبی:

حضرت نظام الدین اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے لختِ جگر اور سلسلہ چشتیہ کے نامور شیخ، مولانا محمد فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ تقریباً ۱۱۲۶ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، ولادت کی خبر جب شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کو ملی تو نومولود کے لیے اپنا لباس بھیجا، فخر الدین نام رکھا اور فرمایا: ''یہ لڑکا شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ہدایت و ارشاد کی شمع روشن کرے گا۔''

(حضور قبلہ عالم: ص ۹۱)

حیرت ہے مرشد کریم کا یہ ارشاد لوحِ تقدیر بنا اور حرف بحرف پورا ہوا۔ اورنگ آباد سے دہلی تقل مکانی کا اس وقت تو کوئی تصور نہ تھا اور پھر نونہال کی آئندہ زندگی کی کس کو خبر تھی مگر بقول مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبداللہ شود

WWW.NAFSEISLAM.COM

سن شعور کو پہنچے ہی تھے کہ درس و تدریس کی بساط بچھی، والد گرامی نے حالاتِ آمدہ کا اندازہ کر لیا تھا اس لیے تدریسی لمحات میں کوئی تعطل نہ آنے دیا، علوم ظاہری بھی عطا کیے اور شرفِ نسبت سے بھی نوازا، سولہ سال کے تھے کہ والد گرامی نے وصال فرمایا، عجب قسمت تھی کہ چاروں سلاسل تصوف سے خرقۂ خلافت پہنا اس طرح دینی علوم کے ساتھ تقدیس کا ہر چشمہ آپ کے لیے وا ہو گیا، صاحب استقامت تھے اس لیے کثرتِ فیضان کو

اپنے وجود میں یوں سمویا کہ چہار جوانب منور ہو گئے، اب وقت آ گیا تھا کہ شاہجہان آباد کو شرف حاصل ہو، اس ہجرت کا اعلان تو پیدائش پر ہی ہو گیا تھا اس لیے ۱۱۶۵ھ میں رخت سفر باندھا اور دہلی آ گئے اس طرح سلسلۂ چشتیہ اورنگ آباد کو سیراب کر کے واپس مرکز چشت میں تشنگانِ علم و معرفت کو سیراب کرنے لگا، دہلی میں اجمیری دروازہ سے باہر نواب غازی الدین کے چھوٹے سے مدرسہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، یہ سلسلہ اس قدر مقبول ہوا کہ وہاں کے علمی حلقوں میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔

(مخزن چشت: ص ۳۴۸، و تذکرہ حضرت فخر جہاں: ص ۱۹۳ تا ۱۹۸ حضور قبلہ عالم: ص ۹۱)

دہلی مرکز بنا تو دور دراز علاقوں سے تشنگانِ علم حاضر ہونے لگے، آپ نے درسی کتب کا خوب مطالعہ کیا ہوا تھا اور روحانی فیضان کی برکات سے بھی بہرہ ور تھے، اپنے والد گرامی سے شرح وقایہ، مشارق الانوار کے ساتھ نخبات الاثر اور طب کی بھی بعض کتب پڑھی تھیں حتیٰ کہ تیر اندازی پر بھی ایک کتاب پڑھی، شاید اسی علم کا نتیجہ تھا کہ تین سال تک لشکر میں بھی رہے کہ سپاہیانہ مشق اور شمشیر زنی کی تربیت دیں۔

(مخزن چشت: ص ۳۴۳)

علم دین کے حصول میں آپ سا انہماک کم دیکھنے میں آتا ہے، بات یہاں تک بڑھی کہ ایک باعمل صوفی ہونے کے باوجود بہت سے اذکار و وظائف ترک کر دیئے اور صرف فرض، سنت، نفل اوابین اور حفظ الایمان پڑھا کرتے تھے باقی سارا وقت تحصیل علم میں صرف ہوتا۔ (مخزن چشت: ص ۳۴۲)

تذکرہ نگاروں کو اعتراف ہے کہ

''آپ نہایت صادق القول بزرگ تھے، اظہار شخصیت و بزرگی سے آپ کو سخت نفرت تھی، جب کسی دعوت یا جلسہ میں تشریف لے جاتے تو لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ دیتے، فرماتے تھے کہ اس سے نمائش ہوتی ہے، کوئی آپ کی تعریف کرتا تو ناپسند فرماتے، کوئی مرید اگر ہاتھ باندھ کر یا گردن جھکا

WWW.NAFSEISLAM.COM

کر ادب کا اظہار کرتا، ناخوش ہوتے، کوئی شخص پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو روک دیتے بلکہ ناراض ہوتے۔" (حضور قبلہ عالم: ص ۹۲)

حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی علم و عمل کا ایک ایسا حسین سنگم تھی کہ باکمال صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہونے کے باوجود مولانا کا سابقہ ہی آپ کی پہچان بنا، نہ صرف یہ کہ طلب علم میں ہمہ وقت مستغرق رہے بلکہ عمل کے میدان میں بھی تمام ہم عصر بزرگوں سے بہت سبقت رکھنے والے قرار پائے۔ متبعین اور مریدین کو ہمیشہ اتباعِ شریعت کی تاکید کرتے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مریدوں کو فرمایا:

"حدیث شریف میں جو ورد آیا ہے اسی کو پڑھیں، دوسری چیزوں کی طرف رجوع نہ کریں، مذہب حنفی پر مضبوطی سے قائم رہیں، حدیث کی طرف کثرت سے رجوع کریں۔" (حضور قبلہ عالم: ص ۹۳)

بادشاہ وقت، کبیر اُمرا، معتقد اور دیگر عقیدت مند آپ کو جاگیر دینا چاہتے مگر آپ قبول نہ کرتے بلکہ اس پر آپ فرماتے "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اس شہر میں نہ رہیں، آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔" (تذکرہ حضرت فخر جہاں: ۲۰۲)

صبر و قوت برداشت کا یہ عالم تھا کہ مصائب پر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ آتا حتیٰ کہ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک افغانی خانقاہ میں داخل ہوا اور آپ پر حملہ آور ہو گیا، خدام نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے، فرمایا چھوڑ دو، اپنا سر زمین پر رکھ کر فرمایا "ما حاضریم ہر چہ بخاطر شماست بکنید" یعنی ہم حاضر ہیں جو کچھ تمہارے جی میں آئے کرو، وہ شرمندہ ہوا اور چلا گیا، تھوڑی دیر بعد دو آدمیوں کو ساتھ لیے پھر آیا، آپ کھڑے ہو گئے اور فرمایا "صاحب بخیر و عافیت" اخلاق کریمانہ کا اثر یہ ہوا کہ اس نے معافی مانگ لی۔

(حضور قبلہ عالم: ص ۲۳)

وحدۃ الوجود کا مسئلہ صوفیاء کے گروہوں میں ہمیشہ سے ہی ایک سلگتا ہوا مبحث رہا ہے، آپ کے دورِ حیات میں بھی یہ مسئلہ باہمی نزاع کا سبب بن رہا تھا، اگرچہ آپ

وحدۃ الوجود پر یقین رکھتے تھے مگر اس علمی و وارداتی مسئلہ کو عوام میں تفریق کا ذریعہ بنانے سے ہمیشہ گریزاں رہے، روایت ہے کہ

''اظہار درویشی و گفتگوئے از مسئلہ وحدت وجود سخت و ناخوش طبیعت ما و ارشاد مبارک آنکہ ایں امر حالی است نہ قالی، من عرف ربہ فقد کل لسانہ''

''یعنی درویشی کے اظہار اور اس مسئلہ وحدت وجود پر گفتگو کو سخت ناپسند کرتے تھے، فرماتے تھے یہ کیفیت حالی ہے نہ کہ قالی، جس نے اپنے رب کو پہچانا تو اس کی زبان گنگ ہوگئی۔'' (تذکرہ فخر جہاں دہلوی: ص ۲۰۴)

ایک مسئلہ جو آپ کی توجہ کا مرکز بنا وہ اتصالِ سلسلہ کا تھا، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے آپ کے مراسم بہت دوستانہ تھے حتیٰ کہ جب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ مسند پر بیٹھے تو حضرت شاہ فخر جہاں رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کے سر پر دستار باندھی تھی، جب پگڑی باندھ چکے تو مولانا آزاد کے والد (مولانا خیر الدین) نے آپ کے کان میں کہا، تمہارے والد بزرگوار کے دامن پر ایک دھبہ لگ چکا ہے، اسے صاف کر دو، اس دھبے سے مقصود شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مجتہدانہ مسلک اور تقلید مذاہب سے انکار تھا، مولانا آزاد کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے جو درخواست کی گئی وہ آپ نے پوری کر دی۔ (تذکرہ حضرت فخر جہاں دہلوی: ص ۲۰۷۔۲۰۸)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''انتباہ'' میں لکھا کہ چشتیہ سلسلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متصل نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کم سن تھے، اس تحریر پر شور ہوا، موافق و مخالف آوازیں اٹھنے لگیں، حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس دعویٰ کے جواب میں ایک مختصر مگر جامع رسالہ ''فخر الحسن'' کے نام سے تحریر فرمایا اور پوری قوت سے اس انکار کا رد کیا۔ فخر الحسن کا حرف حرف شاہد ہے کہ ایک علمی، تحقیقی اور تاریخی مسئلہ پر آپ کی گرفت کس قدر ہے، رسالہ کا ہر صفحہ محدثانہ طرز بیان کا غماز ہے، فیصل آباد سے یہ رسالہ متن اور ترجمہ کے ساتھ

WWW.NAFSEISLAM.COM

شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ بھی آپ کی اور نگارشات کا ذکر بھی ملتا ہے مثلاً نظام العقائد اور رسالہ مرجیہ۔

اس مسلسل علمی و تبلیغی کاوشوں نے صحت پر اثر ڈالا، وجع المفاصل تو مدت سے بے چین کر رہا تھا خود فرمایا: ''مجھے مدت سے نقرس کا درد رہتا ہے۔'' یہ مرض آخر شدید ہو گیا اور حضرت فخر جہاں رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء کو بہتر سال کی عمر میں دار خلد کے راہی بنے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب، مسجد کی دیوار کے ساتھ ابدی نیند سو گئے، آپ کے ایک ہی فرزند تھے غلام قطب الدین نام تھا۔ وہی مسند نشین ہوئے مگر سلسلہ عالیہ کی شہرت اور وسعت کا ذریعہ آپ کے مرید خاص حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ بنے کہ اُن کا فیضان پنجاب میں ہر کہیں آشکار ہے۔

حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۲۰۵ھ)

خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ ضلع بہاول نگر کے ایک گاؤں چوتالہ کے رہنے والے ہیں، آپ کا خاندان یہاں سے ہجرت کر کے قریب ہی تقریباً چار کوس کے فاصلے پر مہار آ گیا تھا، خاندان کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا، کھرل قوم سے تعلق تھا ۱۴ رمضان المبارک ۱۱۴۲ھ (۱۷۳۰ء) کو چوتالہ میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام ہندال تھا اور والدہ محترمہ کا نام عاقل بی بی تھا۔ خاندانی پس منظر کے مطابق نام ہبل یا ہابل رکھا گیا مگر مشہور اپنے لقب 'نور محمد' سے ہوئے، یہ لقب کب حاصل ہوا؟ آراء کا اختلاف ہے مگر صاحب مخزن چشت کے نزدیک یہ لقب آپ کے مرشد گرامی یعنی مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمایا تھا۔ (ص: ۴۵۹)۔ بلندیٔ درجات کے افق پر پہنچے تو ہر خاص و عام قبلہ عالم پکارنے لگا۔ سن شعور کو پہنچے تھے کہ پانچ سال کی عمر میں والد گرامی نے میاں مسعود جیو کے مدرسہ میں حفظ قرآن کے لیے داخل کر دیا، قرآن مجید کے حفظ کے بعد دینی علوم کے حصول میں مختلف مدارس میں قیام رہا۔ دین کی ابتدائی تعلیم کے بعد خاندان والے اپنی روش کے مطابق کھیتی باڑی میں شامل کرنا چاہتے تھے، کچھ عرصہ ساتھ بھی دیا مگر آپ کی طبیعت اس طرف زیادہ مائل نہ ہوئی، مقامی علماء کے ہاں اور قریب تر بستیوں کے علماء کے ہاں تدریس علم کے لیے حاضر ہوتے رہے، بڈھیران، بیلانہ اور پھر ڈیرہ غازیخان گئے اور بالآخر لاہور آ گئے، کہا

WWW.NAFSEISLAM.COM

جاتا ہے کہ ایک ساتھی میاں محکم دین کی معیت میں لاہور آئے تھے، لاہور میں حصول علم کا موقعہ تو ملا مگر معاشی کفالت کا کوئی ذریعہ نہ تھا، یہ بھی روایت ہوا ہے کہ دونوں بھیک مانگ کر پیٹ پالا کرتے، ان مشکلات نے لاہور سے ہجرت کی ترغیب دی تو آپ دہلی آ گئے، وہاں مولانا برخوردار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا، کافیہ سے قطبی تک پڑھا تھا کہ استاد گرامی دہلی سے نقل مکانی کر گئے، اسی کش مکش میں تھے کہ اب کیا کیا جائے کہ اچانک خبر ملی کہ مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ دکن سے دہلی آ گئے ہیں اور مسند تدریس پر جلوہ افروز ہیں، کہا گیا ہے کہ آپ کی دہلی آمد کے تقریباً چھ ماہ مولانا فخر رحمۃ اللہ علیہ دہلی آئے تھے، حاضر ہوئے اور پھر بس وہاں کا ہو کر رہ گئے، حاضر خدمت تھے کہ ایک روز پوچھا کہ آباؤ اجداد کا پیشہ کیا تھا عرض کیا

''زراعت می کردند و مویشی می چرانیدند''

''یعنی زراعت کرتے اور مویشی پالتے ہیں''

حضرت مولانا فخر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس روشن جبین میں مستقبل کا ولی دیکھ رہے تھے، فرمایا علم تو وہیں حاصل کرو مگر تکرار میرے ہاں آ کر کر لیا کرو، طویل فاصلے کے باوجود آپ تقریباً تین ماہ استاد اور شیخ کے درمیان محو سفر رہے، آخر عرض کر دیا کہ حلقہ بگوش عقیدت فرما لیجیے، فرمایا درود شریف پڑھ کر استخارہ کر لو، چنانچہ استخارہ کیا، روحانی منظر صبح حاضر ہو کر عرض کر دیا، فرمایا کلمہ طیبہ اور استغفار پڑھو، پھر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف کے قریب بیٹھ کر بیعت فرما لیا، ۱۱۶۵ھ میں دکن سے دہلی تشریف لانے کے تقریباً چھ ماہ یہ بیعت ہوئی، سلسلۂ ارادت بڑا پُر جوش تھا کہ طالب بھی سب علائق دنیا چھوڑ کر آیا تھا اور محبوب بھی عطا پر عطا کرنے پر مائل تھا، ایک روز فرمایا ''نور محمد خلق را با تو کار خواہد بود'' (نور محمد، مخلوق کو آپ سے کام پڑے گا) یہ سن کر بہت متعجب ہوئے اور عرض کیا کہ ''میں ایک کمترین پنجابی ہوں، کس طرح اس اعلیٰ مرتبہ کے لائق سمجھا گیا ہوں'' حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ خاموش رہے اور چند دنوں کے بعد وہ تمام روحانی نعمتیں جو

WWW.NAFSEISLAM.COM

انہیں اپنے آباؤ اجداد اور مشائخ چشت سے ملی تھیں، آپ کے سپرد کیں اور خلافت دے کر مہار شریف میں مستقل قیام کا حکم دے دیا۔ (حضور قبلہ عالم: ص ۱۴۲)

خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ حسب ارشاد مہار شریف کے لیے روانہ ہوئے، پاکپتن کی زیارت سے فیض یاب ہو کر تقریباً ۱۵ سال بعد واپس تشریف لے آئے اور مہار شریف میں مرکز یمن وسعادت کی بنیاد رکھی، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ آپ کی مہار شریف واپسی کے بعد کبھی کبھی یاد کرتے تو آپ کی زبان مبارک پر یہ شعر ہوتا

تن مٹکے من چھیر ما سُرت ملوؤں ہار
مکھن لے گیا پنجابی، چھاچھ پیو سنسار

(تذکرہ خواجگان تونسوی: ص ۶۳)

یہ انتہائی محبت کا اظہار تھا کہ مرشد کریم کو اپنی تربیت پر بھی یقین تھا اور تربیت پانے والے وجود پر بھی اعتماد تھا، خلافت عطا فرما کر اصلاحِ خلق کے مشن پر روانہ کر دیا، مہار شریف کو اپنے برگزیدہ سپوت کی خدمات درکار تھیں اس لیے وہیں مسند ارشاد کو مستقل حوالہ بنا دیا، روانہ کرتے وقت شیخ کامل نے چند ارشادات سے نوازا، فرمایا کہ مہار ہی کو مستقل اقامت گاہ بنانا اور ترویج دین کے فریضہ کو باحسن الوجوہ انجام دینا، نصیحت فرمائی کہ:

- میری وفات کی خبر ملے تو دہلی نہ آنا۔
- اس ملک یعنی مہار میں ہندوستانی لباس نہ پہننا۔
- کوئی شخص تکلیف پہنچائے تو درگزر کرنا اور اس کے ساتھ بھلائی کرنا۔
- اُس علاقہ کے علماءِ سادات اور حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد رجوع کریں گے ان کی تعظیم وتکریم کرنا
- ایک امیر تمہارے دامن سے وابستہ ہوگا اس کی اور اس کے ملک کی نگہداشت کرنا۔

وصیت کے اجزاء خمسہ مرشد کریم کی دور بینی اور مومنانہ فراست کے گواہ ہیں،

WWW.NAFSEISLAM.COM

کوئی حادثہ یا واقعہ تبلیغ مسلسل میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے، جہاں رہنا ہے وہاں کا لباس ہی مناسب ہے تاکہ غیریت کی دیوار حائل نہ ہو، مشن مشکل ہے اس لیے خیر خواہی لازم ہے اور درگزر ضروری ہے، علماء خصوصاً علماء سادات اور مصدر فیض حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کا احترام، تسلسل فیض کا ذریعہ ہوگا اور ایک پیش گوئی کہ ایک امیر بھی وابستۂ دامن ہو گا۔ امام بخش مہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے واضح کیا کہ امیر سے نواب بہاول خان مراد ہے۔

(حضور قبلہ عالم: ص ۱۴۳)

حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کے احکام پر کس قدر عمل کیا وہ آپ کی زندگی کے شب و روز سے عیاں ہے، معمولاتِ زندگی کی ایک مختصر سی جھلک دیکھئے:

''آپ شریعت کے سختی کے ساتھ پابند تھے، سفر و حضر میں نماز باجماعت ادا فرماتے، تعدیل ارکان اور آداب نماز میں بہت غلو فرماتے حتیٰ کہ آپ سے مستحب بھی ترک نہ ہوتا، وضو میں زیادہ پانی صرف نہ فرماتے، عام طور پر کسی دوسرے شخص سے وضو نہ کرواتے، ہر وضو کے ساتھ مسواک کرتے، نماز تہجد کی بہت تاکید فرماتے۔''

معاشرتی زندگی کے مظاہر کیسے تھے سنئے:

''آپ کھانا بہت کم کھاتے تھے، طعام میں ہرگز تکلف نہ کرتے جو کچھ بھی میسر آتا کھا لیتے، لباس درویشانہ اور سادہ تھا..... ہمیشہ دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے..... تمام لوگوں کی عرض سنتے، ہر سائل کو جواب دیتے ہر ایک کی دلجوئی فرماتے، بیکسوں پر شفقت فرماتے، اقرباء سے حسن سلوک کرتے، علماء کی بہت عزت کرتے، آپ کے لنگر سے ہر غریب و مسکین کو کھانا ملتا تھا آپ کا فیض ہر امیر و فقیر کے لیے یکساں تھا۔''

علم دوستی جو صوفیاء کی شناخت رہی اس کا حال یہ تھا کہ

''مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا، لوائح، نفحات الانس، فقرات، شرح لمعات،

WWW.NAFSEISLAM.COM

عشرۃ کاملہ اور فصوص الحکم اکثر مطالعہ میں رہتیں۔" (تذکرہ خواجگان تونسوی: ص ۶۴)

یہی وہ لگن تھی جو آپ کو حضرت خواجہ فخر رحمۃ اللہ علیہ کے باقی مریدوں سے ممتاز کرتی ہے کہ اپنے پیر و مرشد کی روش کے مطابق آپ نے پوری زندگی کو اتباع رسالت کے نور سے منور کر لیا تھا اور 'نور محمد' ہونے کی سند بنا لیا تھا۔ فرمایا کرتے تھے:

"چیزے کہ مروی از جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ باشد بغیر ضرورت چگونہ بکار بردہ شود۔" یہ بھی فرمایا:

"قالب را موافق شریعت کردن، وانضمام قلب با اتباع شریعت است دعوام را پرسش ازیں خواہد بود۔" (حضور قبلہ عالم: ص ۱۶۰)

دین کا نور مہار شریف میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محنت، لگن اور ریاضت سے خوب پھیلا، یہ کس قدر سعادت مندی کا عروج تھا کہ مرید کی کارگزاری شیخ کو اس قدر بھا گئی کہ جب سنا کہ مہار شریف میں خوب روشنی پھیلی ہے تو فرمایا:

"میاں نور محمد مردے خوب است ونسبت شائستہ بہم رسانیدہ۔"

(حضور قبلہ عالم: ص ۱۵۸)

یہ بھی فرمایا کہ

"اگر یہ پنجابی میرے پاس نہ آتا تو میں اس دنیا سے اپنے ارمان اپنے دل میں ہی لے کر چلا جاتا۔" (حوالہ سابقہ: ص ۱۷۳)

خواجہ نور محمد رحمۃ اللہ علیہ میں دردِ عشق بھی تھا اور سوزِ یقین بھی، اطاعت شعاری کا ذوق ایک عجیب وارفتگی کا غماز تھا، معمولات پر بے حد کاربند رہنا ہر کسی کی بساط میں نہیں ہوتا مگر یہاں تو اشارہ ہی کافی ہوتا، پھر حالات کیسے بھی ہوں عزم جوان رہتا، روایت ہے کہ حضرت خواجہ فخر رحمۃ اللہ علیہ نے مہار شریف روانہ کرتے وقت ایک پیمان لیا تھا کہ مستقل قیام مہار شریف میں رکھنا مگر ہر جمعہ پاکپتن شریف ادا کرنا، کہتے ہیں ساٹھ میل سے زائد کا سفر ہے مگر آپ کی زندگی کا بیشتر معمول رہا کہ جمعہ پاکپتن شریف ہی میں ادا کیا، منگل

کے روز مہار شریف سے پیدل روانہ ہوتے جمعرات کی شام پاکپتن شریف پہنچتے، جمعہ ادا فرماتے اور مہار شریف کے لیے واپس روانہ ہو جاتے، اتوار کو وہاں پہنچتے، صرف سوموار مہار شریف میں گزارتے اور منگل کو پھر روانہ ہو جاتے، یہ انتہائی محنت طلب وظیفہ تقریباً پندرہ سال جاری رہا، اللہ اکبر ایسی استقامت ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔

حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ جو احباب و متوسلین میں 'قبلہ عالم' کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، مہار شریف میں تبلیغ دین میں بے حد انہماک اور جانسوزی کے باوجود اپنے مرشد کریم کے فیضان کے خواستگار رہے اور جب شیخ محترم رحمۃ اللہ علیہ کا دہلی میں انتقال ہو گیا تو آپ کے دل پر ایک ایسی ضرب پڑی کہ نڈھال ہو گئے اور پھر یہ کہ دہلی حاضری کی اجازت بھی نہ تھی اس لیے سوزِ فراق نے قلب و جگر کو بریاں کر دیا، مضمحل رہنے لگے بلکہ کبھی تو یہ خواہش بھی کرنے لگے کہ آبادی دنیا کو چھوڑ کر کسی تنہائی میں معتکف ہو جاؤں مگر آداب شریعت نے شدت جذبات کو توازن کا قرینہ عطا کیا، آخر وہ لمحۂ فیصل آ گیا جس کا فیصلہ ہر کسی کے لیے ایک سا ہے، تین ذوالحجہ ۱۲۰۵ھ (۳ اگست ۱۷۹۱ء) کو آپ کا وصال ہوا کہ آپ موت کو مفارقت نہیں وصال کہا کرتے تھے، بعض اشارات موجود تھے جو آپ کے مرقد کی نشاندہی کر رہے تھے اس لیے آپ کو مہار شریف سے تین کوس دور حضرت تاج سرور رحمۃ اللہ علیہ کی بستی میں دفن کیا گیا جہاں یہ زیارت گاہ خاص و عام سب کے لیے مرکز محبت ہے۔

حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں، بڑے صاحبزادے نور الصمد رحمۃ اللہ علیہ جانشین بنے مگر تین ماہ سے بھی کم عرصہ گزرا تھا کہ قوم مہاراں کے ہاتھوں شہید ہو گئے اس لیے دوسرے صاحبزادے خواجہ نور احمد رحمۃ اللہ علیہ مسند نشین ہوئے جو تقریباً پچاس سال مسند ارشاد پر جلوہ افروز رہے، تیسرے صاحبزادے خواجہ نور حسین رحمۃ اللہ علیہ کم عمر تھے اس لیے آپ قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی تربیت پاتے رہے اور انہیں سے خلافت پائی۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے فیض اس قدر ہمہ گیر اور وسیع تھا کہ بڑے بڑے اصحاب حلقہ ارادت میں آئے۔ مناقب المحبوبین میں چھیالیس خلفاء کے نام موجود ہیں، ان میں:

- حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ جو تونسہ شریف کے مسند ارشاد کے بانی قرار پائے۔
- حضرت مولانا نور محمد ناروالہ رحمۃ اللہ علیہ، آپ کا وصال شیخ کریم رحمۃ اللہ علیہ کے حیات ظاہرہ ہی میں ہو گیا تھا۔
- حضرت خواجہ محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ کی شہرت کا معیار قرار پائے۔
- حضرت خواجہ حافظ محمد جمال ملتانی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ مہاروی کے ملتان میں رکن اعظم ہیں۔

اور بہت سے دیگر اکابر۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۲۲۹ھ)

قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے بلند تر خلفاء میں سے ہیں، خاندانِ قریش میں سے تھے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے، ان کے جد اعلیٰ مالک بن یحییٰ ترک وطن کر کے سندھ آ گئے تھے، یہ ہجرت اس دور کا تقاضا بھی تھا اور اشاعت اسلام کے لیے ایک دینی ضرورت بھی، ان کی اولاد میں ایک بزرگ کا نام شیخ حسین تھا جو سلسلہ سہروردیہ میں بیعت تھے اور ٹھٹھہ میں ملازم تھے ان کی اولاد میں سے مخدوم محمد شریف مٹھن کوٹ آبسے تھے، قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ انہی کے صاحبزادے تھے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ:۱۵/۳۳۵)

قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بھائی نور محمد جو کوریجہ کے لاحقے سے مشہور ہوئے، حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور خلفاء عظام میں سے تھے، قاضی عاقل رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ باکمال صوفی تھے لائق استفادہ عالم بھی تھے، روایت ہے کہ آپ جب اپنے شیخ محترم کے ساتھ دہلی میں حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حاضر ہوئے تھے تو آپ نے علم دین کی رغبت کا مشاہدہ کرتے ہوئے چار کتابیں تحفہ کے طور پر عطا فرمائیں:

1- مکتوبات حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ
2- مطول۔ معروف درسی کتاب

WWW.NAFSEISLAM.COM

3- سواء السبیل اور

4- ایک مجموعہ کتب جس میں لوائح جامی اور اس کی شرح، ایک قصیدہ اور شرح رباعیات مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ تھیں۔

واپس کرتے وقت حضرت خواجہ نور محمد مہاروی رحمۃ اللہ علیہ کو ارشاد فرمایا:

''میاں صاحب، قاضی صاحب پر پہلے جو آپ شفقت کرتے تھے اپنی جانب سے کرتے تھے، اب ہماری جانب سے بھی ان پر کرم فرمائیں۔''

(حضور قبلہ عالم: ص ۲۹۸، ۳۰۰)

یہی علمی ذوق کوٹ مٹھن میں ایک بلند پایہ دار العلوم کا محرک بنا، علماء کی ایک کہکشاں افق دار العلوم پر روشن تھی جس میں روشن تر ستارہ خود قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ تھے، کہا جاتا ہے کہ اس دار العلوم میں درج ذیل امہات الکتب پڑھائی جاتی تھیں:

مشکوٰۃ شریف، احیاء العلوم، صحیح بخاری، شرح وقایہ، ہدایہ، شرح عقائد، سواء السبیل تسنیم، فصوص الحکم، شرح مواقف، خیالی، مطول وغیرہ۔

(تذکرہ خواجگان تونسوی ص ۸۳)

شریعت مطہرہ کا یہ عالم بے بدل جس قدر وابستہ علم وحکمت تھا اُس سے بڑھ کر وارفتہ اتباعِ شریعت تھا، قاضی رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان آج بھی جنوبی پنجاب ہی میں نہیں پورے ملک میں پوری آب وتاب سے جاری ہے، خلیق نظامی جیسے صاحب قلم کو اعتراف ہے کہ:

''آپ کے علمی تبحر، پابندی شرع، بزرگانہ شفقت، اخلاق ومروت کا دور دور شہرہ تھا، لوگ بڑی عقیدت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے نہایت ہی دور افتادہ اور غیر معروف علاقوں میں مذہبی اور روحانی تعلیم کا چرچا ہو گیا اور ان کے خرمن کمال کے خوشہ چیں دور دور تک پھیل گئے''۔ (تذکرہ خواجگان تونسوی ص ۸۳)

قاضی رحمۃ اللہ علیہ ذکر بالجہر میں بہت معروف ہوئے کہا جاتا ہے کہ تین تین کوس تک

ذکر کی آواز گونجتی تھی، یہ آواز گونجتی رہی حتیٰ کہ وقت رخصت آ گیا، تقریباً چار ماہ بیمار رہے، آپ کا وصال ۸ رجب ۱۲۲۹ھ (۲۶ جون ۱۸۱۴ء) کو ہوا اور کوٹ مٹھن میں ابدی استراحت اختیار کر لی۔

قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ کا قیضان کئی نامور خلفاء کی صورت میں ہویدا ہوا، ان میں ایک آپ کے صاحبزادے خواجہ خدا بخش بھی تھے۔

حضرت خواجہ غلام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۸۸ھ)

خواجہ غلام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی کی جب مسند سنبھالی تو اپنے چھوٹے بھائی خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت بھی انہی کا فریضہ بنی کیونکہ والد گرامی کے انتقال کے وقت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ صرف آٹھ سال کے تھے آپ نے برادرِ گرامی کی سرپرستی میں ''دینی اور روحانی تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے، حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر علوم میں دسترس حاصل کی اور اس کے بعد ان کے ہمراہ درس وتدریس میں مصروف ہو گئے'' خواجہ غلام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۸۸ھ میں چون سال کی عمر میں وفات پائی۔

(اُردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵ ص ۳۳۵)

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۱۹ھ)

پنجاب کی سرزمین جن باصلاحیت بزرگوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی ان میں ایک درخشندہ بزرگ حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ ہیں، برصغیر کی تہذیبی تاریخ، پنجاب کی تمدنی روایت اور علاقہ روہی کا ثقافتی پس منظر خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کے بغیر تشنہ رہے گا کہ صوفیاء کی اس سرزمین کی شناخت ایسے ہی بزرگوں سے قائم ہے۔ صوفی ثقافت کے خدوخال ہویدا کرنے میں اور ایک حسین روایت کو تسلسل عطا کرنے میں خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اہم کردار انجام دیا ہے، بنظر امعان دیکھا جائے تو مقامی یودوباش کو ملک گیر بلکہ آفاق آشنا مظہر بنانے میں ان بزرگوں کی محنت کا بڑا دخل ہے، پنجابی کلچر کا عمومی مزاج ہمہ اوست کے نظریۂ یقین سے عبارت ہے، حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ وحدت الوجود عالم اسلام کا ایک نمایاں رجحان رہا ہے مگر برصغیر میں اس کو اس قدر پذیرائی ملی ہے کہ یہ مقامی صوفیاء کا عمومی میلان بنا، شعر ہو یا نثر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا تتبع ہی نظر آتا ہے، خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو اس نظریہ وجود کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، اس سے ایک سرمستی اور جذابیت نے جنم لیا ہے کہ لفظ لفظ نہیں رہے زندہ تمثال بن گئے، آپ ہی سے یہ الستی مستی پوری فضا پر محیط ہوئی ہے، ارادتوں کا مرکز اور عقیدتوں کا منبع یہ وجود ہر صاحب فکر کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے کہ رفعتوں کا تصور بھی رفعت آشنا کرتا ہے۔

خواجہ بلند اقبال ذوالحجہ کے آخری سہ شنبہ ۱۲۶۱ھ میں چاچڑاں میں پیدا ہوئے تاریخی نام، خورشید عالم تھا مگر حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی عقیدت نے غلام فرید بنا دیا فاروقی نسل نے خاندان میں حمیت دین کو اس طرح پرورش کیا تھا کہ صدیوں سے یہ گھرانہ تبلیغ دین کا مرکز رہا تھا، والد گرامی خواجہ خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ کوٹ مٹھن میں رہائش پذیر تھے مگر جب سکھوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو ترک مولد پر مجبور ہو گئے، بالآخر یہ سعادتِ سکونت چاچڑاں کو حاصل ہوگئی کہ یہ علاقہ ریاست بہاول پور کا حصہ تھا جہاں مسلمان حکمرانی تحفظ کی ضمانت تھی اور پھر یہ کہ نواب صادق محمد خان آپ کے حلقہ ارادت میں تھا اس لیے اک گونہ سکون حاصل رہا۔ ۱۲۶۹ھ میں والد گرامی کا انتقال ہوا تو خواجہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ صرف آٹھ سال کے تھے، اگرچہ اس عمر میں قرآن مجید حفظ کر چکے تھے مگر تربیت کا ایک لمبا سفر باقی تھا۔ اس جانکاہ صدمے میں آپ کے برادر گرامی خواجہ غلام فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ نے پوری شفقت کی نیابت کی، نہایت محبت، پیار اور پرخلوص محنت سے تعلیمی مشاغل میں راہنمائی فرمائی، تیرہ سال کی عمر ہی میں برادر گرامی کے ہاتھ پر بیعت کی اور روحانی تربیت کے مراحل طے کیے حیرت ہے کہ کوئی محرومی اور کوئی نارسائی راہ نہ کاٹ سکی بلکہ حصولِ علم کا سلسلہ بلا انقطاع جاری رہا، اساتذہ بلند مقام تھے تو طالب علم بھی فرضیت علم کے جذبے سے سرشار تھا، حدیث، تفسیر، فقہ کے علاوہ تمام مروجہ علوم وفنون میں مکمل دسترس حاصل کی، نواب صادق محمد خان کو اسی ہونہار پیرزادے سے محبت بھی تھی اور مستقبل کی ذمہ داریوں کا احساس بھی تھا اس لیے پرورش کے تمام لمحات شاہی محل صادق گڑھ میں بسر ہوئے، یہ محل آپ کا ہی گھر رہا، محل کی آسائشیں سچے طالب علم کو آسودگیوں کا اسیر نہ بن سکیں بلکہ ان سہولتوں سے حصولِ علم کو اور مہمیز لگی، صرف سولہ سال کے تھے کہ علوم مروجہ کی تحصیل سے فارغ ہو گئے، علوم ظاہر یہ تو دراصل وہ زادِ سفر ہوتا ہے جو منزل روحانیت کو پالینے کا وسیلہ بنتا ہے۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوا، علم شریعت کا حصار باندھ کر یہ طالب صادق رہ سلوک پہ چل نکلا۔ برادر گرامی کی راہنمائی

WWW.NAFSEISLAM.COM

حاصل تھی اور تلاشِ علم کی جستجو بھی جوان تھی اس لیے رہ گذر کی دشواریاں سدراہ نہ بنیں، ۱۲۸۸ھ میں سرپرست وراہنما، مرشد وہادی برادرِ گرامی کا انتقال ہو گیا تو خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ مسند خلافت کے حقدار ٹھہرے، پھر تیس سال سے زائد عرصہ اس مسند کی زینت بنے رہے، ہزار جذب وشوق کے باوجود شخصیت کا وقار کبھی مجروح نہ ہوا، ریاضت، زہد، تقویٰ کا اک جہاں آباد ہوا، متوسلین کی کثرت تھی مگر ہمہ اوست کی فضاؤں میں پرواز کرنے والا مردِ حق تربیت کے فریضہ سے کبھی غافل نہ ہوا، حج پر جانے کا ارادہ ہوا تو اکیلے سفر مناسب نہ سمجھا اپنے خرچ پر ایک سو ساتھیوں کے ساتھ عازمِ حرمین ہوئے، اس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ یہ دانائے راز لوگ کس قدر فیض رساں ہوتے ہیں، کتنے دل ارمانِ زیارت کے لیے مچلتے ہوں گے مگر زادِ سفر نے زنجیر ڈال رکھی ہوگی، جب یہ قافلہ مرکز ہدایت اور منبع فیض کی جانب رواں دواں ہوا ہوگا تو کتنے دلوں سے بے ساختہ دعائیں نکلی ہوں گی یقیناً ''اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید'' کا سماں ہوگا۔

حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کا ادبی حوالہ آپ کی کافیاں ہیں جو مقامی اثر کے باوجود آفاقی صداقتوں سے مہک رہی ہیں، وحدت الوجود کا نظریہ اور ہمہ اوست کا یقین آپ کے ہاں وہ قوت ہے جو ساری کائنات کی روح ہے، اسی نظریے کی وضاحت اور اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے آپ نے ''فوائد فریدیہ'' لکھی جو آپ کی تعلیمات کی شاہد عادل ہے اس میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ ایک ہستی مطلق اور وجود محض کا نام ہے جس کا انحصار اور تشکل کچھ بھی نہیں اور وہ ہستی مطلق جملہ موجودات میں ساری ہے، پس جمیع موجودات بحیثیت وجود عین باری ہیں اور بحیثیت تعین غیر باری، پس غیریت اعتباری ہے دراصل ہمہ اوست''۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۵، ج ۳۳۶)

ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''آپ کے افکار کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کے خیالات پر عہد

فراق کا غلبہ ہے یعنی جس طرح اکابر صوفیہ کہتے ہیں، خواجہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ تخلیق سے پہلے جملہ حادث اشیاء ذات احدیت میں پنہاں تھیں، اس نہاں خانہ سے علیحدگی خواجہ صاحب کے افکار کا محور ہے، یہ نظریہ دراصل ابن العربی نے پیش کیا تھا اور رومی نے اسے بڑی شد و مد کے ساتھ اپنی مثنوی میں بیان کیا، خواجہ صاحب کی واحد آرزو یہی ہے کہ مراجعت اُسی نہاں خانہ ازل میں ہو جائے جہاں ہر طرف جلوہ ہی جلوہ ہے، اس دنیا میں رہتے ہوئے ذاتِ واحد کے جلوے سے انہیں فقط گاہے گاہے مناظر فطرت میں دکھائی دیتے ہیں ان کا انعکاس انہیں اپنے باطن میں بھی دکھائی دیتا ہے''۔ اسی لیے وہ کہنے لگتے ہیں۔

؎ یار دا جلوہ ہر ہر جا سبحان اللہ سبحان اللہ

(تاریخ ادبیات، مسلمانان پاکستان و ہند جلد ۱۳، ص ۳۲۱)

یہ منزل صرف اُس کو حاصل ہوتی ہے جس کے اندر ''عشق'' کی سرمستی کہرام بپا کرتی ہے، یہ سوز نا کی ایک درد بھی ہے اور دوا بھی، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کیفیت عشق کا بار بار ذکر کیا اور پکارتے رہے۔

؎ شاد باش اے عشق خوش سودائے ما اے دوائے جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کے عشقیہ ترانے تو روہی کے باسیوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہیں اس لیے ہر کہیں سے ان کے اشعار کی مہکار محسوس ہوتی ہے، ایک کافی کا ایک بند ہے۔

عشق ہے دُکھڑے دل دی شادی عشق ہے رہبر مرشد ہادی
عشق ہے ساڈا پیر جیں کل راز سمجھایا

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے مغلیہ تاجداروں کو عقیدت رہی ہے، شاہجہان

نے اس خاندان کو پانچ ہزار بیگھہ اراضی عطا کی تھی، آپ کے دادا قاضی محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو بڑی عقیدت تھی، شاہی قلعہ والوں کا یہ نیازمندانہ تعلق آپ کے والد ماجد مولانا خدا بخش رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی جاری رہا، بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا احمد اختر نے یہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کے حالات پر مشتمل ایک کتاب ''مناقب فریدی'' دو جلدوں میں لکھی۔

(تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند جلد ۱۳، ص ۳۲۰)

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے تیس سال سے زائد عرصہ مسند ارشاد کو رونق بخشی بالآخر علم و عمل کا یہ پیکر عظیم چہار شنبہ ۷ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء کو اس جہانِ فانی سے دارِ خلد کا راہی ہوا، دو شادیاں تھیں مگر اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہی ہے۔

حضرت خواجہ محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۲۹ھ)

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے اکلوتے صاحبزادے خواجہ محمد بخش جو خواجہ نازک کریم کے لقب سے معروف ہیں، ربیع الاول ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، والد گرامی کے انتقال پر ۲۶ سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے، مشکوٰۃ شریف، لوائح جامی اور شرح عقائد کا درس والد گرامی سے لیا تھا، خود بھی مشائخ کے طریقہ کے مطابق درس و تدریس میں مشغول رہے، بڑے بڑے اصحاب علم آپ کے بحر علمی سے فیض یاب ہوئے، خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ سے چشتیہ سلسلہ کی فریدی شاخ کا فیض دور و نزدیک خوب پھیلا، حقیقت یہ ہے کہ ایک نمایاں مسند جو مرجع خلائق بن چکی تھی اس کی آبرو کو قائم رکھنا ہی بڑی ہمت کا کام تھا جسے خواجہ نازک رحمۃ اللہ علیہ نے پوری روحانی و علمی قوت سے برقرار رکھا، آپ کو صرف نو سال کا عرصہ ملا مگر یہ دورانیہ توسیع سلسلہ کے لیے از حد کار آمد ثابت ہوا، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ وفات کہی جس میں نذرانہ محبت پیش کیا، فرماتے ہیں

شاہِ نازک نازنین چوں بایزید — بلبلے بود از گلستانِ فرید
سال وصلش خواستم ہاتف بگفت — بلبل از باغ فرید الدین پرید

(۱۳۱۹ھ) (۱۳۴۸ھ)

حضرت خواجہ محمد معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۳۷ھ)

حضرت خواجہ محمد معین الدین رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۰۱ھ کو خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پیدا ہوئے، درسی کتب مولانا احمد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا تاج محمود رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، چند اسباق نحو گڑھی اختیار خان کے مدرسہ سے بھی پڑھے، ایک ذہین طالب علم تھے، صرف ۲۸ سال کے تھے کہ والد و مرشد خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ وفات پا گئے اور آپ مسند نشین ہوئے صاحب علم بھی تھے اور صاحب عرفان بھی، ظاہری صورت بھی جاذب نظر تھی اور باطنی جمال بھی خیرہ کن تھا، ایک ایسی نشست میں موجود تھے جس میں اُس دور کے دو بڑے عالم مولانا محمد امیر اور جامعہ عباسیہ کے شیخ، بطل جلیل مولانا غلام محمد گھوٹوی بھی موجود تھے صفات الٰہیہ عین ذات ہیں یا غیر ذات پر دونوں اصحاب علم نے خوب گفتگو کی، آپ نے داد بھی بہت دی مگر جب خود اس مسئلہ پر گفتگو کی تو موجود علماء ذی وقار بھی عش عش کر اٹھے اور ذوق وجد میں جھوم اٹھے"۔ (مقابیس المجالس ص ۸۲، ۸۳)

حضرت خواجہ محمد معین الدین نہایت درجہ پابند شریعت بزرگ تھے اس لیے عرس کی محفلوں میں خواتین کی شرکت پسند نہ تھی اور نہ ہی مجالس سماع میں کم سن لڑکوں کو بیٹھنے دیتے تھے۔ (حوالہ مذکورہ ص ۸۴) خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صرف چھتیس سال عمر پائی کہ ۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۷ھ کو وفات پائی، مرید خاص حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراف عظمت کے طور پر فرمایا۔

لَقَدْ مَاجَ مَنْ كَانَ شَيْخًا كَرِيْمًا جَلِيْلاً جَمِيْلاً رَؤُفًا رَحِيْمًا
تَفَكَّرْتُ فِيْ اِرْخِهٖ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالُوْا لَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا

''لَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا'' سے تاریخ وفات ۱۳۳۷ھ نکلتی ہے۔

اب ذکر ہے خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے فیوضات باطنہ سے بہرہ یاب ہونے والے فردِ فرید حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا جس کو خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ نے درشہوار بنایا جبکہ خواجہ محمد معین الدین رحمۃ اللہ علیہ جسے فرق ماہ وشاں کا سرتاج بنا دیا، ہماری اس تحریر کا مرکزی موضوع یہی گوہر تابدار ہے اس لیے مناسب ہے کہ یہاں رُکا جائے تا کہ آپ کی شخصیت کے حوالے سے اور متعلقہ مناسبات کی اثر آفرینی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی جا سکے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۶۷ھ)

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اس نگارش کا مرکزی نقطہ ہے، یہ اس لیے کہ آپ کا وجود اپنے بعض امتیازی اوصاف کی بنا پر عصر حاضر کے وابستگانِ طریقت اور متلاشیانِ حق کے لیے ایسا منارۂ نور ثابت ہوا جس کی ہمہ جہت روشنی نے اک جہان کو منور کیا، جس نے قرب کی لذت پائی اس نے آپ کے وجود میں ایک پرخلوص راہنما، ایک بے ریا صاحب مسند اور ایک صاحب عزم انسان دیکھا اور جو لذت آشنائی سے بہر نوع متمتع نہ ہوسکا اس نے بھی ایک شیریں مقال واعظ، ایک درد آشنا مصلح اور ایک فیض رساں مردِ ایقان کی تابانیاں محسوس کیں، طالبانِ علم نے علم کا ایک پرخروش دریا دیکھا تو واقفانِ طریقت نے جذب و مستی کے جہانِ زندہ کی راعنائیاں مشاہدہ کیں، مسند نشینوں نے وقارِ سجادہ کی تپش محسوس کی تو زاویہ نشینوں نے قلب و نظر کی جولانیاں بے کنار ہوتی دیکھیں، ایک وجود مگر اک بوقلمون جہان کہ کسی نے واعظ خوش بیان کہا تو کسی نے شعلہ بار مقرر، کوئی تنظیم الفاظ کی دروبست کا اسیر ہوا تو کوئی طبع رواں کی فیض بخشیوں کا نخچیر ہوا۔ کوئی باطن کا سفیر سمجھتا رہا تو کوئی شریعت کا امین گردانتا رہا، غرضیکہ ایسا دل نواز وجود کہ جس نے دیکھا وہ مسلسل دیکھنے کی طلب پالتا رہا، جس نے سنا وہ ہمہ گوش رہنے کا سلیقہ نبھاتا رہا بے توفیق قرار پانے والے عصر موجود نے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے توفیق کی سعادت پائی، سمت در سمت پھیلے ہوئے ایسے وجود کا تذکرہ آسان بھی ہوتا ہے کہ لائق

اخذ مواد کثیر ہوتا ہے اور مشکل بھی کہ اس قدر کثرت کا محدود عقل کیسے احاطہ کرے، اس لیے اس تحریر سے حق کی ادائیگی کا خمار نہیں صرف بساط بھر اعترافِ عظمت کا مرحلہ ہے، کوشش یہی ہے کہ چند گوشے شمار ہو جائیں تا کہ ذوقِ تحریر کو کچھ طمانیت نصیب ہو جائے۔ بہتر ہوگا کہ ذاتِ ممدوح کے ان اطراف کا ذکر پہلے ہو جائے جن سے تفہیم مقصود کی سہولت پیدا ہو، اس لیے تذکار ذات سے پہلے ذات کے زمانی، مکانی اور نسلی پہلوؤں پر مختصر مگر ضروری گفتگو پیش کی جاری ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

حیثیت سے شامل ہو گیا تھا، خاندانِ غلاماں ۶۰۲ھ سے ۶۸۸ھ تک برسر اقتدار رہا، یہ وہ دور تھا جس میں مسلمانوں کی برصغیر کے علاوہ ہر حکومت منگول حملوں کی زد پر تھی، ۶۵۶ھ میں عروس البلاد بغداد تاراج ہو چکا تھا، ہر جانب، ہلاکت، بربادی اور زوال صدیوں میں قائم کیے گئے مراکز علم وہدایت کو ویران کر چکی تھی، ایک زبوں حالی کا عالم تھا، خوں آشامی کی منگولی روش نے مضبوط عباسی سلطنت کو برباد کر دیا تھا، الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، ایسے میں صرف برصغیر ہی محفوظ ماٴمن تھا، اس لیے کثیر آبادی، نقل مکانی پر مجبور ہوئی، برصغیر کی خوش قسمتی کہ ان آنے والے مہاجرین میں جہاں علماء، دانشور، خطیب اور واعظ شامل تھے وہاں اس قافلہ خیر میں بہت سے صوفیاء اور اولیاء بھی تھے، ان اصحاب کمال کی تشریف آوری نے برصغیر میں روحانی انقلاب برپا کیا۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳۱ھ)، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۳۳ھ)، شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۶۶ھ)، خواجہ حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۴۱ھ/۶۴۳ھ)، شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۴۱ھ) کی برصغیر آمد اور موجودگی نے سرزمین ہند کو عقیدہ کی طہارت کے ساتھ اعمال کی پاکیزگی بھی عطا کی، اس طرح برصغیر کے معاشرے میں دین اسلام کی اشاعت وترویج، روز اول سے ہی طریقت آشنا ہو گئی تھی۔ پھر خلجی خاندان (۶۸۹ھ تا ۷۲۰ھ)، تغلق خاندان (۷۲۰ھ تا ۷۹۰ھ) لودھی خاندان (۸۵۵ھ تا ۹۳۲ھ) مسلمان حکومتوں کا ایک لمبا دورانیہ ہے مگر تغلقوں اور لودھیوں کے درمیانی ۶۵ سال نہایت اضطراب کے دن تھے کہ سیاسی خلفشار بھی نمودار ہوا اور مذہبی بے راہ روی کی تحریکوں نے بھی جنم لیا، لودھی حکمرانوں کے آخری حکمران ابراہیم لودھی سے ظہیر الدین بابر (م ۹۳۷ھ/ ۱۵۳۰ء) نے ایک خونی معرکہ کے بعد اقتدار چھین لیا، پانی پت کے میدان کو دو مسلمان حکمرانوں کا ٹکراؤ آج تک یاد ہو گا کہ مبارزت کا رُخ اپنے ہی ہم مذہبوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ مغلیہ کا دورِ عروج (۹۳۲ھ/ ۱۵۲۶ء تا ۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء) بڑا پُرشکوہ تھا جس کے تہذیبی آثار آج تک تاریخ برصغیر میں دمک رہے ہیں، یہ ضرور ہوا کہ بے شمار قوت بعض نا اعتدالیوں کا موجب بھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

بننے لگی جس کے مکروہ اثرات، اکبر اعظم (م ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء) کے دبدبہ خیز دور میں ظاہر ہونے لگے تھے، عقائد کے جھول کے ساتھ صف طریقت میں ناہمواری بڑی کرب انگیز تھی، مغلیہ دورِ زوال (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء تا ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء) اسلامی تہذیب وثقافت کے لیے ہی موجب زوال نہ تھا، اس میں سیاسی شکوہ اور حکومتی وقار بھی پامال ہو گیا تھا، قتل و غارت اور تخت نشینی کی جنگوں نے اس قدر بے توفیق کر دیا تھا کہ سمندر پار سے تجارت کی غرض سے آنے والے سفید فام قدم قدم منزل اقتدار کی طرف پیش قدمی کرتے رہے اور آخر برصغیر میں مسلمانوں کے تقریباً بارہ سو سال (۹۲ھ تا ۱۲۷۴ھ) کا معاشرتی تفوق اور تقریباً پونے سات سو سال (۶۰۲ھ تا ۱۲۷۴ھ) کا سیاسی اقتدار استعماریت کے عفریت نے نگل لیا اور غلامی کا طویل دورانیہ محیط ہو گیا حتی کہ مسلمانانِ ہند کی طویل جدوجہد کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوا اور آزاد فضا نصیب ہوئی۔

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا زمانی پس منظر ایک زوال پذیر معاشرے کی نارسائیوں سے ترتیب پاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی برصغیر میں مسلمان مرکزیت کا زوال شروع ہو گیا، اس عظیم سلطنت کو یکجا رکھنے کے لیے جس وسعت فکر ونظر کی ضرورت تھی وہ کم یاب ہو گئی تھی، صلاحیت کا فقدان تھا مگر حکمرانی کی خواہش موجود تھی، مرکزیت کا انحلال مقامی آبادی کو مجتمع ہونے کی تحریک دے رہا تھا، انحطاط قدم قدم بڑھ رہا تھا مگر حکمران جسد بے جان تھے، بے حسی نے عواقب سے بے خبر کر رکھا تھا، سمندر پار سے آنے والے تاجروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور تغلب حاصل کر لیا، ۱۸۵۷ء کی آخری کروٹ بھی بے توفیق ثابت ہوئی تو مغل بادشاہی کا تکلف بھی ختم کر دیا گیا، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا اک بازار گرم ہوا، حکومت ہی نہ بدلی، علمی و روحانی اداروں پر بھی افتاد پڑی۔ مسلمان صدیوں سے حکمران رہے تھے اس لیے خوئے غلامی سے آشنا نہ تھے، مزاحم بھی ہوئے، تڑپے بھی اور بے توفیق پر جھنجھلائے بھی مگر زوال کبھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

یک رخا نہیں ہوتا ہمہ جہتی ہوتا ہے، اپنوں کی سطحی خواہشات نے وہ زنجیریں ڈالیں کہ ایک عرصہ تک ٹوٹ نہ سکیں، ایک مرغ اسیر کی طرح سراپا احتجاج بھی ہوئے مگر غلامی کی بے بسی نے بے حال کر دیا، یہ حقیقت تو تاریخ کے اوراق میں کئی بار رقم ہوئی کہ غلام قوموں کو خوب وزشت کی تمیز اور عزت وذلت کا احساس نہیں رہتا بقول حفیظ:

؎ غلامی میں بشر عزت کے معنی بھول جاتا ہے

تصور کیجیے کہ جب قوم میں معاشی خوش حالی، معاشرتی آسودگی اور سماجی استحکام مفقود ہو جائے تو علمی سرفرازی اور اخلاقی بلندی کی نمود کیسے ہوگی؟ حکمران معاند ہو اور ہمسایہ چال باز تو زندگی کس قدر راہیرن ہوگی؟ برصغیر کا مسلمان تو دوہرے عذاب میں مبتلا تھا، یہ سب نتیجہ تھا اس بے بصیرت روش کا جو مسلسل اپنائی جا رہی تھی، دورِ اقتدار میں ہی کوتاہ فکری جنم لینے لگی تھی، حکمران عارضی شوکت پر اس قدر نازاں ہو گئے کہ خودنگری اور انا پرستی کے اسیر ہوئے انہیں ایک ہی دھن تھی کہ کس طرح انہیں ظل اللہ ثابت کر دیا جائے، مدح کی خواہش یوں پروان چڑھ رہی تھی کہ ''ہم چو ما دیگرے نیست'' کا خبط عروج پر تھا، کوتاہ قامت، بلند نظر آنے کا جتن کرنے لگے تھے، شاعر، ادیب حتی کہ اہل علم اور اصحاب دانش بھی ان پست قامتوں کو کوہ وقار ثابت کرنے میں لگے رہے تھے، بدقسمتی یہ کہ سانگلا ہل کی سی پہاڑیاں، کوہ ہمالیہ کا شکوہ طلب کر رہی تھیں، ایسے ماحول میں خیالات کی رفعت، معتقدات کی عظمت اور عقیدتوں کی صیانت بے قیمت ہو رہی تھی، ان حالات میں وہ صاحب توفیق افراد جو عروج وزوال کی منزلوں میں امتیاز کا شعور رکھتے تھے سخت مضطرب تھے، ان کی ذمہ داری بھی بڑھ گئی تھی اور ان کے امتحان بھی شدید ہو گئے تھے۔

تاریخ اسلام کا ورق ورق گواہ ہے کہ ایسے ہمہ جہتی انحطاط کا مداوا صرف ایک ہی صورت میں ممکن رہا تھا، وہ یہ کہ اولوالعزمی سے ناطہ جوڑا جائے، اُن نقوش کو منزل مراد قرار دیا جائے جن سے رفعتوں کا سراغ ملتا ہے، تاریخ اسلام کا ماضی گواہ ہے کہ یونانی افکار کی یلغار، پریشان نظری کا سبب بنی تھی اور قریب تھا کہ مسلم امت کے عقائد ونظریات

WWW.NAFSEISLAM.COM

بے یقینی کا شکار ہو جائیں، ایسے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۰۵ھ) کا تجربہ جو علمی وقار کے ساتھ روح کے گداز سے کندن بن چکا تھا، ملت کے کام آیا، نتیجہ یہ نکلا کہ بے ثبات قدم، ٹھہراؤ محسوس کرنے لگے، یونانی علوم سے چندھیائی ہوئی نظریں ایقان کی نورانیت سے مستنیر ہوئیں، تاریخ ایسے مثبت ردعمل کے کئی واقعات کی امین ہے، ماضی قریب میں بھی استعماری جبر کا تعفن اور ماورائی ویدانت کا مکر وجودِ ملت کو لرزانے لگا تھا، ایسے میں یقین کی دولت بانٹنے والے اصحابِ عزیمت کا عزم صادق ہی امت کے کام آیا، سچ یہ ہے کہ آزاد وطن اور خود اختیاری کی قوت سے قائم ہونے والی ریاست سیاسی تدبر سے زیادہ باطنی تربیت کی مرہون ہے۔ راہنمائی کا یہ فریضہ انجام دینے والی متعدد محترم شخصیات میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی شامل ہے، آپ کی مساعی کی کئی جہتیں تھیں جن کا اجمالی جائزہ آپ کے کردار کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگا، مثلاً

WWW.NAFSEISLAM.COM

شکار ہو چکے تھے، ماضی سے تعلق تو کسی حد تک قائم تھا مگر حال سے بے اعتنائی تھی، موجود دنیا سے تعلق میں بے ریختی واضح تھی اس سے سماجی پس پائی ہر کہیں نمایاں تھی اور یہ احساس ابھرتا رہا کہ دینی علوم ماضی کی خوشگوار یادوں کا حصہ ہیں۔

شکوۂ ماضی سے بے اعتنائی:

استعمارِ انگریز کے ہر رویے میں یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ **ملت** اسلامیہ کے ماضی کا حسن گہنا دیا جائے تا کہ عظمت رفتہ کا احساسِ تفاخر مہمیز نہ بنے، اس مقصد کے حصول کے لیے بے سروپا فسانے تراشے جا رہے تھے، تاریخی حقائق پر تشکیک کی گرد اڑائی جا رہی تھی۔ اکابرین کی شخصیات کو دھندلایا جا رہا تھا تا کہ حوصلہ مندی کی کوئی صورت باقی نہ رہے، مسلمان فاتحین کے کردار کو نفرت کی دھند میں لپیٹا جا رہا تھا، غرضیکہ عظمت و وقار کا تاریخی تسلسل یوں پامال ہو رہا تھا کہ خود **ملت** کے بعض فریب خوردہ دانشور ماضی کو کوسنے دینے کو دانش کی معراج سمجھنے لگے تھے، اس تہذیبی بے راہ روی نے **ملت** کو مفلوج کر دیا تھا، اسی لیے تو بعض دردمند پکارنے لگے تھے۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مرکز یقین وقوت سے بے اعتنائی:

معاند قوتوں کا سب سے بڑا ہدف یہ تھا کہ کسی طرح اس امت کے احساسِ وحدت کو کمزور کر دیا جائے اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ذات رسالت مآب ﷺ سے اُمت کی مخلصانہ مگر والہانہ نسبت کو نشانہ بنایا جائے، وہ جانتے تھے کہ یہی ذاتِ گرامی ﷺ ہی مرکزیت کی اساس، یقین کی بنیاد، ایمان کی جان اور امت کے تشخص کی ضمانت ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کی ساری صلاحیتیں اس مذموم مقصد کے لیے مجتمع ہو گئی تھیں، کبھی سیرتِ رحمت سے بے زاری کی تحریک تھی تو کہیں خصائص وشمائل سے بے رغبتی کی ترغیب تھی اس کے لیے تنخواہ دار دانش ور پیدا کیے گئے، ژولہ رباصوفی میدان میں اُتارے

گئے اور تو اور نبوت کے دعویدار پالے گئے، ہر حربہ آزمایا گیا کہ ملت کے دلوں سے محبوب برحق ﷺ کی محبت نکال لی جائے، علامہ مرحوم کو یہی گلہ تھا کہ یہ امت

؎ دلِ دارند و محبوب نہ دارد

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کفر کو بہت سے بہی خواہ مسلمانوں کی صفوں سے دستیاب ہو گئے، سوچیے جب اپنا ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہی معاند قوتوں کے دست و بازو بن جائیں تو دفاعی حکمت عملی کس قدر کمزور ہو جاتی ہے، مگر اللہ اللہ ایسی گھمبیر فضا میں عزم صمیم کے پیکر اور یقین محکم کے علمبردار، نبرد آزمائی کا حق ادا کرتے رہے، کامیابی ہمیشہ ان خوش بخت لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو ہر ذہنی آلائش سے پاک، ہر مصلحت پسند سے بیزار اور ہر ضروری عزم و یقین سے مسلح ہوتے ہیں، مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ یا مولانا خیر الدین رحمۃ اللہ علیہ یا ہمارے ممدوح خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ یہ وہ اصحاب کمال وجود ہیں جنہوں نے زندگی بھر تحفظ و صیانت عقیدہ کا مشن نبھایا۔ یہ لوگ کسی قدر کامیاب ہوئے یہ ملت کا موجود منظر نامہ واضح کر رہا ہے۔

ملت اسلامیہ کو علماء راسخین نے عقائد کے اس جھول سے کیسے بچایا، یہ ایک طویل داستان ہے مگر اس سے انکار نے اگر علمی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے کا فریضہ علماء حق نے عمدگی سے ادا کیا تو قلب و نظر کی جدلیت کے مغالطوں سے صوفیاء راسخین نے پناہ عطا کی، ان علماء کے گروہوں میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام و مرتبہ کیا ہے، اس پر ہم خصوصی نظر ڈالیں گے۔

یہ تھا وہ زمانی حصار جس میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھ کھولی، یہ بجا کہ ہر انسان کسی نے کسی حد تک اپنے ماضی اور حال سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ رائج حکایات سے ہی تلمیحات اخذ کرتا ہے اور مروج زبان سے ہی کلمات و تراکیب انتخاب کرتا ہے لیکن اس عموم میں اہل نظر اپنا خصوص ضرور پیدا کر لیتے ہیں، اُن کا لہجہ ان کی شناخت بنتا ہے اور سب سے بڑھ کر ان کا موعود ذہنی ان کی انفرادیت کی حجت قرار پاتا ہے، اس دریافت

WWW.NAFSEISLAM.COM

گڑھی اختیار خان:

گڑھی اختیار خان کون سی بستی ہے اور اس دور میں اس کی سماجی حیثیت کیا تھی؟ یہ جاننے کے لیے پروفیسر سعید احمد سے رجوع کرتے ہیں، وہ اس قصبہ کی تاریخی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

''گڑھی اختیار خان، خان پور سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر سردار گڑھ روڈ پر واقع ہے، یہ ایک تاریخی حیثیت کا قصبہ ہے، اس کی بنیاد سندھ میں کلہوڑہ دورِ حکومت میں خدایار خان کلہوڑا کے ایک آفیسر شادی خان نے رکھی تھی اور اس کا نام گڑھی شادی خان رکھا تھا''۔

سٹیٹ گیزیٹیر بہاولپور میں ہے کہ ''نور محمد خان کلہوڑا کی وفات کے بعد سندھ

میں کلہوڑا اقتدار روبہ زوال ہونے لگا تو کوندی کے حاجی اختیار خان نے ۱۷۵۳ء میں اس قصبے پر اچانک حملہ کر کے اس کلہوڑا افسروں سے چھین لیا، اس کے اردگرد ایک قلعہ نما فصیل تیار کر دی اور اس کا نام تبدیل کر کے گڑھی اختیار خان رکھ دیا۔ (حوالہ سٹیٹ گیزیٹیر بہاولپور ص ۳۶۲ طبع ۱۹۰۴ء)

(پھر اس قصبہ کی مساجد محل اور بنگلوں کا ذکر ہے، نیز یہاں کی دستکاری اور صنعت کا بیان ہے) ..... آج کل گڑھی اختیار خان ایک چھوٹے سے قصبے کی شکل میں ہے، ایک بازار موجود ہے، ایک گورنمنٹ ہائی سکول، ایک ڈسپنسری اور غلہ گودام ہے"۔

(پھر پروفیسر سعید احمد نے اس قصبہ کی موجودہ شناخت اور شہرت کا حوالہ دیا ہے کہ کیونکر یہ گمنام سا قصبہ آج اس قدر معروف ہو گیا ہے، فرماتے ہیں)۔

یہ قصبہ نامور صوفی بزرگ اور سرائیکی کے مایہ ناز شاعر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کی وجہ سے مشہور ہے جو حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (چاچڑاں شریف) کے خلیفہ خاص تھے۔

(دیگر مزارات اور معروف شخصیات کا ذکر بھی ہے)

(ضلع رحیم یار خان کی سیاسی تاریخ اور اہم مقامات ص ۴۲۷، ۴۲۸)

اس تاریخی روایت سے ثابت ہوا کہ یہ قصبہ، چھوٹا ضرور تھا مگر گمنام کسی دور میں بھی نہیں رہا، ہر دور میں حکمرانوں اور منصب داروں کی اس پر نظر رہی ہے، اس تاریخی اہمیت کے باوجود اس قصبہ کی شہرت کا اصل راز خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں قیام ہے اور وہ مزار ہے جس سے روحانی وابستگی، خلق خدا کو اس جانب متوجہ کر رہی ہے۔

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی مرحوم صاحب قلم بھی تھے اور صاحب علم مقرر بھی تھے، آپ اس علاقہ کی تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے بخوبی واقف تھے، آپ گڑھی اختیار خان کا ذکر کرتے ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

''گڑھی اختیار خان یہ ایک نسبتاً گمنام اور چھوٹے قصبے کا نام ہے جو زیریں پنجاب کے آخری ضلع رحیم یار خان کی تحصیل خان پور سے تقریباً بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر آباد ہے۔ نواب بہاولپور کے ایک عزیز نیک سیرت بزرگ حاجی محمد اختیار خان مرحوم کے نام پر آباد یہ قصبہ کسی خصوصی امتیاز کا حامل نہیں ہوا، نہ اس کی تاریخ سے کسی کو دلچسپی رہی اور نہ علاقے کے لوگوں کے علاوہ کسی کو اس کا جغرافیائی محل وقوع اور حدود اربعہ معلوم ہے، چند برس پہلے تک نہ یہاں بجلی تھی اور نہ ڈھب کی کوئی سڑک، چار میل پختہ راستہ تھا اور وہ بھی کہنے کی حد تک کیونکہ جگہ جگہ سے شکستہ اور قریب قریب ناہموار اور باقی چار میل ریت اور مٹی، آنے جانے والوں کا انجر پنجر ہلا دینے والا راستہ، دن بھر میں صرف ایک بس چلتی تھی اور وہ بھی کبھی کبھار، راستے میں خراب ہو جاتی اور سواریاں پیدل اپنے اپنے گھروں کو پہنچتیں''۔

(یہ تو چوگردہ اور اتصال کا راستہ تھا، قصبہ کیا تھا سنئے)

''بذاتِ خود گڑھی اختیار خان کچے پکے چند دکانوں پر مشتمل ہے، ارد گرد کھجوروں کے جھنڈ عہد رفتہ کا اتا پتہ دیتے ہیں، دو گنبد والی مسجدیں دورِ قدیم کی یادگار ہیں، کل آبادی ڈیڑھ دو ہزار نفوس سے زیادہ نہیں اور وہ بھی آج کل پچاس برس قبل تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی بہت کم آبادی ہو گی، کوئی نمایاں کاروبار اور کاشت ایسی نہیں جو اس قصبے کو ایک دوسرے علاقوں سے ممتاز کر دے''۔

(صاحبزادہ گیلانی مرحوم کوائف کے تفصیلی تذکرے سے یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ یہ قصبہ کسی تاریخی پس منظر یا علاقائی عظمت کا حامل کبھی نہیں رہا اور اگر یہ اب اہل دل کے جذبوں کا امین ہے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے، یہ وجہ انہی کی زبان سے سنئے)۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

''ملک کے ہزار ہا قصبات میں سے ایک گڑھی اختیار خان ہے، مگر اس قصبے کو ایک لازوال شہرت حاصل ہے کہ اس کی آغوش میں اپنے دور کا ایک جادو بیان خطیب، درد و سوز کا سفیر، اسلاف کی روایات کا امین، بستانِ فرید کا بلبل، روشن ضمیر صوفی، عشق و محبت کا پیکر، مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے خاموش الفاظ کو نطق آشنا کرنے والا شیریں مقال واعظ اور مٹی ریت کے ذروں میں عشق کا بارود بھر دینے والا مردِ قلندر آسودہ ہے جس کی لحد زیارت گاہ اہل کیف و مستی کا درجہ رکھتی ہے''۔

''وہ بڑے بڑے شہر جن کے دامن ہجوم خلق سے پھٹے پڑے ہیں وہاں سے ڈھونڈے سے بھی کوئی رمز آشنا نہیں ملتا مگر کچے گھروندوں کا یہ قصبہ اپنے پاس عرفان و آگہی، سوز و ساز اور جذب و وجدان کی جاگیر رکھتا ہے اور اس جاگیر کا واحد مالک خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ہے جس نے اس جاگیر کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا اور اس کے حصے بخروں سے بیکانیر اور اجمیر تک کے لوگوں نے اپنا دامن بھرا''۔ (خواجہ محمد یار فریدی اہل دانش کی نظر میں ص ۱)

ان بیانات سے واضح ہوا کہ:

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا مکانی حوالہ کسی پیشگی عظمت و برتری سے معروف نہ تھا، اس کی شناخت اور تعارف کا اصل حوالہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود مبارک ہی ہے۔

اس کے باوجود یہ بھی عیاں ہے کہ بظاہر غیر معروف قصبہ اپنے اندر روحانیت کا اک خروش ضرور سمیٹے ہوئے تھا کہ قرب و جوار کی باطنی تپش اس کے ذروں میں طلب و جستجو کی حرارت پیدا کر چکی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کی سرزمین میں روح کی شادابی کے آثار صدیوں سے نمایاں ہو رہے تھے، سرائیکی علاقہ تو جذب و شوق کا ہر دور میں جہانِ تازہ رہا، برصغیر

کی مسلم تاریخ کا ابتدائی حوالہ سلاطین کا دورِ حکومت ہے جس میں علماء وصوفیاء ہی نہیں سلاطین بھی علم ومعرفت کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ باکمال افراد ملتان اور ملتان کے گرد ونواح میں تزکیہ نفوس کے مراکز قائم کر چکے تھے، مراکز علم وحکمت اور مصادرِ تصوف ومعرفت کا بھی میلان اس جانب رہا تھا، اگرا جمیر، دہلی، سرہند تہذیب باطن کے روشن حوالے ہیں تو پاکپتن، لاہور اور ملتان بھی آسمانِ معرفت کے روشن باب ہیں۔ چاچڑاں میں مہاروی فیض تقسیم ہوا تو قریہ قریہ، بستی بستی تک روشنی پہنچی، گڑھی اختیار خان اسی فیض کا مسکن بنا جہاں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود سب کے لیے منبع فیض بنا، اک جہان اسی اختیار سے خیر کی طلب کا دیوانہ ہوا اور یہ دیوانگی روز بروز تسخیر کے مراحل سے گذر رہی ہے، فرزانگی میں دیوانگی کا مظہر اپنی پوری آب وتاب سے اب بھی دعوت خیر دے رہا ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

کی ذات، مرکز شرف و عظمت ہے، اس لیے اس ذاتِ اقدس سے تعلق نسبی یا مکانی، حسی ہو یا روحانی خیر ہی خیر ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نسبت قرب و زیارت حاصل ہے اسی لیے ان سے تعلق باعث منزلت ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قرب کی ایک اور نسبت بھی حاصل تھی کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کا امتیازی جزو ہونے کے علاوہ خاندانی قرب بھی رکھتے تھے، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے رشتہ ازدواج نے اس قرب میں مزید اضافہ کر دیا تھا، حسنین کریمین رضی اللہ عنہم سے جو نسل پھیلی وہ چونکہ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واحد توسیع بنی اس لیے عقیدتوں اور محبتوں کا ہر رُخ اس خاندان کے ساتھ جڑ گیا، احترام اس نسل کا حوالہ ہی نہ بنا اس نسل کی نجابت کا استحقاق ٹھہرا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جو اولاد پیدا ہوئی، اشراف کہلائی، سادات شمار ہوئی کہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم سے پھیلی، کہا جاتا ہے کہ ایک اور صاحبزادہ بھی تھا جس کا نام ''محسن'' تھا مگر اس صاحبزادے کی وفات بچپن ہی میں ہوگئی، اس لیے ''سادات'' نسل کا حوالہ حسنین کریمین رضی اللہ عنہم ہی رہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں اور کوئی شادی نہیں کی مگر جب خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو کہا جاتا ہے کہ اُن کی خواہش ہی کے مطابق آپ نے متعدد شادیاں کیں، ان دیگر ازواج میں سے جو اولاد ہوئی اس کی تعداد اور تعین میں قدرے اختلاف ہے مگر معتبر روایت کے مطابق حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کو شامل کر کے سب بیٹوں کی تعداد چودہ ہے اور بیٹیاں سترہ ہیں، ان باقی بیٹوں کی اولاد علوی کہلائی کہ عرب میں یہی طریق نسبت مروج تھا، مورخین کا کہنا ہے کہ ان علویین میں سے جو برصغیر آ گئے اُن میں بعض کو اعوان کہا گیا جو اعوان قطب شاہی کے نام سے معروف ہوئے۔

''قطب شاہ'' جو برصغیر کے اعوانوں کے جد اعلیٰ کہے گئے کے بارے میں، میزان ہاشمی، میزان قطبی اور خلاصۃ الانساب کے حوالے سے لکھا گیا کہ آپ

''برصغیر پاک و ہند میں اعوانوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت عون المعروف قطب شاہ ہیں جو کہ غازی علمدار عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں''۔ سلسلہ نسب کچھ یوں ہے۔

''عون بن یعلی بن حمزہ بن طیار بن قاسم بن علی بن جعفر بن حمزہ بن حسن بن عبداللہ بن عباس بن علی رضی اللہ عنہ ابی طالب ہاشمی قریشی''۔

''حضرت عون بن یعلی جو کہ عبدالعلی قطب حیدر اور قطب ہند کے نام سے بھی مشہور ہیں برصغیر پاک و ہند میں زیادہ تر معروف ''قطب شاہ'' کے نام سے ہوئے اس وجہ سے آپ کی اولاد کو قطب شاہی اعوان کہا جاتا ہے، آپ کی ولادت ''خلاصۃ الانساب'' کے مطابق بغداد میں ہوئی، آپ کا نام ''عون'' کنیت شامی ابوعبداللہ اس کے علاوہ اور بھی کئی القاب سے شہرت پائی لیکن سب سے زیادہ مشہور نام ''قطب شاہ'' ہے۔

یہ بھی روایت ہوا کہ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ علیہا الرحمۃ، سیدنا غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کی سگی بہن تھیں، آپ نے سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کے دست اقدس پر بیعت بھی کی تھی اور آپ کے ارشاد کے مطابق اپنی اولاد سمیت ہند کی طرف ہجرت فرمائی تھی، ایک عرصہ برصغیر رہے پھر واپس بغداد چلے گئے، کہا جاتا ہے کہ وصال پر حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور مقبرہ قریش، بغداد میں دفن ہوئے، ابن بطوطہ نے سفر نامہ میں لکھا:

''باب البصرہ کے راستہ میں ایک بڑی عمارت والی زیارت گاہ ہے، اس میں ایک چوڑے تعویذ کا مزار ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے، **ھذا قبر عون من اولاد علی بن ابی طالب**'' کہ یہ عون کا قرار ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں سے تھے۔

اعوان کے مورثِ اعلیٰ نے کوہستانِ نمک کے علاقے کو اپنا مسکن بنایا تھا، آج بھی اعوان زیادہ تر اسی علاقے میں بس رہے ہیں، قطب شاہ کی چار شادیوں کا ذکر ملتا ہے

ولادت، تربیت اور تعلیم:

گڑھی اختیار خان کے قصبہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ قطب شاہی اعوان کے ایک دیندار اور پاکیزہ گھرانے میں صاحب علم وتقویٰ مولانا عبدالکریم کے ہاں ۱۸۸۱ء /۱۳۰۰ھ میں ایک صاحب اقبال فرزند متولد ہوا، والد گرامی کی نیک نفسی اور صالحیت کا

گاؤں ہی میں نہیں قرب و جوار میں بھی تذکرہ تھا، طالبانِ علم وحکمت کی علمی تمناؤں کا رُخ عموماً اسی گھرانے کی طرف ہوتا تھا، نہ جانے متلاشیان حق کے جذبے کس قدر شدید تھے کہ اُن کی دعائیں بارگاہِ صمدیت میں قبول ہوگئیں، ان راستوں میں لڈتی ہوئی رحمتوں کو مستقل قرار ملا، کہتے ہیں آنے والے واقعات بہت پہلے اپنا عکس دینے لگتے ہیں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

خواجہ عبدالکریم رحمۃ اللہ علیہ کا گھر ہی اس نومولود سے نہیں جگمگایا، بستی بستی اور قریہ قریہ مسرتوں کے جھونکے لہرانے لگے، والدین کے لیے تو یہ نورِ نظر تھا ہی مگر یہ وہ صاحب اقبال وجود تھا جس کی تابانیاں دور و نزدیک کو منور کرنے والی تھیں، ہر وہ گھرانہ جہاں کردار و سیرت کی مہکار لٹ رہی ہو، وہاں تربیت اولاد کا اہتمام بھی بہت ہوتا ہے اس لیے نومولود جو مستقبل کے رویوں کی تعبیر بننے والا تھا خواجہ محمد یار کہلایا، یقیناً والدین کے نہاں خانہ فکر میں کوئی خواہش تو ہوگی جو اس نام کی محرک بنی ہوگی، اگرچہ یہ عمومی حقیقت ہے کہ نام صرف ایک تمنا کا اظہار ہوتا ہے اور اس کا کردار سازی میں بظاہر کوئی فعال حصہ نہیں ہوتا مگر یہ بھی مشیت کے فیصلے ہیں کہ کسی کو ابتداء ہی سے اسم بامسمیٰ بنا دیا جائے اور پھر وہ صاحب اسم اپنے محمود اسم کے حصار میں عمر گزار دے، نومولود محمد یار بھی مشیت کا بندھا ہوا وجود تھا، ماں کی آغوش سکون اور راحت ہی نہ تھی تربیت حسنہ کی آماجگاہ بھی تھی، باپ صرف یہ کہ انفرادی نیکی کا پیکر نہ تھا، ماحول کو بھی راستی کا درس دینے والا تھا، اس لیے نوخیزی کا دورانیہ خیر و شرف کے ہالے میں گزرا، گڑھی اختیار خان ابتدائی ضروری تعلیم کی کفایت کرتا تھا اس لیے بنیادی اسباق یہیں پڑھے، سن شعور تک پہنچے تو والد گرامی نے علم کے حصول کی عظمت پر یقین کرتے ہوئے اس مرکز علم سے رابطہ کر لیا جہاں اس علاقے کا نمایاں مدرسہ کام کر رہا تھا، چاچڑاں شریف میں ایک درسگاہ قرب و جوار کی علمی کفالت کر رہی تھی۔ خواجہ محمد یار تعلیمی پیش رفت کے لیے وہاں داخل ہو گئے، اس مدرسہ میں آنے سے قبل جلال پور کے مدرسہ میں بھی قیام رہا وہاں قرآن مجید پڑھا اور مروج نصاب کے مطابق فارسی کی چند ابتدائی

WWW.NAFSEISLAM.COM

کتابیں بھی پڑھیں، ابتدائی اساتذہ میں مولانا رحمت اللہ، مولانا محمد حیات اور مولانا تاج محمود شامل تھے، انہی ماہر اساتذہ نے اس ذوق کو اور فروزاں کیا جو فطرت نے ان میں ودیعت کر رکھا تھا، پروفیسر نذیر خلیق کی تحقیق کے مطابق خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں جو چاچڑاں شریف میں تھا، سے ۱۹۰۰ء میں سند فراغت حاصل کی مگر وہیں مقیم رہے۔ ۱۹۰۱ء کی جولائی میں خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے وفات پائی، تب بھی قیام وہاں ہی رہا، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے وفات کے دس سال بعد تک اسی درسگاہ سے منسلک رہے اور خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور مسند نشین خواجہ محمد بخش نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پوتے خواجہ معین الدین کی درگاہ میں رہے، (حضرت خواجہ محمد یار فریدیؒ۔ احوال و آثار) سند فراغت حاصل کرتے وقت آپ کی عمر ۱۹ سال کی تھی، اس سے احساس ہوتا ہے کہ آپ نے تحصیل علم میں کس قدر انہماک پایا کہ کوئی لمحہ ضائع نہیں ہوا، یہ یاد رہے کہ فراغت سے مراد بالفعل تمام علوم کی تحصیل تھی، بعد کے دس سال تو علم کو واردات بنانے میں لگے جس کے مظاہر پوری زندگی میں نمایاں ہوتے رہے، اس مدرسہ کا ماحول اور مقام کیا تھا، ارشاد احمد عارف وضاحت کرتے ہیں۔

''اس دور کی ایک شہرہ آفاق علمی درسگاہ واقع چاچڑاں شریف میں مروجہ علوم کی تکمیل کی، یہ درسگاہ سرائیکی زبان کے امرء القیس شاعر اور سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ کے صاحب سجادہ بزرگ حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی اور علمی سرپرستی میں علم و عرفان کے متوالوں کی توجہ کا مرکز تھی، برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض سے ہر عمر اور ہر نسل کے افراد اپنی علمی اور روحانی پیاس بجھانے کے لیے چاچڑاں شریف کا رُخ کرتے اور گوہر مراد پاتے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف یہاں سے ظاہری علوم کی دولت ہی حاصل نہیں کی بلکہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شعر و بیان کی اصلاح بھی لی''۔ (عاشق رسولؐ خواجہ محمد یار فریدی)

WWW.NAFSEISLAM.COM

سفر ارادت اور نسبت طریقت:

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ علوم مروجہ کی تحصیل کے دوران ہی میں مکتب ارادت سے منسلک ہو گئے تھے، یہ آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ہر دو نصاب کا مرکز ایک تھا، چاچڑاں شریف کے مدرسہ میں اساتذۂ فن مختلف فنون کی تدریس کرتے تھے تو شیخ جامعہ حضرت غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ علم روحانی کا درس دیتے تھے، ہونہار شاگرد نے ہر دو علوم میں اپنی اہلیت منوالی تھی اس لیے برابر فیض یاب ہوئے، حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے وجود میں مہاروی فیض پوری قوت سے موجود تھا، اس میں خواجہ محمد عاقل رحمۃ اللہ علیہ کا علمی وقار بھی شامل ہو چکا تھا اس لیے فریدی دربار عشق و مستی کی جولانیوں کے ساتھ ساتھ علمی منزلت سے بھی سرفراز تھا، خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کو شریعت کی پاسداری اور طریقت کے ہم نوائی اسی دربار سے حاصل ہوئی، چشتی ذوق کا والہانہ پن مستزاد تھا اس لیے مختصر مدت میں ہی ایک مسند فیض کے اہل قرار پائے، ۱۹۰۱ء میں خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو گیا تو کسب فیض کا مصدر آپ کے صاحبزادے خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ تھے حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اس آستانے سے منسلک ہوئے تقریباً دس سال فیض صحبت پایا، مرشد کریم نے تربیت کا ہالہ یوں قائم کیا کہ تعمیر شخصیت کا ہر گوشہ منور ہوا قرائن بتا رہے ہیں کہ شیخ کی توجہ لائق قدر مرید کی جانب بہت زیادہ تھی، یہ خاص انہماک اس وصیت کا اثر تھا جو حضرت غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ سفر آخرت پر روانہ ہونے سے قبل اپنے جانشین کو ارشاد فرما چکے تھے، فرمایا:

''نازک اس بچے کا خیال رکھنا، اسے فریدیت کے کخواب میں سانبھ کے رکھنا، جس طرح اس بچے کا نام عجب ہے اس طرح اس کے کام بھی عجوبہ ہوں

گئے''۔(عندلیت گلشن فرید۔سید بشیر احمد شاہ بانگ سحر ۱۱۰)

بھلا یہ نصیحت کس طرح نظر انداز ہو سکتی تھی، خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ کی مسلسل دس سالہ نگرانی، محبت اور توجہ نے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کو شریعت و طریقت کا ایسا پیکر بنا دیا کہ اہل عصر بھی قربان ہونے لگے اور خود صاحب سجادہ بھی اس گہر تابدار کو اپنی مساعی کا حاصل سمجھنے لگے، خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد گرامی اور شیخ محترم کی تفویض کی گئی ذمہ داری کو کمال انہماک سے نبھایا۔ واصل بحق ہونے سے پہلے حسب روایت اس ابھرتے ہوئے شیخ باصفا کو اپنے صاحبزادے حضرت معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کیا جنہوں نے تربیت کی تکمیل کے آثار دیکھتے ہوئے آپ کو خاندانِ چشت کی نمایاں تر شاخ فریدی راہ سلوک کی خدمت عطا فرما دی، سرپرستی اور تربیت کے ان پاکیزہ مراحل سے نہایت استقامت کے ساتھ گزرے تو طالبانِ حق کی راہنمائی کا فریضہ سنبھالا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ سلسلہ ہدایت کا باقاعدہ آغاز ۱۹۱۵ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ اقدس سے ہوا، اس طرح راہِ سلوک کا یہ مسافر منزل یقین تک رسائی کا اہل ٹھہرا، حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی منزلِ آخر اور ایمان و یقین کی اصل ثابت، مدینہ منورہ ہی ہے، ارادت کے سب مراکز کا ہدف یہی ہوتا ہے کہ وہ دروازے پر آنے والے مسافروں کا رُخ سفر مدینہ منورہ کی طرف کر دیں، کوٹ مٹھن ہو یا چاچڑاں مہار ہو یا دہلی، اجمیر ہو یا کلیر، لاہور ہو یا کلیر، بغداد ہو یا دمشق، یہ سب راستے کے پڑاؤ ہیں، یہ نشانِ منزل تو ہیں منزل طیبہ ہی ہے۔ مرشد برحق کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ تربیت کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے اور منزل آشنا کر کے سفر خیر پر روانہ کرتا ہے، جو راستے ہی میں روک لے وہ راہ یاب راہنما نہیں ہوتا، خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا سفر خیر اسی جانب جاری رہا جو منزل مراد ہے، حرمین شریفین سے سند تکمیل ملی تو نشر حسنات کے مشن پر روانہ ہوئے، پھر مہاجرین نے دیکھا کہ جذبۂ عشق کہاں کہاں لے گیا، قریہ قریہ بستی بستی عشق کی شمع فروزاں ہوئی، گلیاں کوچے ہی عطر بیز نہ ہوئے دلوں کے محراب بھی جگمگانے لگے، سفیر عشق محبت رات دن محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سوغات تقسیم کرتا رہا، تقریباً تینتیس سال اسی لگن میں گذرے، کیا کیا معرکے سر ہوئے، کس قدر روشنیاں

WWW.NAFSEISLAM.COM

روحِ عصر اور خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ :

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقدیم بنایا ہے، فطرتِ اسلام انسان کا تخلیقی جوہر ہے، عظمت کا راز اس تخلیق جوہر کی حفاظت اور پاسداری میں ہے، تقربِ خالق کی منزلیں، اطاعت شعاری کے سفر کا حاصل ہیں، یہ رازِ تخلیق جس نے پالیا وہ کامیاب قرار پایا وگرنہ اسفل سافلین کی پستیوں میں غرقاب ہوا، زمانہ گردش کناں ہے مگر اس کی گردش بے مہار نہیں کہ قانونِ فطرت کا حصار ہر وقت باخبر رکھتا ہے، نسل آدم کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان جب بے راہ روی کی دلدل میں اُترنے لگا تو کوئی صاحب بصارت متنبہ کرنے کو موجود تھا، یہ تو ساعتوں کی قسمت ہے کہ کس نے ہدایت کی آواز پر لبیک کہا اور کون گوشِ حق نیوش سے محروم رہا اور انحطاط مسلسل کا اسیر ہوا، عالم اسلام کی سیاسی وعمرانی تاریخ زوال وارتقاء کی کئی داستانوں کی امین ہے، مسلمانوں کی برصغیر آمد سے انگریز حکومت تک کے زمانی سفر کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں، یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ عروج وزوال، یک رخا نہیں ہوتا، عروج بھی ہمہ جہتی ہوتا ہے اور زوال بھی، مسلمان امت نے برصغیر میں ہمہ جہت عروج دیکھا تھا، قوت وطاقت کے تمام مظاہر اُن کی گرفت میں رہے تھے مگر جب پھسلنے لگے تو انحطاط بھی بہر رنگ تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوہ پیمائی کے کامیاب مراحل اس خیال سے غافل کر گئے کہ اگر کہیں پھسلے تو بلندیاں یوں پٹک دیں گی کہ کہیں پیر جمانے کی جگہ نہ ملے گی، یہ تو کنویں کی منڈھیر سے لڑکھنے کی طرح ہے کہ پانی کی تہہ سے پہلے قرار کا کوئی مقام نہیں۔ اس سیاسی زوال کو سہارا صاحبانِ نظر صوفیاء نے دیا ہے، انہوں نے ہی خاک آلود سروں کو سربلندی کی توانائی عطا کی تھی، مقامی آبادی اول روز

سے ہی حسد وتفرت کے الاؤ میں جل رہی تھی اُس نے وسیہ کاری کا کوئی حربہ فروگذاشت نہ کیا تھا، سیاسی پس پائی نے مقامی آبادی خصوصاً ہندو مت کے پیروکاروں کو زیر زمین سازشوں کی تحریک دی تھی، ملفوف جدلیت نے ذہنی انتشار کو جنم دیا تو مادی مع سازی نے یقین کو متزلزل کیا، اس سازش نے جلد ہی جڑ پکڑلی کہ تصوف کے ماءِ زلال میں زہر گھولنے کی کوشش کی گئی، تاریخ برصغیر گواہ ہے کہ بہت سے گروہ میدان میں کود پڑے اور صوفیاء کا لبادہ اوڑھ کر روحِ تصوف کو مادی گرسنگی کا اسیر بنانے لگے، گروہ در گروہ صوفیاء کے لباس میں ایسے لوگ در آئے جنہیں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ "متصوف" کہتے ہیں کہ تصوف کے نام پر جعل سازی کا کاروبار کرنے والے گروہ، انہیں انسانی لباس میں بھیڑیا بھی کہا گیا، ظاہر ہے کہ ان کا رد حق شناس صوفی کے لیے لازم تھا مگر خوف یہ بھی کہ تصوف کے چشمۂ ساقی پر کوئی گندگی نہ گرنے لگے، تصوف کا دفاع اور رواج مگر تصوف کے نام پر فریب دہی کا سد باب، یہ یقیناً مشکل مرحلہ تھا، اسی کے لیے اصحابِ علم درکار تھے جو علم ظاہر سے بھی بہرہ مند ہوں اور طریقت کے محفوظ راستوں سے بھی آشنا ہوں، یہ برصغیر کے معاشرتی بہاؤ میں کودنا بھی تھا اور دامن کو تہہ آب بہتے ہوئی غلاظتوں کے تعفن سے بچانا بھی تھا، حالات کا گھیرا تنگ تھا، نجات کی تدبیریں کمزور اور بے توفیق بھی تھیں مگر اہل نظر کو اسی تنگ نائے کو عبور کرنا تھا، تاریخ کے دامن میں کئی معتبر نام محفوظ ہیں جو نجات دہندہ کے طور پر نمایاں ہیں، ان میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی پوری آب وتاب کے ساتھ دمک رہا ہے، ایک باکمال صوفی جو راہِ تصوف سے آشنا تھا اور منازلِ سلوک سے باخبر بھی تھا۔ جو علم تصوف کی باریکیوں کا عالم بھی تھا اور مطلوب ومقصود سے آگاہ بھی تھا، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے عمر بھر صوفیاء کی منزلت کے ترانے گائے، محافل تصوف کو رونق بخشی، چشتی ذوق کے مطابق سماع کی مجلسوں میں شریک ہوئے، عقیدت مندوں کو راہِ سلوک کی تربیت دی اور مسائل تصوف پر ماہرانہ گفتگو کی مگر اس جذب ومستی کے باوجود ان فریب خوردہ اور جاہل صوفیوں کو قریب نہ آنے دیا جن کے بے لگام کلمات اور بے ترتیب اعمال، دین اسلام کو داغدار کر رہے تھے، یہ وقت کا تقاضا تھا اور روحِ عصر کی پاسداری

WWW.NAFSEISLAM.COM

تھی، ایک ہاتھ میں شریعت کا پرچم تھاما تو دوسرے ہاتھ سے طریقت کا علم بلند کیا، اس طرح خواجہ بلند اقبال بقول امام مالک رضی اللہ عنہ، شریعت وطریقت کے اتحاد کے باعث بن کر کامیاب ہوئے، یہ نہایت درجہ رفعت فکر کا مظاہرہ ہے وگرنہ بڑے بڑے حالات کے دھاروں میں بہہ جاتے ہیں خواہ اُن میں ناپسندیدگی کا ہر عنصر موجود ہو، آپ کس طرح اس آزمائش سے کامیاب گذرے اور کیا کیا طریقہ نجات استعمال کیا اسی کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے۔

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دوسری رکاوٹ آپ کا مکانی پس منظر تھا، ایک غیر معروف علاقہ جہاں نسبتاً تہذیب وثقافت کے نئے رجحانات کم کم اثر انداز ہوئے تھے، مختلف معاشرتی زنجیروں میں جکڑا ہوا، ریاستی پس منظر جو انگریزی سامراج کے زیر نگیں بھی تھا اور ریاستی آداب کا اسیر بھی تھا قبائلی انداز کا معاشرہ جہاں علمی درسگاہیں خال خال تھیں، پھر ایک بستی جو ماضی کی کوئی ارفع نسبت بھی نہ رکھتی تھی، صاحبزادہ سید خورشید گیلانی مرحوم کا ہم تذکرہ کر چکے کہ ان کے نزدیک گڑھی اختیار خان کی حالت کیا تھا اور پھر اندازہ لگائیے کہ ایک مرد حق آگاہ کا وجود کس طرح گمنام پستیوں کو تاریخ کا روشن باب بنا دیتا ہے، صاحبزادہ مرحوم کی زبانی ہی سنئے، پہلے چاچڑاں:

''دریا کے کنارے آباد چاچڑاں کی بستی کو کون جانتا تھا مگر خواجہ فریدؒ کی ذات اسی چاچڑاں کا تحفہ ہے جس کی شہرت آج بھی نصف النہار پر ہے''۔ پھر گڑھی اختیار خان ''لوگوں کے نزدیک گڑھی اختیار خان ایک قصبہ ہے، اہل نظر اس میں ایک جذبہ دیکھتے ہیں معرفت اور محبت کا جذبہ! عمومی سطح پر گڑھی اختیار خان ایک بستی ہے مگر اہل دل کے لیے ایک کیفیت اور مستی ہے، بظاہر دیکھنے میں گڑھی اختیار خان ایک گاؤں ہے مگر درد والوں کے لیے محبت کی چھاؤں ہے جہاں دور دراز کی اوجھڑ مار کر آنے والے دم لیتے اور سکھ پاتے ہیں اور یہ ساری رعنائی خیال اس ایک شخص کے تصور سے ہے جو عمر بھر درد کی دولت تقسیم کرتا رہا جو لوگوں میں ذوق ابھارتا رہا، جو عشق کا درس دیتا رہا جو اپنے سوز میں

ہر ایک کو شریک کرتا رہا اور جو اپنے ساز زندگی پر حسن کے نغمے ترتیب دیتا رہا اور ان نغموں سے دل کے تاروں میں اب تک تھرتھراہٹ ہے، اگرچہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے متعدد نمایاں پہلو ہیں، ایک صوفی بزرگ، پختہ کار شاعر، روشن خیال عالم دین، یہ سب ان کی طرحدار شخصیت کی جھلکیاں ہیں مگر میرے نزدیک ان کا سحر البیان خطیب ہونا بہت ممتاز اور روشن تعارف ہے اور ان کی حکایت میں تصوف، شعر و سخن کی چاشنی اور علم کا وقار بھی موجود ہے''۔ (خواجہ محمد یار فریدی۔ سحر البیان خطیب)

مکانیت کی تنگ نائے بڑے بڑوں کے حوصلے پست کر دیتی ہے مگر تاریخ انسانی ایسے متعدد ناموروں سے مزین ہے جن کی بلند حوصلگی آہنی حصاروں میں بھی راستے تراش لیتی ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی بلند ہمت بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے چوگردے کو بھی بقا کی تازگی بخش دی ہے۔

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کو زندگی میں دو سہولتیں بھی حاصل رہیں ایک یہ کہ آپ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اولین حوالہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی ہے، باب علم کی نسلی نسبت وفورِ علم پر دلالت کرتی ہے توحید کردار کا تعلق تحقیق عقیدہ اور اعلائے کلمۂ حق کی سطوت بھی رکھتا ہے، برصغیر میں اشاعت دین کی خاطر نقل مکانی، مہاجرت کے اعزاز سے بھی بہرہ مند ہے، تو قطب شاہ سے تعلق جواں ہمتی کا مظہر بھی ہے، قطب شاہ کے حوالے سے کہا گیا ہے۔

''برصغیر میں حضرت قطب شاہ کی شہرت کا باعث ان کی ولایت یا مرتبہ قطبیت پر فائز ہونا نہ تھا بلکہ آپ نے جہاد بالسیف کیا اور کئی ہندو راجاؤں کو شکست دے کر اسلام کے سائے میں لائے، آپ بڑے مجاہد تھے باقاعدہ ایک لشکر لے کر ہرات کے راستے بغداد میں ہندوستان آئے اور پنجاب کے اہل ہنود کے ساتھ کافی عرصہ معروف جہاد رہے''۔

معلوم ہوا دین مبین کے لیے والہانہ تڑپ آپ کو وراثت میں ملی تھی، جہاد بالسیف سے

جہاد بالقلم اور پھر جہاد باللسان آپ کا زندگی بھر معمول رہا اور عمرانی تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ قلم و زبان کی قوت اثر آفرین ہو جائے تو سر ہی نہیں جھکتے دل بھی جھک جایا کرتے ہیں اور یہ فتوحاتِ قلوب بڑی دیرپا ہوتی ہیں۔

اس خاندانی شرف اور نسلی حرارتِ یقین کے ساتھ آپ کو یہ شرف بھی نصیب ہوا کہ آپ نے تربیت روح اُس عبقری وجود سے حاصل کی جو اپنے دور کا ہی نہیں آنے والے ایام کا بھی امام ہے، خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آتش عشق سے ایسی شمع فروزاں کر دی جو عمر بھر توانائی کا وسیلہ بنی، اس قدر اثر پذیری عموماً مریدوں میں کم ہوتی ہے مگر آپ نے تو مرشد کا رنگ یوں جذب کیا کہ امتیاز من و تو ہی مٹ گیا اور اکثر دانشور پیر و مرید کے کلام میں اسی قدر مشابہت پانے لگے کہ تفریق مشکل ہوگئی۔

اس مختصر جائزے کے بعد یہ دعویٰ بلا خوفِ تردید کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ محمد یار فریدیؒ اپنے عہد کے وہ بلند مرتبت بزرگ ہیں جن کی شخصیت کے سائے ہر جانب فیض بخشی کا معمار ہیں۔ یقیناً آپ نابغہ عصر تھے اور محافظ دین و ملت تھے۔

تیس سال یہ سفیر عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوہساروں، وادیوں اور فضاؤں کو نغمہ عشق سے وارفتہ بناتا رہا، آخر ۱۴ رجب المرجب ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) پیر کی رات یہ شمع دین محمدیؐ تہہ خاک نہاں ہوگئی، حیات کا سفر موت ہی پر اختتام پذیر ہوتا ہے کہ یہی قانونِ قدرت ہے، محبت کی حقیقی دولت، زادِ سفر بنانے والے دنیا سے جاتے بھی اس انداز سے ہیں کہ زمین میں ایک قبر ہی نہیں بنتی، لاکھوں دلوں کو مزارِ عقیدت بنا کر اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں، یہ تو اولیاء اللہ کا عمومی معاملہ ہے مگر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے تو حیاتِ ابدی کا عملاً مظاہرہ اس دنیا ہی میں کر دکھایا، لاہور وفات ہوئی تھی اس لیے لاہور میں ہی دفن کیے گئے، حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ وہ پہلا مقام تھا جہاں رونق مزار ہوئے، پھر وہاں سے گڑھی اختیار خان منتقل کر دیئے گئے اور پھر ۱۴ سال بعد موجودہ مزار میں دفن کیے گئے۔ پروفیسر نذر خلیق لکھتے ہیں:

"۶۷ سال کی عمر میں ۱۹۴۸ء میں وفات پائی انہیں حضرت میاں میرؒ کے

آستانہ عالیہ کی دیوار کے ساتھ بیرونی جانب امانتاً رکھا گیا، تاہم چھ ماہ بعد ان کو گڑھی اختیار خان موجودہ روضۂ مبارک سے متصل جگہ میں سپردِ خاک کیا گیا، ۱۴ سال بعد موجودہ مزار مبارک میں منتقل کیا گیا''۔

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی۔ احوال و آثار، بانگ سحر ۹۷)

ڈاکٹر ناصر وحید نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔

(تذکرہ علماء اہل سنت و جماعت، ماہنامہ عرفات، اولیاء بہاولپور)

تمام ہم عصر تذکرہ نگار بھی روایت وصال و تدفین کے ان مشتملات پر متفق ہیں، ۶۷ سال عمر پر سب ہم خیال ہیں، لاہور میں انتقال ۱۹۴۸ء کا سن کہ قیام پاکستان کے بعد کا متصل زمانہ تھا، پھر یہ کہ ان دنوں لاہور مہاجرین کے قافلوں سے اٹا پڑا تھا۔ ایک ہنگامی صورت حال طاری تھی کہ والٹن کا کیمپ مہاجرین کی آماجگاہ تھا، ان مہاجروں میں بچے، بوڑھے، مرد و عورت سبھی شامل تھے، ان میں زیادہ تر لوگ زخمی اور دل گرفتہ تھے، ایسے منتشر معاشرتی ماحول میں ایک بلند پایہ مردِ درویش راہی ملک عدم ہو جائے تو فوری فیصلوں کی گنجائش نہیں ہوتی، یہ انہیں ہنگامی کیفیات کا نتیجہ تھا کہ حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کو لاہور ہی دفن کیا گیا، حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ ایک قادری بزرگ تھے جن کی عشق و وارفتگی کی داستانیں اہل لاہور کو ازبر تھیں، پھر یہ کہ آپ ایک پختہ کار شاعر بھی تھے اس لیے انہیں کے جوار کو ترجیح دی گئی کہ قرب کی سعادت پانے والا بھی صاحب دل بزرگ اور کہنہ عشق شاعر تھا، چھ ماہ یہ قربت حاصل رہی مگر یہ استحقاق گڑھی اختیار خان والوں کو حاصل تھا کہ یہ مرکز انوار اُن کے درمیان رہے اس لیے عقیدت مندوں نے حق قرابت ادا کر دیا، چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا مگر انتقال مکانی کے لمحے کسی بوسیدگی کے مظہر نہ تھے، یہ عظمت وجود کا پہلا حوالہ تھا ابھی خرقِ عادت کا ایک اور سہانہ منظر منتظر تھا، چودہ سال کا طویل عرصہ کہ فریدی عظمتوں کے حامل وجود کو ایک اور مقام پر منتقل کر دیا گیا، قبر کشائی ہوئی، خاص و عام نے ''ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما'' کی صداقت کو بچشم عقیدت دیکھا، دیکھنے والے حیرت میں تھے کہ اتنا عرصہ بیت گیا، خاک نشینی کا دورانیہ اتنا طویل کہ انسانی جسم،

WWW.NAFSEISLAM.COM

خاک ہو جانا حقیقت، مگر یہاں کیا ہوا؟ نہ قلیل عرصہ اور نہ کثیر دورانیہ اثر انداز ہوا، یہ اعلان تھا کہ عشق و محبت میں فنا دراصل بقا کی ضمانت ہوتی ہے، یہ مزار آج بھی اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ حیرت بالائے حیرت یہ کہ صاحب مزار کو شروع ہی سے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا، ایمان پختہ ہو یقین محکم ہو تو ماضی و حال کی طرح مستقبل بھی روشن ہو جاتا ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے ان نقوشِ دوام کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا تھا، فرما گئے تھے:

وہ خاکسار ہوں برہم مرا مزار رہا

ایک مرتبہ پھر اہل جہاں پر واضح ہو گیا کہ حیاتِ طیبہ کے حق دار ایسے وجود زندہ و تابندہ ہوتے ہیں،

حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے ستر سٹھ سال کس تگ و دو میں گزرے، آپ نے حیاتِ مستعار کو کیسے بسر کیا، معاشرتی، سماجی، دینی اور علمی میدانوں میں کیا کیا کارنامے انجام دیئے؟ یہ قدرت کے انعامات ہوتے ہیں اور انعامات سے صرفِ نظر خسارے کا سودا ہے۔

ہم کوشش کریں گے کہ ان ماہ و سال کے حوالے سے درخشندہ نقوش کو جزوی طور پر ہی سہی ضرور محفوظ کر لیں تاکہ نسل در نسل ان کی تابانی قائم رہے، اس کاوش میں ہمیں کس قدر کامیابی نصیب ہوتی ہے اس کا فیصلہ قارئین کا حق ہے۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ہی واضح کر دیتی ہے کہ آپ کا وجود متنوع جہات کا امین تھا، آپ ایک خوش نوا واعظ تھے، اثر آفرین مبلغ تھے، حرف و صوت میں ہنگام پیدا کرنے والے شاعر تھے، راہِ حیات کے سچے راہنما تھا، دل و نظر کو تطہیر آشنا کرنے والے صوفی تھے، اپنوں اور بیگانوں کو سلک محبت میں پرونے والے ہمدرد انسان تھے، قومی و ملی مسائل میں با اعتماد راہنمائی عطا کرنے والے قائد تھے اور سب سے بڑھ کر فیض بخش مسند نشین تھے، کوشش کریں گے کہ ان روشن حوالوں میں سے چند ایک پر مختصر مگر جامع گفتگو پیش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نشر خیر کا سلیقہ عطا فرمائے۔ آمین۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ

کی کتابِ حیات کے چند اوراق

واعظ کی حیثیت سے:

وعظ کا لغوی مفہوم نصیحت کرنا، نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے اجتناب کی تحریک پیدا کرنا ہے، اہل لغت نے اس کلمہ سے ہر دو اطراف کے معانی اخذ کیے ہیں، ایک یہ کہ گفتگو یا تحریر میں خیر کا یوں تذکرہ کرنا کہ سامعین و قارئین کے اندر خیر پر عمل کرنے یا اسے بجا لانے کا ولولہ پیدا ہو جائے، امام راغب الاصفہانی کے نزدیک اس میں زجر و تنبیہ کا عنصر ہونا چاہیے تا کہ بدی سے خوف پیدا ہو جائے، بدی سے اجتناب اور نیکی کی ترغیب وعظ کے مفہوم کے اطراف ہیں، مقصود یہ ہے کہ نیکی کے داعیے جنم لیں اور برائی سے نفرت کو تحریک ملے، وعظ ہو یا تذکیر و نصیحت یہ انسانی معاشرے میں ہمیشہ سے ہی انسانی زندگی کو سنوارنے اور حدود آشنا رکھنے کے لیے لازم رہے ہیں، دنیا کی تاریخ کا کوئی ورق اٹھائیے اور انسانی آبادی کے کسی مظہر پر غور کیجیے، راہنما، راہبر، ناصحین اور واعظین کسی نہ کسی روپ میں اصلاحِ احوال کی کوششوں میں مصروف ملیں گے، یہی وہ عمل خیر ہے جس سے معاشرہ لا اُبالی یا بے محابہ نہیں ہوتا، انبیاء کرام علیہم السلام کی تمام تر تبلیغی مساعی اس نصیحت آفروزی کی لائق تقلید مثال ہے، قرآن مجید نے جب حضرت لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو نصیحت کا ذکر کیا تو نصیحت کے کلمات کے درمیان یہ ارشاد فرمایا:

WWW.NAFSEISLAM.COM

"وَهُوَ يَعِظُهُ" "اور وہ اُسے وعظ یعنی نصیحت کر رہے تھے"۔ (لقمان ۱۳)

اس سے ظاہر ہوا کہ زندگی کی صداقتوں اور کائنات کی حقیقتوں تک رسائی دلانے کی کوشش دراصل وعظ ہے، وعظ صرف الفاظ و تراکیب کے حسن و جمال کا نام نہیں، یہ حقیقتاً حقائق کے ادراک کی طرف راہنمائی ہے اور اس میں نصیحت آفروزی کا کیف لازم ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام دین کے حقائق کے علمبردار بن کر آئے تھے اور سب رسولان گرامی علیہم السلام کی تبلیغ کا مرکزی نقطہ وعظ ہی تھا جو انسانی وجود کو بدی کی آلائشوں سے پاک کرے اور حقائق کو دریافت کرنے اور تسلیم کرنے کا حوصلہ اور ہمت عطا کرے، قرآن مجید نے انبیاء سابقین علیہم السلام کا ذکر انہیں لاحقوں کے ساتھ کیا ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم تک پیغام حق پہنچایا تو یوں خطاب فرمایا:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ" (الاعراف ۶۲)

"میں تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچاتا ہوں اور تم کو نصیحت کرتا ہوں"۔

واضح ہو گیا کہ ابلاغِ رسالت دراصل نصیحت آفروزی ہی ہے کہ مقصود خیر کی افزائش اور بدی سے اجتناب ہے، حضرت ھود علیہ السلام کا ارشاد بھی اسی طرح کا ہے فرمایا:

"اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ" (الاعراف ۶۸)

"میں تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے امانت دار نصیحت کرنے والا ہوں"۔

معلوم ہوا کہ تبلیغ کا مقصود نصیحت ہی ہے اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جو تبلیغ، وعظ و نصیحت کے جوہر سے محروم ہو وہ انسانیت کے فلاح کے لیے نہیں، کسی مادی یا ذاتی فائدہ کے لیے ہی ہوگی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبلغین کے لیے اُسوہ حسنہ ہیں، تاریخ رسالت شاہد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قوت و عزم کے ساتھ تبلیغ فرمائی، نہ ہی تسلیم کرنے والوں کی کسی خواہش کو یوں پذیرائی بخشی کہ صداقت ہر کوئی حرف آئے اور نہ ہی معاندین کی کسی قوت سے مرعوب ہو کر حقائق سے انحراف ہوا، سچ مسلسل سچ رہا اور حقیقت ہر وقت پیش نظر

WWW.NAFSEISLAM.COM

رہی، اگر اشاعت اسلام کے دورِ اول کو واعظین ہر لحہ راہنما بناتے رہیں تو وعظ وتذکیر کے ضوابط کی تحدید مشکل نہیں مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ ہر مبلغ کو:

- عالم ہونا چاہیے، حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ ونصیحت کے ذکر کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا تھا۔

"وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ". (الاعراف ۶۲)

''اور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ علم رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے''۔

واضح ہوگیا کہ تبلیغ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ مبلغ برتر علم کا حامل ہو کہ علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام علم ومعرفت کی اُس معراج پر ہوتے ہیں جو امت کو نصیب نہیں ہوتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر تو اس قدر فضل رہا کہ:

"عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (النساء: ۱۱۳)

''اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پروردگار نے آپ کو ہر وہ علم سکھایا جو آپ نہ جانتے تھے''۔

- اس علم پر عامل ہونا چاہیے جو اسے عطا کیا گیا۔

اس لیے بے علمی کی اساس پر وعظ وتبلیغ کو روک دیا گیا اور صاحب علم پر لازم کیا گیا کہ وہ صرف معلومات کا مصدر بننے کے بجائے علم کی حقانیت کا معترف بھی ہو، اس لیے تہدیداً فرمایا گیا۔

"يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ". (الصف: ۲)

''اے ایمان لانے والو! کیوں کہتے ہو جو نہیں کرتے''۔ پھر سزا بھی سنا دی گئی

"كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ". (الصف: ۳)

''کیسی سخت ناپسند ہے اللہ تعالیٰ کو یہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو''۔

- امانت دار ہونا چاہیے۔

مراد یہ ہے کہ پیغام بلاکم وکاست پہنچ جانا چاہیے، کسی صورت پسند یا ناپسند تبلیغ میں حائل نہ

ہونی چاہیے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے بار بار یہ اعلان کیا۔

"اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ"۔ (الشعراء:۱۰۷)

"بے شک میں تمہارے لیے رسولِ امین ہوں"۔

یہ اعلان حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی اپنی قوم کے سامنے پیش کیا، امانت قول کی ہو یا عمل کی، ہر حال میں مبلغ پر لازم ہے۔

◀ نڈر اور بے باک ہونا چاہیے۔

فرمانِ الٰہی ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ"

(الاحزاب:۳۹)

"بے شک جو اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچاتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے"۔

تبلیغِ حق اور ابلاغِ صداقت میں خوف کا کوئی عنصر شامل ہو جائے تو مقصودِ تبلیغ بے توقیر ہو جائے گا، اس لیے مبلغ کو اعلائے کلمۂ حق کے لیے بے باک ہونا چاہیے، جب مبلغ کسی خوف سے گھبرا جائے تو بیچ و اضطرار ہو جاتا ہے اور تبلیغ اپنا ہدف حاصل نہیں کر سکتی۔

◀ ہمہ عدل ہونا چاہیے۔

یعنی مبلغ کو ہر صورت عدل و انصاف کا حامل ہونا چاہیے، نہ ہی اُسے حصولِ مدعا کے لیے حد سے تجاوز کرنا چاہیے اور نہ ہی تعبیرِ مدعا کے لیے کسی صداقت کا خون کرنا چاہیے، ارشاد الٰہی ہے:

"وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا"۔ (الانعام:۱۵۲)

"اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو"۔

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

- عمدہ اخلاق کا حامل ہونا چاہیے۔

مبلغ چونکہ مخاطبین اور سامعین کی کردار سازی کر رہا ہوتا ہے اس لیے اُسے خود کردار و سیرت کے اعلیٰ مقام پر ہونا چاہیے، دل جیتنے ہیں اس لیے نرم دلی، ہمدردی اور دوستداری کا رویہ ضروری ہے، قرآن مجید نے واضح طور پر اس سمت راہنمائی فرمائی ہے، فرمایا:

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ"۔ (النحل:۱۲۵)

"اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ"۔

بلکہ یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ ترش رو اور سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے بھاگ جاتے۔ (آل عمران:۱۵۹)

واعظ کے لیے کون سے اصول وضوابط کی پاسداری ضروری ہے، اس پر علماء امت نے بہت کچھ لکھا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خیال میں مبلغ کے لیے درج ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہیے مثلاً وہ:

- ☆ احکام اسلام کا مکلف ہو یعنی عاقل وبالغ ہو۔
- ☆ عادل اور نیک ہو۔
- ☆ مفسر قرآن ہو یعنی قرآن کے معانی بیان کر سکتا ہو۔
- ☆ محدث ہو یعنی احادیث سے استنباط کا اہل ہو۔
- ☆ اخبارِ سلف سے واقف ہو یعنی عالم ہو۔
- ☆ فصیح اللسان ہو کہ سامع تک بات پہنچا سکے۔
- ☆ موقع اور محل کی سازگاری کا اہتمام کرے۔
- ☆ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہو۔

(تفصیل کے لیے اُردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۲۰ عنوان مواعظ)

اس کے علاوہ سامعین کی توجہ اور ضرورت کا خیال بھی ضروری ہے۔

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ واعظ خوش بیان تھے، آپ کے مواعظ میں مندرجہ بالا

WWW.NAFSEISLAM.COM

شرائط بہر رنگ موجود تھیں، اس لیے تو ان کی اثر آفرینی کا ہر اُس انسان کو اعتراف ہے جو کبھی بھی ان محافل میں شریک رہا ہے، بہتر ہوگا کہ ان بنیادی اوصاف کا جائزہ لیا جائے جو ایک واعظ کے لیے لابدی ہیں۔

واعظ کے لیے عالم ہونا بنیادی شرط ہے وگرنہ وہ قصہ کو بن کر رہ جائے گا، وہ واعظین جو علم میں ثبات نہیں رکھتے، روایات کو یوں خلط ملط کر دیتے ہیں کہ استخراج کا سارا عمل بے توفیق ہو جاتا ہے، غلط استنباط، نادرست روایات اور ناقابل اعتماد استشہادات مواعظ کے مقصود کو دھندلا دیتے ہیں، یہ اس لیے ہوتا ہے کہ واعظ خود صاحب علم نہیں ہوتا، چند تقریروں کو یاد کر کے کسی محفل میں ماحول اور سامعین کی مناسبت کا خیال کیے بغیر بیان کر دینا وعظ نہیں ہوتا، اس سے رغبت کی بجائے بے دلی بلکہ نفرت پیدا ہوتی ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے علم سے رغبت، تربیت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، مقامی علماء سے بھرپور استفادہ کرنے کے بعد چاچڑاں شریف کے معروف دینی مدرسہ میں ماہر اساتذہ کی زیر نگرانی آپ نے علم حاصل کیا تھا، یہی وجہ تھی کہ مبادیات علم اور مشتملات تخصص کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، یہ الگ بات کہ آپ کا مقصود اسناد جمع کرنا نہ تھا کہ ان کی اساس پر طلب رزق کا حیلہ کیا جائے، ترتیب اسناد کا جدید رنگ تو مادی حوائج کا اثر ہے، خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کا دور، اسناد کی بجائے صلاحیت علم اور نسبت تلمذ سے معروف تھا، آپ نے خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ علم کو واردات بنایا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کے مواعظ جاذب توجہ بھی تھے اور کردار و سیرت میں انقلاب خیزی کے مظہر بھی، سید خورشید گیلانی لکھتے ہیں:

''خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نہ تو باقاعدہ کسی جامعہ کے فارغ التحصیل تھے، نہ انہیں اُردو ادب کا ماحول میسر آیا نہ ہی وہ شعر و سخن کی محفلوں کے باضابطہ حاضر باش تھے مگر ان کے فارسی کلام میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے، ان کی اُردو سے دلی اور لکھنو کی مہک آتی ہے، پنجابی اُن کی اپنی زبان نہ تھی مگر ٹھیٹھ پنجابی

علاقے ان کی خطابت کی جولاں گاہ تھے، رہی سرائیکی تو ظاہر ہے وہ گھر کی لونڈی تھی، مسجد وزیر خاں کا کوئی تاہل ذکر جلسہ ان کی شمولیت کے بغیر ادھورا سمجھا جاتا تھا، حزب الاحناف لاہور کے سالانہ جلسے آپ کی خطابت سے گرم ہوتے جہاں بڑے بڑے اہل زبان موجود ہوتے، جامعہ عثمانیہ کے اجلاس میں آپ کی تقریر حاصل محفل سمجھی جاتی تھی، متحدہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا جو آپ کی خطابت سے نہ گونجا ہو۔

(پھر صاحبزادہ صاحب نے نواب بہادر یار جنگ، مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ذکر کیا ہے کہ یہ سب اُسی دور کے نامور مقرر تھے)۔

''لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی خطابت نہ صرف برقرار رہی بلکہ جوبن پر رہی، کسی کا عکس نہ ٹھہر سکا جو ان کے حسن خطابت کو گہنا سکے''۔ (حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ سحر البیان خطیب)

رابہ رشید محمود نہ صرف یہ کہ مدحت رسالت کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں بلکہ آپ کی شعری حوالے سے نقد ونظر نے ہر صاحب علم سے خراج لیا ہے، آپ کی ایک مستند رائے سنئے فرماتے ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''جن لوگوں نے حضرت قبلہ محمد یار فریدی قدس سرہ السامی کی تقاریر سنی ہیں وہ زبان میں جادو کے مفہوم سے آگاہ ہو چکے ہیں، مخالفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا، ان کے حضور سننے والوں کے سر نیاز خم ہو کر رہتے تھے''۔ (آشناء راز)

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر صرف لفظوں کی حسین در وبست ہی نہ تھی، ان کے اندر علمی وجاہت پوری شان سے موجود ہوتی تھی، آپ کا علم چونکہ قیل وقال سے گزر کر اشاراتِ وجدان کو چھونے لگا تھے، اس لیے اس سے سامعین کی وارفتگی کو مہمیز لگتی تھی،

خوبصورت استدلال، برمحل ازالۂ اشکال اور سامعین کی علمی تشنگی کا احساس، آپ کی تقریر کو سماعتوں کا رس ہی نہیں دلوں کا گداز بھی عطا کرتی تھی۔

ایک نہایت نامانوس ماحول تھا، نظریاتی اختلاف کی ہماہمی تھی مگر محفل لگ گئی، آپ کے ساتھ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی پیر سید مظفر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے صاحبزادے غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ تھے، دونوں کا خطاب ہوا پھر آپ سٹیج پر آئے تو اس خیال سے کہ مخالف، مخالفت کا کوئی رُخ ضرور ظاہر کرے گا، آپ نے وعظ کو قرآن مجید سے استشہاد تک محصور رکھا، "یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ" "یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں"۔ تلاوت کی اور فرمایا:

"منافقین حضور ﷺ سے دھوکہ کرتے تھے تو ذاتِ حق نے فرمایا کہ وہ اللہ سے دھوکہ کرتے ہیں مگر یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے دھوکہ کرتے ہیں، دوستو نبی ﷺ کو خود ہی ذاتِ حق فرمایا: میں نہیں کہتا خدا سے دھوکہ کرتے ہیں خداوند قدوس خود ہی فرماتا ہے، خداوند قدوس اپنے محبوب پاک ﷺ کو جو چاہے کہے ہم تو خدا کو خدا اور اس کے محبوب ﷺ کو محبوب ہی کہتے ہیں"۔

اس بیان میں اپنا مقصود بھی واضح کر دیا ہے اور توازنِ عقائد کا درس بھی دیا ہے، یہی مطلوب عدل ہے جو ہر واعظ کے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا علم صرف مواعظ کا وسیلہ نہ تھا، آپ کی اپنی ذات بھی اس علم سے منور تھی کہ آپ ایک صاحب عمل عالم تھے، ظاہر ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو تصوف کا گداز قلب ونظر کو نہیں گرماتا، آپ تو ہمہ تن صوفی تھے جس کے وجود میں علم کی مستی، عشق کی سرمستی میں مدغم ہوگئی تھی، کہہ سکتے ہیں ان کا ایمان ویقین، محبت کے کیف سے دوآتشہ ہو چکا تھا اسی لیے تو لفظ لفظ میں حرارت آ گئی تھی، سامعین ایک ایک جملے پر از خود رفتہ ہوئے جاتے تھے حتیٰ کہ اصحابِ علم ودانش بھی اس وجد آفرینی کے قائل تھے، مشہور صاحب قلم ارشاد احمد

عارف کہتے ہیں :

''(خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے) حصولِ علم کے بعد تبلیغ دین اور فروغِ حُبِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور ریاست بہاولپور میں دھوم مچا دی، آپ اپنی تقریروں میں قرآنِ مجید اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاوت اس خوش الحانی سے کرتے کہ پوری محفل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی، اپنی سحر آفرینی تقریروں میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی اور سرائیکی اشعار کا برمحل استعمال اس قدر شیریں لسانی سے کرتے کہ خطاب دو آتشہ ہو جاتا، آہستہ آہستہ آپ پنجاب اور برصغیر کے کونے کونے میں پہنچے اور اپنی وجد آفریں تقریروں سے لوگوں کو گرمایا اور تڑپا دیا..... لاہور، اجمیر، امرتسر، دہلی اور دیگر مقامات پر بزرگانِ دین کے اعراس اور دینی محفلوں میں آپ کا خطاب خصوصی توجہ اور اشتیاق سے سنا جاتا اور سامعین مہینوں اس کی لذت اور حلاوت محسوس کرتے تھے، آپ لاہور کی مذہبی انجمن نعمانیہ کے صدر بھی رہے، دارالعلوم حزب الاحناف کے سالانہ جلسہ اور عرس حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے موقع پر حاصل محفل ہوتا تھا اور ملک کے طول وعرض سے آئے سامعین اس سے محظوظ ہوتے۔(عاشق رسول)

سوال یہ ہے کہ واعظین کی فہرست تو ہر دور میں طویل رہی ہے۔ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک واعظ تھے مگر وہ کون سا تخصص تھا جو آپ کو سب سے ممتاز کر رہا تھا، اس وجہ شہرت وعزت کے اسباب متعدد تھے مثلاً

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ ایک مستند عالم تھے اس لیے آپ کے وعظ قرآن وحدیث، اقوال صحابہ اور فرمودات اولیاء سے مملو ہوتے تھے، بڑے بڑے عالم اور صاحب دانش کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملتا تھا، اس کی تائید ہم عصر صاحب سجادہ حضرت شاہ مغفور القادری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمایا ہے۔ سید فاروق القادری لکھتے ہیں :

WWW.NAFSEISLAM.COM

''راقم السطور کے والد گرامی حضرت شاہ مغفور القادری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس کے لیے کتاب وسنت میں مضبوط دلیل موجود نہ ہو، ان کے مطابق دورانِ وعظ آپ پر علم ومعرفت کی ایسی پلٹ ہوتی جسے آمد کی بجائے وارداتِ غیبی یا فیضانِ الٰہی کہنا زیادہ صحیح ہے''۔

(حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی یہ منزلت اُس فیضان کا صدقہ تھی جو انہیں دربارِ رسالت اور بارگاہِ اولیاء سے حاصل ہوا تھا، بشیر حسین ناظم رقمطراز ہیں:

''حضرت محمد یار بندۂ احمد مختار (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی مبدء فیاض نے شیریں زبانی اور رنگین بیانی کے بے بہا جوہر عطا کیے ہوئے تھے اور سرکارِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حضوری کا شرف حاصل تھا، خواجگانِ چشت کی فیاضیوں نے حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ میں سینکڑوں خوبیاں پیدا کر دی تھیں جن میں سے خوبیٔ سوز وگداز برذروہ معراج تھی، وہ بولتے تو سامعین کے دلوں کو برف کی طرح پگھلا دیتے، احجار کو پھول بنا دیتے، سنگ کو خاصیت موم بخش دیتے اور بعض دفعہ بے زبانی زبان بن جاتی تو لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے''۔

(عبدالنبی المختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں کچھ تذکرے)

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی اثر آفرینی آپ کی اُن ریاضتوں کا نتیجہ تھی جو اتباعِ شریعت سے انہیں حاصل ہوا تھا، آپ صرف قال کے علمبردار نہ تھے حال کا جذب بھی آپ کو ترپائے رکھتا تھا جو سراسر اتباعِ شریعت کا فیضان تھا۔

''روایت ہے کہ ایک مرتبہ اجمیر شریف سے واپس آرہے تھے کہ نزلہ، کھانسی اور بخار کی شدت کا شکار ہو گئے، ڈاکٹر صاحبزادہ علی حسن شاہ کا علاج ہوا مگر آفاقہ نہ ہو رہا تھا، ڈاکٹر کا مشورہ تھا کہ احتیاط کی جائے، کہنے لگا ''حضور صبح و شام حاضری دیتا ہوں مگر سرکار غریب نواز بہت کمزور ہو گئے تھے، ہر نماز کا نیا

وضو فرماتے تھے، کمزوری کے باوجود کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے، مریدین نے بہت دفعہ عرض کی، حضور بیماری کی حالت میں بیٹھ کر بھی نماز ادا ہو جاتی ہے مگر سرکار نے فرمایا کہ اگر عصا پکڑ کر کھڑا ہونے کی طاقت ہو تو پھر بھی نماز کھڑے ہو کر پڑھو، ایک دن ڈاکٹر صاحب نے عرض کی حضور آپ کسی سے گفتگو نہ کریں، خاموش رہیں، چارپائی پر حرکت بھی نہ کریں تو سرکار دل میں سوچنے لگے جس کا ذکر آپ سرکار نے ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد مریدین سے کیا کہ "سید زادہ مسلمان ہے، زبان سے نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو۔ آپ سرکار نے ڈاکٹر کو فرمایا نماز پڑھنا ضروری ہے اور نماز کے وقت مجھ میں خود ہی طاقت آجاتی ہے..... کوٹ مٹھن میں ایک حافظ صاحب نے عرض کیا کہ منت مانگی تھی قرآن پاک یہاں سناؤں گا مگر کوئی جگہ خالی نہیں فرمایا: میں کمزور تو ہوں، تین دن یہاں قیام کرنا ہے اگر تم تین دن میں سنا سکتے ہو تو میں ان شاء اللہ حاضر ہوں اس نے دس پارے روزانہ منزل سنائی اور سرکار نے کمزوری کی حالت میں کھڑے ہو کر سنا، بہت کہا گیا کہ حضور بیٹھ کر سن لیں آپ کمزور بہت ہیں فرمایا کہ قرآن تو کھڑا ہو اور میں بیٹھ جاؤں کیا یہ بے ادبی نہیں"۔

اس محنت طلبی سے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے ذوقِ عمل اور شوقِ عبادت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

آپ نے وعظ و تبلیغ کو دنیا داری کی آلودگی سے ہمیشہ بچائے رکھا جب مصلحت پسندی اور مادی خواہشات، واعظ کو اسیر کر لیں تو آوازۂ حق، تعمیر سیرت کا پیغام نہیں رہتا، آج اگر ہر خاص و عام کو گلہ ہے کہ تقریروں میں للّٰہیت کا خلوص نہیں رہا تو اس کی وجہ بھی یہی مادہ گردی ہے، دل سے اٹھنے والی لہر دل پر دستک دیتی ہے اگرچہ اُس کا اظہار کس قدر سادہ ہو، ہاں اگر خلوص، روحِ کلمات ہو جائے اور کلمات کی ادائیگی بھی باسلیقہ ہو تو قلب و نظر میں رُستاخیزی کا سماں ہوتا ہے، ایسے مناظر ہر کہیں نہیں ہوتے اس کے لیے قلب تپیدہ درکار ہے، آیئے فریدی گہر فشانی کا ایک منظر دیکھیں:

اسی کو کہتے ہیں "از دل خیزد بر دل ریزد" اور یہ صلاحیت صرف اُس کا مقدر ہے جو خلوص کا پیکر ہو اور اعلائے کلمہ حق میں نڈر اور بے باک ہو۔

اسی طرح کی حکایت ڈاکٹر ناصر وحید نقل کرتے ہیں، کہتے ہیں:

"آپ کی زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان بھی چند فقرے سن کر موم ہو جاتا تھا، آپ کی خطابت کا دور دور چرچا تھا، لوگ بڑی عقیدت اور توجہ سے آپ کا وعظ سنتے تھے، حضرت علامہ غلام مہر علی گولڑوی اپنی کتاب الیواقیت المہریہ میں لکھتے ہیں:

"میں نے آپ کی تقریر حضرت میاں میر لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے عرس مبارک کے موقع پر سنی، میں نے دیکھا کہ آپ کے مبارک بیان کے دوران سامعین بحرِ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غوطے کھا رہے تھے اور یوں چیختے تھے کہ جیسے ان کی جان بدن سے نکلی جا رہی

ہے، مجھے ان کی تقاریر نے خاص طور پر تقریر کرنے کا ولولہ دیا"۔

مدینۃ الاولیاء لاہور میں آپ کی کثرت سے آمد و رفت تھی، جب تشریف لاتے تو مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، بیگم شاہی مسجد اور مسجد بیرون مستی گیٹ میں ارشاد و تلقین کی محافل و مجالس گرم کیا کرتے تھے، نیز انجمن نعمانیہ ہند لاہور اور حزب الاحناف کے سالانہ اجلاس میں بھی شرکت فرمایا کرتے تھے، آپ کی مجالس میں پچاس پچاس ہزار نفوس کی شرکت ہوتی تھی، ساری عمر لاہور اور امرتسر کے علاقہ میں بالخصوص اور ہندوستان کے دوسرے مختلف مقامات پر بالعموم لوگوں کو وعظ و نصیحت سے مستفید کرتے رہے، چونکہ خود عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے دوسروں کو بھی اسی کا درس دیتے تھے، آپ کی تقریر سن کر عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جذبہ خود بخود ابھرتا تھا..... آپ جب لاہور تشریف لاتے تو حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ اقبال کے مزارات مقدسہ پر لازماً حاضری دیتے"۔ (ماہنامہ عرفات، اولیاء بہاولپور)

ایسا ہی ذکر مسعود حسن شہاب صاحب نے کیا ہے لکھتے ہیں:

حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی رگ رگ میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سوز و گداز بھرا ہوا تھا اور زبان میں ایسی تاثیر بسی ہوئی تھی کہ سنگ دل بھی چند فقرے سن کر موم ہو جاتا تھا۔ آپ کی خطابت کا دور دور چرچا تھا۔ لوگ بڑی عقیدت سے اور توجہ سے آپ کا وعظ سنتے تھے، مشکل ہی سے پنجاب کا کوئی شہر اور قریہ ایسا ہوگا جہاں جا کر آپ نے تقریر نہ کی ہو۔" (اولیاء بہاول پور)

سید محمد فاروق القادری قرب کے سارے امکانات رکھتے تھے، آپ کے والد گرامی کا خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ سے قرب مثالی تھا، اس لیے آپ کی رائے نہ صرف یہ کہ معتبر ہے بلکہ بنیادی حوالہ بھی ہے، فرماتے ہیں:

"آپ (یعنی خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمۃ) کے واعظ و تقاریر روایتی انداز کے

برعکس اپنے اندر جذب و مستی، حدتِ عشق، رموزِ عشق اور ہر بات کے واقعاتی منظر کا ایک ایسا منفرد انداز رکھتے تھے، جس کی نظیر دور دور تک نہیں ملتی، پچاس پچاس ہزار کا مجمع ہے مگر رات کے سمے میں جونہی محمد عربی (ﷺ) کا یہ سچا عاشق

سید و سرور محمد نور جاں ۔ بہتر و مہتر شفیع مجرماں

کی دلکش صدا بلند کرتا تو واقعہ یہ ہے کہ کسی کو تن من کی خبر نہ رہتی، بعض اوقات چشم زدن میں رات کے چار پہر گزر جاتے اور اچانک اس محفل میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے صبح آن دھمکتی"۔

(حضرت خواجہ محمد یار اور عشق رسول ﷺ)

ڈاکٹر الطاف حسین جہانیاں کی رائے ہے کہ:

"آپ صاحب حال تھے، سوز و گداز سے بھرپور مواعظ حسنہ سے عوام و خواص کے دل پگھلاتے تھے، ..... (پھر فرماتے ہیں) آپ کی تقریر کا اثر انسانوں سے تجاوز کر کے جانوروں اور جمادات کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا"۔

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمۃ، شخصیت و کلام)

ایسا ہی ذکر سید بشیر احمد شاہ گڑھی شریف نے کیا ہے:

"خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ ایک جادو بیان مقرر اور واعظ تھے، جب وہ مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے تو دریا اپنے چلتے پانی روک کر ہمہ تن گوش آپ کا وعظ سننے لگ جاتے تھے، پرندے ہواؤں میں رقص کرنے لگ جاتے"۔

(بانگ سحر ۲۰۰۷ء ۔ گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج خانپور)

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جادو بیانی ہو یا فصاحت لسانی، ہر بزرگ، دوست، عقیدت مند حتی کہ عداوت پسند نے بھی اس ہمہ گیر اثر آفرینی کا اعتراف کیا ہے، معاشرہ کی عمومی روش اس قدر حوصلہ افزا کم ہی رہی ہے، اگر چند افراد کا رویہ ہمدردانہ ہے تو بہت سوں کا رویہ مخاصمانہ ہوتا ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ خوش قسمت ہیں کہ ہم جہت پذیرائی کے

اہل ٹھہرے ہیں، مداحین میں ایسے ایسے نام بھی ہیں جن کا ایک ایک حرف معتبر ہے، برصغیر میں جس ذات پر اہل سنت نے عقائد کی صیانت کے لیے بھرپور اعتماد کیا، وہ فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ہے، آپ اگرچہ عصر حاضر کے بلند پایہ عالم دین ہیں مگر صف اسلاف میں کھڑے ہیں آپ کی کسی مسئلہ پر تائید عمومی تسلیم کی مظہر قرار پاتی ہے، ایسے مجدد ملت کے دربار میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام کیا تھا آیئے تاریخ کے جھرکوں میں حقائق کا مشاہدہ کریں، سید فاروق القادری بیان کرتے ہیں۔

''ایک محفل میں آپ (یعنی خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ) کو فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں منبر نبوی پر بٹھایا گیا، ایک عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہوسکتی ہے کہ سامنے بھی اپنے وقت کا نامور عالم شیخ طریقت اور بلند مرتبہ عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو جو علم و معرفت کی تمام لطافتوں اور باریکیوں کو نہ صرف سمجھتا ہو بلکہ خود اس راہ کا راہی ہو، خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا مخصوص خطبہ شروع کیا تو فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ کر آپ کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا اور فرمایا ''سرآمد واعظین پنجاب'' سوء اتفاق کے مسلسل سفر اور وعظ و تقاریر کی وجہ سے آپ کا گلا جواب دے گیا اور خطبے سے آگے آپ ایک لفظ نہ کہہ سکے مگر آپ کو ساری عمر اس کا افسوس رہا''۔ (حضرت خواجہ محمد یار اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسا عبقری عالم جسے اس قدر محبت سے یاد کرے تو سوچئے وہ کس مرتبہ کا واعظ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے واعظ بے بدل ہونے پر مہر ثبت کر دی ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا احترام تھا، یقیناً یہ عقائد کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ دونوں ایک ہی مشن پر کاربند تھے، ڈاکٹر الطاف حسین جہانیاں اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

''امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ (یعنی خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ) کو

WWW.NAFSEISLAM.COM

خصوصی عقیدت تھی، چنانچہ حدائق بخشش کے قصیدہ معراجیہ کے بعض الفاظ پر مخالفین نے اعتراض کیا تو آپ نے امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ شب برات کو یہاں گڑھی اختیار خان میں ان الفاظ کے متعلق وہابیوں کی طرف سے میرے ساتھ ایک طویل بحث ہونے والی ہے"۔

اے مجدد بمن بے سروساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

الصورام الہندیہ میں آپ نے حسام الحرمین کی تصدیق فرمائی ہے"۔

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ شخصیت وکلام)

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایک واعظ تھے، صوفی تھے، شاعر تھے اور برصغیر میں موجود ملت اسلامیہ کے بااعتماد راہنما تھے، ایسا کثیر الجہات وجود اپنے دور کے ملی راہنماؤں سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے، علامہ اقبال برصغیر ہی میں نہیں عالم اسلام کے نامور راہنما ہیں اس لیے ہر دردمند انسان حضرتِ علامہ سے رابطہ میں رہا ہے، حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی دردمند انسان تھے اس لیے ان کے روابط علامہ اقبال سے متعدد صورتوں میں رہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ کا قلبی تعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے شدید تھا اس لیے مثنوی علامہ کی ذہنی وفکری ساخت میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے، اس سے ہم سب آگاہ ہیں کہ مولانا محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی فکری پرواز میں مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات کا سب سے زیادہ حصہ ہے، آپ نہایت انہماک سے مثنوی پڑھتے تھے اور اپنے مواعظ میں اس کو شامل کرتے تھے جس سے ہر خاص وعام متاثر ہوتے تھے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہاں مسئلہ وحدت الوجود کا جو خروش ہے اس میں بھی مطالعہ مثنوی کا اہم کردار ہے، مثنوی کا ذوق خواجہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا ایک مضبوط ذریعہ رہا۔

ڈاکٹر ناصر وحید لکھتے ہیں:

"آپ مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ بڑے دلکش انداز میں پڑھتے اور اس کی تشریح

ایسے دلچسپ پیرائے میں کرتے کہ ہر شعر کے رموز و اسرار آئینے کی طرح روشن ہو جاتے تھے، ایک ملاقات کے دوران حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ سے مثنوی سنانے کی درخواست کی تھی جس پر آپ نے حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ موصوف کو ان کے دولت کدہ واقع جاوید منزل میں مثنوی سے محظوظ فرمایا''۔(شہر یارِ تصوف حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات)

مثنوی سے تعلق خاطر کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا کہ جہاں بھی مثنوی شناس اکٹھے ہوتے اور مثنوی کی اثر آفرینی کا ذکر ہوتا تو لازم تھا کہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ آئے، بشیر حسین ناظم نے معروف دانشور حکیم محمد موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا کہ آپ فرماتے تھے:

''(خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ) مطالب و مفاہیم مثنوی کی تفہیم و تعلیم میں یکتائے روزگار تھے اور شارح و مفسر مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مرزا محمد نذیر عرشی امرتسری نقشبندی مجددی مرحوم سے ان کی اکثر ملاقاتیں اور مختلف علوم بالخصوص مابعد الطبعیاتی علوم پر گفتگو ہوتی رہتی تھی چنانچہ مولانا مرزا محمد نذیر عرشی، مثنوی کے بعض ادق مسائل کے حل کے لیے حضرت علامہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کرتے، کہا جاتا کہ جناب مرزا محمد نذیر عرشی صاحب نے شرح مثنوی کرتے ہوئے وحدت الوجود کے بارے میں بزرگانِ دین کی جو تقاریر نقل کی ہیں یا ان کا خلاصہ لکھا ہے ان میں عبد نبی مختار کی وقیع رائے اور مشورہ بھی شامل ہے''۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں خواجہ فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام و مرتبہ کیا تھا اور وہ کس طرح آپ کی رائے کا احترام کرتے تھے، اس بشیر حسین ناظم کا مندرجہ ذیل اقتباس مکمل راہنمائی مہیا کرتا ہے، لکھتے ہیں:

''شاعر ملت، ترجمان حقیقت حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانانِ عالم کی سیاسی و دینی پستی و حقیر کو بلندی و فراز میں بدلنے کے لیے مثنوی خودی و

اسرار خودی شائع کرائی، اس میں انہوں نے ہر اس مفکر کی خبر لی جو بے عملی، تکاسل، تساہل اور رسم شبیری کے خلاف تعلیم دیتا رہا ہو، اس مثنوی میں حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے افلاطون کو:

گو سفندے در لباس آدم است
حکم او بر جانِ صوفی محکم است

کہہ دیا چند ایسے اشعار لکھے جو افلاطون کے خلاف تھے، اس پر پورے برصغیر پاک و ہند میں جاہل صوفیاء نے ایک طوفانِ بدتمیزی کھڑا کر دیا اور افلاطون کی حمایت میں اس درجہ بڑھے کہ اسے

''جبرائیل اندر لباس آدم است کہہ دیا، جاہل صوفیاء کے طرز عمل سے حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو سخت افسوس ہوا، اس صورتِ حال میں صوفی باصفا حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے شاعر ملت اسلامیہ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو یہ مشورہ دیا کہ آپ کا پیغام ہر پڑھے لکھے کو پہنچ گیا ہے، لوگ تعلیم و معارف افلاطون کی حقیقت کو پا چکے ہیں اس لیے میری التماس ہے کہ آپ اگلے ایڈیشن میں ان اشعار کو حذف کر دیں جن پر نام نہاد صوفیاء کو اعتراض ہے، چنانچہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشورے کو نہایت وقیع و صائب سمجھ کر ان نام نہاد قابل اعتراض اشعار کو حذف کر دیا''۔

(عبدالنبی المختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں کچھ تذکرے)

مثنوی خوانی کی اثر آفرینی کا تذکرہ کرتے ہوئے سید فاروق القادری بیان کرتے ہیں:

''پیر غلام دستگیر نامی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی درد بھری آواز میں میں نے مثنوی سنی تو مجھے مثنوی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ مثنوی کے اشعار ترنم سے پڑھتے تو جس طرح خود روتے اسی طرح محفل کو رلاتے، بعض اوقات گریہ و بکا کی یہ محفلیں ساری

WWW.NAFSEISLAM.COM

ساری رات جاری رہتیں تو جب لوگ ان پاکیزہ محافل سے رخصت ہوتے تو آنسوؤں کی لڑیوں سے اپنے گناہوں کے دفتر دھوکر وہ اپنے آپ کو انتہائی سبک بار محسوس کر رہے ہوتے۔

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ وتقریر کا انداز ہو بہو مثنوی کا تھا، حکایات، تمثیل، منظر نگاری، ہنسانا، رُلانا، موعظت وعبرت، یہ ساری باتیں ساتھ ساتھ چلتیں، مگر آپ کے ہر قول وفعل کا نتیجہ اور خلاصہ جز نغمۂ محبت سازم تو انداز، کے مطابق صرف اور صرف ذات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہوتی"۔

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ عوامی جلسوں کی ہی زینت نہ تھا، خواص اور اصحاب علم کے لیے بھی ان مواعظ میں بہت سا سامانِ محبت وعقیدت تھا، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اظہارِ محبت، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا محبت آمیز اعتراف، مرزا نذیر عرشی جیسے شارح مثنوی کی مشاورت اور میر غلام دستگیر نامی جیسے صاحب قلم کے اشہب علم کی گرویدگی، یہ سب اعترافِ عظمت کے حوالے ہیں یہ عظمت اثر آفرین بھی ہوئی اس کا صاحبزادہ خورشید گیلانی مرحوم کو اعتراف ہے، فرماتے ہیں:

"راقم الحروف کے والد گرامی مخدوم سید احمد شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کچھ عرصہ آپ کے ساتھ رہے وہ کبھی کبھار اپنی تقریر میں خواجہ صاحب کے لہجے میں مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے تو سماں بندھ جاتا، اس سے اندازہ ہوتا کہ خود خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ مثنوی کسی طرح پڑھتے ہوں گے اور کیا غضب ڈھاتے ہوں گے"۔ (حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ سحر البیان خطیب)

کن کن پر اس سحر بیانی کا اثر ہوا یہ طویل داستان ہے، صرف ایک دو واقعات کے اشارے توضیح مقصود کے لیے کفایت کریں گے، ایک تو سید فاروق القادری کا یہ بیان کہ:

"میرے والد گرامی راس الاصفیاء حضرت سید مغفور القادری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے،

کہ ایک ایسی ہی محفل میں جب مقامِ محمدیت پر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے علم وعرفان کا ترانہ چھیڑا تو میں نے دیکھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے شیخ الجامعہ مولانا محمد گھوٹوی ایسے جید عالم دین کی روتے روتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی"۔ (حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

حزب الاحناف لاہور کا سالانہ جلسہ ایک علمی اجتماع ہوتا تھا، برصغیر کے معروف علماء و خطباء شریک جلسہ ہوتے اور کئی روز یہ محفل نور ونکہت جاری رہتی، راقم السطور کو خود اس محفل کی برکات کا بچشم خود اندازہ کرنے کا کئی بار موقعہ ملا ہے، یہ قیام پاکستان کے بعد کی بات تھی، یقیناً جب سفری حد بندیاں نہ تھیں تو عالم سمٹ آتا ہوگا، ایسی ہی ایک محفل کا بشیر حسین ناظم ذکر کرتے ہیں۔

"جلسہ حزب الاحناف میں آپ نے اپنے مخصوص انداز میں مثنوی کے چند اشعار باقاعدہ وعظ سے پہلے پڑھے تو حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ خاص کر مولانا الشیخ عبدالغفور ہزاروی اعلیٰ ونور اللہ ضریحہ اہتزاز سرسے داد دینے لگے اور کہنے لگے۔ واہ او ئے جنے دیا پترا، (تمہارے قربان جاؤں اے مرد حق کے لخت جگر) جلسے کی مختلف نشستیں ہوتیں، اہل لاہور اور دور دراز سے آئے ہوئے لوگ منتظمین سے پوچھتے رہتے کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی کب باری ہے، حضرت کی مقبولیت وتاثیر وعظ کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے"۔

(عیدالنبی المختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں کچھ تذکرے)

صاحبزادہ خورشید گیلانی مرحوم خود بھی بلند پایہ مقرر تھے اس لیے وعظ کی سامعین پر گرفت کی قوت کو جانتے تھے آپ کے نزدیک خطابت صرف ایک فن نہیں بلکہ یہ ورثۂ نبوت ہے، فرماتے ہیں:

"اپنے وقت کا ہر پیغمبر اور مصلح ضروری نہیں کہ صاحب تصنیف ہو لیکن خطیب ہونا

اس کی شخصیت کا جزو لازم رہا ہے، لوگوں کے دل مائل کرنے، ان کی سوچ بدلنے اور انہیں اپنے حلقہ اثر میں لانے میں دیگر اسباب کے علاوہ انبیاء و مصلحین کے اعجازِ نطق کا خاصہ حصہ رہا ہے جس سے انکار ممکن نہیں''۔ پھر فرماتے ہیں:

''راقم الحروف یہ سمجھتا ہے کہ الفاظ و حروف بے جان ہوتے ہیں اگر وہ کسی درد آشنا کی نوکِ زبان پر آجائیں تو بولنے لگتے ہیں''۔ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے گفتار کی شیرینی، الفاظ کے حسن، موضوع کے انتخاب پیش کرنے کے سلیقے اور زبان و بیان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے خوب نوازا تھا جس کا وہ برمحل استعمال کرتے اور بڑے بڑے اجتماع کو ایک اکائی میں بدل دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ مرحوم سے مشرب کا اختلاف رکھنے والے یوں تو کچھ تنقید کے پتھر پھینکتے تھے مگر یہ کہے بغیر انہیں بھی چارہ نہ تھا کہ یہ شخص جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں کو کھلونا سمجھ کر کھیلتا تھا''۔

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ سحر البیان خطیب)

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ دراصل باطن کی سرشاریوں کا عکس جمیل تھا اسی لیے ہر صاحب درد کو اس کی وارفتگی موہ لیتی تھی، بیدم وارثی ''دنیائے محبت کا ایک معروف و معتبر نام ہے ان کے سامنے جب ایک مرید کے تعارف میں حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آیا تو:

''یہ الفاظ سنتے ہی بیدم وارثی صاحب خوشی سے مست ہو کر جھومنے لگے اور فرمانے لگے کہ واہ بھئی واہ سبحان اللہ میں نے کلیر شریف میں ایک صوفی چنا ہے اس جیسا اور کوئی نہیں۔ (قلمی نسخہ ص ۲۵)

یہ بھی عجیب انسانی رویہ ہے کہ بعض لوگ ذکر سن کر ہی اسیر محبت ہو جاتے ہیں مگر بعض بالمشافہ گفتگو سے فیض یاب ہو کر بھی اعترافِ حقیقت کی توفیق نہیں پاتے۔ ان منکرین عظمت میں بعض کوتاہ چشم ہوتے ہیں کہ روزِ روشن کو بھی کم کم دیکھتے ہیں، یہ لوگ معاند نہیں ہوتے

مگر حاسد ضرور ہوتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حاسد کبھی سرفراز نہیں ہوسکتا اور یہ بھی زمانے بھر کا تجربہ ہے کہ حسد صرف ان سے کیا جاتا ہے جن کو اپنے سے برتر تسلیم کرلیا جاتا ہے، یہ برتری کا اقرار زبان سے نہ بھی ہو، زبانِ حال سے ضرور ہوتا ہے، عرب شاعر نے خوب کہا تھا کہ ؎

وفی السماء نجوم لاعداد لها

ولایکسف الا الشمس والقمر

''یعنی آسمان میں اس قدر ستارے ہیں کہ گنے بھی نہیں جاسکتے مگر گہن تو صرف سورج یا چاند کو لگتا ہے''۔ اسی لیے بعض دنیا دار، معمولی معمولی خواہشات کو پالنے کے لیے حاسدانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، ان میں وہ لوگ جو اپنے کہلاتے ہیں، وہ دوہرے عذاب میں ہوتے ہیں کہ نہ کھل کر مخالفت کرسکتے ہیں، اور نہ حسد کے زہر کا تریاق پاتے ہیں، خاندان فریدیہ کے ایک عقیدت مند محمد جاوید صاحب ہیں، ان کا کہا ہے کہ:

حضرت صاحب کے وعظ کا اپنا انداز تھا، اس وقت ان کے برابر کا کوئی مقرر نہ تھا ہر مقرر کہتا کہ ''حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر پہلے منبر پر بیٹھ گئے تو انہیں کوئی نہیں سنے گا چنانچہ ان کی کوشش ہوتی کہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وقت نہ ملے یا بہت بعد میں ملے، اسی طرح ایک روز دہلی میں تقریر کرنا تھی، منتظمین نے سب مقررین کے نام لکھنا شروع کیے جب حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی باری آئی تو پوچھا گیا کہ آپ کب تقریر کرنا پسند کریں گے، آپ نے فرمایا 'جب آپ کا دل چاہے' جاوید صاحب کہتے ہیں کہ ان کے ماموں نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام آخر میں لکھ کر منتظمین اور حاسد بہت خوش تھے کہ جب حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی باری آئے گی تو لوگ جا چکے ہوں گے یا پھر سو چکے ہوں گے اور ان کے ساتھ خوب ہوگی کیونکہ جب ان کو سننے والا کوئی نہیں ہوگا تو کیسے اور کس کو سنائیں گے، تمام

WWW.NAFSEISLAM.COM

مقررین نے خوب تقریریں کیں جب حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا منبر پر جلوہ افروز ہوئے تو منتظمین یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نہ جانے کہاں سے یک دم اتنے لوگ آ گئے کہ تاحد نظر سر ہی سر نظر آنے لگے، لوگوں میں زبردست جوش وخروش تھا، لوگوں نے آپ کا خطاب پرسکون ہو کر سنا اور نعروں کی صورت میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ (قلمی نسخہ ص ۳۹)

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی طاقت لسانی کا ہمواؤں میں بھی تذکرہ تھا اور معاندین میں بھی مگر عجیب بات ہے کہ دل کا غبار نکالنے والوں کو بھی اعتراف کرتے ہی بنی، عبدالرشید ارشد نے جب بیس بڑے مسلمان، کتاب لکھی تو نہ چاہتے ہوئے بھی تذکرہ کرنا پڑا، بڑے ہی کرب آمیز لہجے میں لکھا:

''محمد یار اپنے طبع زاد یا دوسرے شاعروں متشاعروں کے رومانی اور مبتذل اشعار اور دوہڑے ملتانی زبان میں منبر پر پڑھتا تھا، اپنے اوپر کیف وسرور طاری کر لیتا تھا، وہ جھومتا اور وجد کرتا اور جھومتے جھومتے مست و بے خود ہو جاتا تھا جب وہ حاضرین اور سامعین کو اپنے رنگ میں رنگ کر مست و مدہوش اور مسحور ومسخر کر لیتا تھا تو بڑی آسانی سے انہیں اپنی دعوتِ باطلہ کا شکار کر لیتا، اس مرد ضال ومضل نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر ومحراب سے برسوں شرک وبدعت کی دعوت دی اور پورے ضلع کے سادہ لوح وجاہل لوگوں کو الحاد و بے دینی، شرک وبدعت اور گمراہی وضلالت کی آغوش میں سلا دیا''۔

(ص ۹۷)

عبدالرشید ارشد کو یہ بھی گلہ ہے کہ

''ضلع بھر میں بیسوں نواب، تمندار، سردار، جاگیردار اور اعلیٰ زمیندار تھے مگر اس ایمان سوز منظر اور دردناک صورت حالات سے کسی کے کان پر جوں تک بھی تو نہ رینگی''۔ (ص ۹۷ بیس بڑے مسلمان۔ عبدالرشید ارشد)

یہ معاندانہ اقتباس اپنے اندر کئی متضاد رویوں کا حامل ہے، مخالفت کے حریفانہ بیان میں وعظ وتقریر کی عظمت کا اعتراف بڑا واضح ہے مگر یہ بھی میلان موجود ہے کہ ہدایت ورشد کے دعوے داروں کو کن لوگوں سے مدد مانگنے کی عادت ہے، سرمایہ داروں، جاگیرداروں سے تحفظ دین کی طلب اس بات کی غماز ہے کہ علمی ونظریاتی جدلیت کا ہر روپ ناکارہ ہو چکا ہے، برصغیر میں یہ المیہ عام رہا کہ خود ساختہ نظریات کی حفاظت کے لیے دنیا داروں کو پکارا گیا، کسی نے انگریز بہادر کی پناہ لی تو کسی نے کانگرس کے حصار میں عافیت محسوس کی، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ تو ان عاشقوں میں سے تھے جو بہر حال ایک دربار پر سوالی رہتے ہیں مگر بدقسمتی کہ ایسے استغاثے شرک و بدعت شمار کیے جاتے ہیں مگر پروردگار کے باغیوں سے دادرسی تحفظ عقیدہ شمار ہوتی ہے یا للعجب!

''میں گداہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں''

حیرت ہے اس قدر جلال کہ ضال ومضل قرار دے دیا مگر پھر بھی اعتراف ہے۔

''محمد یار کی زبان میں بلا کا رس تھا، انتہائی سوز تھا وہ اپنے لحن اور جادو بیانی سے حاضرین کو مسحور کر دیتا تھا، وہ منبر پر بیٹھ کر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی اور خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان دردناک انداز، رس بھری آواز اور دلفریب طرز وترنم میں گاتا تو اڑتے پرندے ٹھہر جاتے اور چلتا دریا تھم جاتا''۔ (ص ۹۶۹)

ایک سردار صاحب کا ذکر کیا گیا کہ انہوں نے ردعمل کی تحریک کا آغاز کیا مگر کیا ہوا سنئے۔

''سردار صاحب کا حساس و دردمند دل تڑپا، آپ نے مقامی علماء کرام کو ساتھ لے کر ضلع میں تبلیغی مہم کا آغاز کر دیا مگر محمد یار ایسے فصیح اللسان ساحر و فنکار کا باطل افسوں توڑنا ان حضرات کے بس کا روگ نہ تھا''۔

(بیس بڑے مسلمان ص ۹۷۰)

یہ تمام مخالفانہ بیانات واضح کر رہے ہیں کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کی گرفت بے بدل تھی آج بھی ضلع رحیم یار خان ہی نہیں، وطن عزیز پاکستان بلکہ بیرونِ ملک فریدی نصیحت

آفروزی کا ہر جگہ تذکرہ ہے، انسان کے فیصلے خواہشات کے تابع ہوں تو حقائق منکشف نہیں ہوتے، صاحب طرز واعظ ہونا، شعر وسخن کے ذوق کا سلیم ہونا، آواز کا رس بھرا ہونا حتی کہ ترنم صوت کا جذاب ہونا، عیوبات سخن کا حصہ تو نہیں مگر جب فیصلوں کا سارا مدار موضوعی کیفیات پر ہوا اور ذوقِ نظر پر تعصبات کی دھند چھا چکی ہو تو نتائج معروضی نہیں ہوتے، یہ ہر بڑے ادیب شاعر، واعظ اور عالم کا المیہ ہے کہ سامعین وقارئین عیاں حقائق سے بھی پہلو تہی کرتے اور تعصباتی فیصلے صادر کرتے ہیں مگر تاریخ گواہ ہے کہ ایسے فیصلے پادر ہوا ہوتے ہیں اور عقل ودانش کی تیز لہروں میں بے قیمت پر وبال کی طرح اُڑ جاتے ہیں، اعترافِ عظمت کے لیے عظمتوں کا حامل ہونا ضروری ہے، خود خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ارفع تر مثال دی تھی کہ:

؎ بوجہل کو محبوب دکھائے نہیں جاتے

ہاں فکر سلامت ہو، نتائج اخذ کرتے خداداد صلاحیت ہو اور تعصب وعناد کی رنگین عینک نہ ہو تو روشنی کی ہر کرن مانوس لگتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو

؎ چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

آیئے دیدہ وروں کی جماعت کے بصیرت فزا فیصلے بھی سنیں۔

ایک صاحب علم جو مروجہ نصاب سے گزر کر دورۂ حدیث کے درجہ تک پہنچ گئے تھے مولانا عبدالغنی صاحب ہیں جو ضلع رحیم یار خان میں ٹھل خیر محمد خان کی جامع مسجد ٹھل حسن خاں کے خطیب ہیں، اپنا ایک ذاتی واقعہ نقل کرتے ہیں، یہ واقعہ اس دور کا ہے جب آپ فیصل آباد میں حضرت شیخ الحدیث محمد سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں شامل تھے، درس بخاری تھا کہ اُستن حنانہ کا ذکر آیا، اُستن حنانہ والی حدیث نے سب کو مضطرب کر دیا، گریہ ہی گریہ تھا، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کسی کو مثنوی کا وہ حصہ جس میں اُستن حنانہ کا ذکر ہے یاد ہو تو سنائے۔ ایک شریک درس نے سنانا شروع کیا تو ہر طرف سب گریہ کناں تھے اس پر حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''ارے یار مثنوی شریف کیا محبوب کتاب ہے جس کا پڑھنا پڑھانا دنیا سے اُٹھ چکا ہے، اسے نہ کوئی مدرسوں میں پڑھاتا ہے، نہ کوئی منبر پر پڑھتا ہے بس ایک حضرت خواجہ محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہاولپوری تھے جو کہ مثنوی شریف، دوران وعظ پڑھتے تھے، پس یار جب وہ منبر پر بیٹھ کر مستانی آنکھ دیکھتے تھے تو مخلوق میں ہوہو شروع ہو جاتی تھی، بس یار وہ عجیب ہی تھے''۔ (قلمی نسخہ)

یہی مولانا عبدالغنی صاحب سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خانپور کے قریب ایک بستی میں تقریر کرنے آئے، رات وہیں رہے، صبح کو مولانا عبدالغنی اور ان کے چچا مولانا حبیب اللہ حاضری میں تھے کہ حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہوا، فرمایا:

''حضرت صاحب قبلہ کی تقریر کے دوران اگر کوئی منکر بھی آ جاتا تو سر دھنتا نظر آیا کرتا تھا''۔ (قلمی نسخہ)

مفتی محمد مختار درانی مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم خان پور کا بیان ہے کہ ایک محفل میں قبلہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''وہ تو شہنشاہ عارفاں تھے، ہم کیا چیز ہیں، پھر فقیر نے عرض کیا حضور وہ ظاہری علوم میں بھی ماہر کامل تھے فرمایا، جو ان کو قابل مدرس عالم نہیں مانتا میں اس کو عالم نہیں سمجھتا''۔ (قلمی نسخہ)

یہی بات سید فاروق القادری کے بیان میں بھی موجود ہے مثلاً فرماتے ہیں:

''آپ نے زندگی کے آخری دور میں قرآن مجید حفظ کیا، قرآن اور احادیث پر ایسا عبور کہ بقول غزالی زماں استاذی سید احمد سعید صاحب کاظمی رحمۃ اللہ علیہ اس دور کے علماء کو ایسا عبور بہت کم حاصل ہے''۔

(حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

مولانا منظور احمد شاہ صاحب ایک صاحب نسبت شیخ، ایک صاحب دل بزرگ، ایک

لائق اعتماد مناظر اور ایک صاحب علم وفن مدرس ہیں، ساہیوال میں ایک مرکز علم وعرفان کے نگران ہیں، ان کا ایک ذاتی واقعہ جو آپ سے نقل ہوا اور آپ نے خواجہ غلام قطب الدین فریدی مدظلہ کو ایک خط کے ذریعے تحریر بھی فرمایا، لکھتے ہیں:

''حضرت قبلہ (یعنی خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ) کے حالاتِ زندگی شائع کرنے پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں، مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعارف نہ تھا، البتہ آپ کی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت، ذوق ومستی، عشق ومحبت کے متعدد واقعات سنے ہوئے ضرور تھے، مجھے ایک دوست نے دیوانِ محمدی پڑھنے کے لیے دیا، حسن اتفاق پہلا شعر جو نظر پڑا تو یہی تھا۔

بجاتے تھے جو ''اِنّی عَبْدُہٗ'' کی بنسری ہر دم
خدا کے عرش پر انی انا اللہ بن کے نکلیں گے

آخری مصرعہ کے معانی ومفاہیم، تاویلات کے بحرعمیق میں غوطے کھاتا کھاتا سوگیا، ایک عظیم اجتماع میں حضرت کو خطاب کرتے سنا، جلسہ سے فارغ ہوکر سیدھے میری طرف تشریف لائے، محبت سے گلے لگایا، میں نے ہاتھ چومے اور آپ نے بار بار میرا سر چوما اور فرمایا: اگر درخت سے اِنّی اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ کی آواز سے درخت کو خدا نہیں کہا جاسکتا تو حضور کی زبان سے اِنّی اَنَا اللہ کے الفاظ سے آپ کو غلط فہمی کیوں ہوگئی، آپ تو ہمارے عزیز ہیں، بس آنکھ کھل گئی اور جلدی ہی دربار شریف پر حاضری دی''۔

(قلمی مکتوب کا ایک حصہ)

یہ بھی وعظ کی ایک صورت ہوتی ہے کہ اٹھنے والے سوال کا حل کردیا جائے اور حل بھی اس طرح کہ ابہام وتشکیک کا ہر در بند ہوجائے۔ ان تمام مشاہدات واعترافات نے اس حقیقت کو بے غبار کردیا کہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ دین متین کی ترویج واشاعت میں ہمہ تن محو تھے، آپ کی زبان اگر فرامین شریعت کی توضیح وتشریح کے لیے وقف تھی تو آپ کا لب ولہجہ،

WWW.NAFSEISLAM.COM

حرکات وسکنات اور سلوک وروّیہ تفہیم رموز و اسرار کا بلیغ تر ذریعہ تھا، یہ کسی انسان کی خوش بختی کی معراج ہوتی ہے کہ اُس کا لفظ لفظ احقاقِ حق کا وسیلہ بن جائے اور اس کا ہر عمل ہدایت وراہنمائی کا کامیاب معیار قرار پائے، جب وجود کا ہر پہلو مینار ہدایت بنتا ہے تو گفتگو سے بڑھ کر خاموشی اظہارِ حق کا وسیلہ ہوتی ہے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام بلند پر تھے کہ جہاں اشارہ وضاحت کا کفیل، اجمال تفصیل کا بدل اور خاموشی، گفتگو بن جاتی ہے، یہ صرف خوش فہمی نہیں ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، ایک عقیدت مند محمد اشرف فریدی گواہ ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ لفظوں کا محتاج نہ رہا خود بخود وجود سے ہویدا ہوتا گیا، اُن کا کہنا ہے کہ:

''اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس الفاظ کا جادو ہے کہ آپ باتوں ہی باتوں میں دلوں کو موہ لیتے ہیں اور تقریر کرنے سے پہلے ہی لوگوں کو مسحور کر لیتے ہیں، چنانچہ ایک دن جب خانپور میں جمعہ کی نماز سے پہلے آپ منبر پر وعظ کے لیے تشریف فرما ہوئے تو لوگوں نے کہا، کچھ مخالف آپ کی تقریر کے متعلق اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، آپ نے اس پر فرمایا: آج خاموش وعظ ہوگا، غور سے سنیں اور خاموش رہیں''۔

لوگ جو موجود تھے کہتے ہیں، ہمیں اس طرح لگتا تھا کہ جس طرح آپ وعظ فرما رہے ہیں، ایک ایسا پر کیف سماں پیدا ہوا کہ لوگ تڑپ کر گرنے اور رو رو کر اپنے چہروں کو تر کرنے لگے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کے دلوں کو آگ لگ گئی ہو اور وہ اپنے آنسوؤں سے بجھا رہے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے یا بعد ہم نے ایسی انوکھی اور مؤثر تقریر نہیں سنی، نہ صرف یہ کہ لوگوں نے اس عجیب وعظ سے فیض حاصل کیا بلکہ حاضرین نے آقا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت بھی کی، اس واقعہ کا ذکر آج بھی لوگ بڑی عقیدت واحترام سے کرتے ہیں''۔ (قلمی نسخہ)

اس واقعہ کی تصدیق متعدد لوگوں نے کی ہے، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج خان پور

کے میگزین بانگ سحر (۲۰۰۶-۷) میں سید بشیر احمد شاہ نے تحریر فرمایا:

''آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ آج چپ کا وعظ ہوگا، آپ نے لب تو بند کر دیئے پھر آنکھوں آنکھوں سے جو کچھ کہہ گئے، آج تک دنیا اُسے یاد کر رہی ہے''۔ (ص ۱۱)

وعظ کا رنگ کیا تھا، اس میں کلمات و تراکیب کا خروش کس درجہ کا تھا، روایات و حکایات حاضرین کو کس طرح گرفت میں لیتے تھے، جذب و انجذاب کا عالم کیا تھا؟ یہ سب حوالے کسی وعظ کے مقام و مرتبہ کو متعین کرنے کے لیے معاون ہوتے ہیں، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً ایک احترام کے ہالے میں تھے مگر تجزیہ و تنقید کے ہر رُخ کے لیے کھلی کتاب تھے، ہوسکتا ہے کوئی گرویدگی کے زیر اثر بے مثل واعظ قرار دے اور کوئی عناد و حسد کے دباؤ کے تحت فنکار قرار دے کر رد کر دے مگر ہمارے سامنے ایک ایسا معیار ہے جو نہ کسی حاسد کے حسد سے داغدار ہوتا ہے اور نہ کسی عقیدت مند کے غلو سے ماند پڑتا ہے۔ اگر وعظ، اگر بیان کا مقصود وہ ذات گرامی ہے جو ممدوحِ کائنات ہے تو ان کی پسندیدگی ہی نص قطعی ہے کہ واعظ کا مقام کیا ہے، آیئے ایک صاحب دل کے اس باطنی نظارے کا ذکر کریں جو حصارِ رحمت میں تھا اور رحمت تمام صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھی حاضر تھا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

سید محمد فاروق القادری جیسا صاحب نظر جسے آباؤ اجداد سے عقیدت و محبت کی میراث ملی ہے، ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے حاضر دربار ہونے کی شہادت بھی ہے اور عطائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانفزا حکایت بھی ہے فاروق القادری رقمطراز ہیں:

''راقم السطور کے جد امجد شیخ المشائخ سید سردار احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ تین سال سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے، آپ مولانا عبدالباقی لکھنوی ثم المدنی سے دورہ حدیث اور فصوص الحکم کی تکمیل کر رہے تھے کہ اس دوران ایک دفعہ آپ نے خواب میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت فرمائی، آپ نے دیکھا کہ ایک

انتہائی باوقار محفل میں ہزاروں لوگ حسب مراتب دم بخود بیٹھے ہیں، اتنے میں سرورِ دو عالم ﷺ کے اشارے سے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ اٹھے اور آپ نے مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت کے یہ مصرعے انتہائی پُرسوز آواز میں پڑھے"۔

صلی اللہ علی نورِ کز و شد نور ہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

جب آپ اس شعر پر پہنچے:

محمد احمد و محمود وے را خانقش بستود
از و شد بود ہر موجود از و شد دیدہ ہا بینا

تو وجد میں آ کر سرورِ عالم ﷺ کے حضور زمین پر گر کر تڑپنے لگے۔

میرے جدِ امجد نے مدینہ منورہ سے خط میں اپنے صاحبزادے (میرے والد گرامی) کو لکھا کہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جا کر انہیں مبارک باد پیش کریں اور میرا سلام پہنچائیں، میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جونہی سلام پہنچایا خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے مدینہ منورہ کی طرف سر کے بل رینگنے لگے، آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں اور زبان پر یہ لفظ تھے:

"وعلیکم السلام میرے حضور وعلیکم السلام میرے حضور"

(حضرت خواجہ محمد یار اور عشقِ رسول ﷺ)

اللہ اللہ، یہ جاں لوٹنے، تڑپنے اور قربان ہونے کی تھی، ایک عاشق صادق جو عمر بھر مدحیہ ترانے گاتا رہا ہو، جس کا توشۂ آخرت صرف حبِ رسول ﷺ ہو، جو دن رات ایک لگن کے ساتھ گزارتا ہو کہ حاضریٔ دربار کی سعادت مل جائے، اُسے یہ سوچ کر مچل جانا چاہیے کہ:

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

موضوعاتِ وعظ:

وعظ اگرچہ انسانی معاشرے میں اصلاح کی کاوشوں کا حصہ تھی مگر اس میں بتدریج وہ انحطاط آیا جو ہر صاحب فکر کو دردمند کر گیا، یہ رفاہ عامہ کی تحریک کا حصہ تھی جو صرف طلاقت لسانی کا مظہر بن گئی، اس قلب ہیئت کی وجہ سے وعظ یا تقریر ایک میکانکی عمل بن گیا، لفظ بے روح ہو گئے، استدلال کٹ مچتی ہوا اور متانت کے بجائے ہزل سرائی رواج پانے لگی، دین ایک سنجیدگی کا مظہر تھا کہ اس سے دنیا کی کامیابی اور آخرت کی نجات وابستہ تھی، اس کی اساس قرآنی تعلیمات اور نبوی اُسوہ تھا من پسند تاویلات نے قرآنی حکمت سے دور کر دیا اور غیر مستند بلکہ غلط روایات نے نبوی روشنی سے محروم کر دیا، وضع حدیث ایسے ہی چرب زبان لوگوں کی ضرورت تھی، حد یہ ہوئی کہ نبی رحمت ﷺ جن کا ابتدائی تعارف ہی صداقت و امانت تھا، اُن سے نسبت روایت پر بھی دین دشمنوں نے شب خون مارنے کی کوشش کی، یہ تو حفاظت الٰہی تھی کہ صالحین امت کے گروہ میدان میں آئے جن کا جذبہ صادق حصار بن گیا اور دام تذویر تار تار ہوا، تاریخ کے سینے میں ہزار

WWW.NAFSEISLAM.COM

موانع کے باوجود ایسے دردمند افراد کی ایک تعداد نبرد آزما نظر آتی ہے جس کو بہر حال صداقتوں کو آشکار کرنا تھا، محدثین کی کاوشیں، مفسرین کی ذہانتیں اور فقہاء کی محنتیں، صیانت دین اور حفاظت احکام کے لیے ہر دور میں قربان ہوتی رہیں، صحابہ کرام علیہم الرضوان، آئمہ امت علیہم الرحمۃ کے خطبات گواہ ہیں کہ جذبوں کے ان کلمات نے کس طرح روحِ دین کو زندہ رکھا، عصر حاضر بھی بے توفیق نہیں کہ الفاظ ہوں یا تراکیب، متون ہو یا حواشی، اسناد ہو یا راوی، سب کی حرمت مردانِ حق کے فیض سے ہی قائم ہے، یہ فہرست بہت طویل ہے کہ مسلم ملت کسی دور میں بھی بانجھ نہیں رہی، موضوع کی تحدید کی بنا پر ان باکمال افراد سے ہم نے صرف ایک کو موضوعِ گفتگو بنایا، اور وہ ایک ہیں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے پچاس سال کے قریب دعوت و ارشاد کا فریضہ انجام دیا جس کے اثرات نسل در نسل جاری ہیں، یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ واعظ معاشرے کا حصہ ہوتا ہے اور معاشرہ ہر دور میں بعض مخصوص حالات کا سامنا کر رہا ہوتا ہے اس لیے ہر صاحب شعور واعظ کو وقت کی نبض پر ہاتھ رکھنا ہوتا ہے، علاج کی نوعیت فوری بھی ہوتی ہے اور تقریباً دائمی بھی، اس لیے ہر دو تقاضوں پر ضروری توجہ دینا واعظ کے فرائض میں شامل ہے خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کس ماحول میں یہ فریضہ نبھاتے رہے اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، زمانی، مکانی نسلی اور علمی حوالوں سے گفتگو ہو چکی ہے اب صرف یہ جائزہ لینا ہے کہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے نباض قوم کی حیثیت سے قومی صحت قائم رکھنے کے لیے کون سا نسخہ استعمال کیا، اس نسخے کے اجزاء کون سے تھے اور ان سب میں سے وہ کون سا جز و تھا جس کا نام عنوانِ نسخہ بنا تھا۔

حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ کو کن اجزاء سے ترتیب دیا تھا یہ بڑا تفصیل طلب قصہ ہے، کوشش کریں گے کہ صرف ان نمایاں اجزاء کا تذکرہ کیا جائے جو اساسی موضوعات کے طور پر مواعظ کا حصہ بنے، ان کا ذکر اہمیت موضوع کے حوالے سے کیا جا رہا ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

عشق رسول ﷺ:

نبی اکرم ﷺ سے جاودانی محبت، ایمان کی اساس ہے کہ محبت کے بغیر ایمان کا وجود ہی متحقق نہیں ہوتا، اطاعت بھی دراصل اسی محبت کا فیضان ہے، اعمال کی ہر شاخ تب ہی ثمر بار ہوتی ہے جب اس میں محبت کی تازگی ہویدا ہو، کہا جاتا ہے کہ "الاسلام یدور حول المصطفیٰ (ﷺ)" یعنی اسلام تو مصطفیٰ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے وجود کے گرد طواف کا نام ہے، جس عمل میں یہ تعلق، یہ نسبت موجود نہ ہو، وہ عمل کا بہروپ ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے حوالے سے اعمال کا رُخ متعین ہوتا ہے اور جزائے اعمال کا مرحلہ آتا ہے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

تو فرمودی رہِ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

اسی راہ پر چلنے والوں کو یقین ہوتا ہے کہ وہ کامیاب و کامران ہوئے ہیں، جب یہ یقین ہو جائے کہ زندگی کا مقصود اُس وجودِ مکرم سے وابستگی ہے تو سفرِ حیات بے سمت نہیں رہتا، یک گیر رہنا نویدِ حیات بھی ہے، اور امیدِ نجات بھی، کسی نے خوب کہا تھا:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

یہ ایک بامراد زندگی کی قوت بھی ہے اور راہِ حیات میں ثابت قدمی کی دلیل بھی، بظاہر دعویٰ محبت آسان نظر آتا ہے کہ ہر کہیں سنائی دیتا ہے مگر درحقیقت یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے، یہاں جذبوں کو پابندِ آداب بنانا پڑتا ہے، خواہشات کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور کبھی جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا لازم ٹھہرتا ہے، روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ عزم و یقین سے نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ استفسار فرمایا کہ بتایئے آپ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے، جان نثار تھے فوراً عرض کیا، اپنے وجود کے بعد دنیا کی ہر چیز اور ہر تعلق سے بڑھ کر مجھے آپ سے پیار ہے، ارشاد ہوا محبت کامل نہ ہوئی

WWW.NAFSEISLAM.COM

فوراً پکار اُٹھے، اپنی جان سے بھی بڑھ کر آپ سے محبت ہے۔ اس پر فرمایا "اَلْآنَ یَا عُمَرُ" اے عمر (رضی اللہ عنہ) اب محبت کامل ہوئی، یہی وہ منزل ہے جس کی تلاش ہر کسی کو ہے اور یہی جستجو ہر کہیں ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ساری عمر محبت کی اسی پناہ گاہ میں گزاری، نثر ہو یا نظم ایک ہی ترانہ لب پر رہا اور ایک ہی راہنمائی مرکز عمل و یقین رہی، آپ کے ہاں محبت مجرد دعویٰ نہ تھی بلکہ یہ وہ مسلسل عمل تھی جس میں کسی حال بھی انقطاع یا اضمحلال ممکن نہیں، آپ کے سامنے کئی مثالیں تھیں جہاں وفورِ عشق کا دعویٰ تھا مگر احکام کی بجا آوری سے صرفِ نظر تھا بلکہ طریقت کی مسندوں میں شریعت سے انکار تھا، محبت کا ہر لمحہ اظہار تھا مگر محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں سے کوئی رغبت نہ تھی حالانکہ کلیہ یہ ہے کہ ؎

"اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُحِبُّ مُطِیْعٌ"

مگر آفرین ہے اُس مردِ حق شناس پر جو عشق و محبت کا گھائل بھی تھا مگر سوزِ محبت کے اضطراب میں بھی آدابِ محبت کے تقاضوں سے آگاہ تھا، آداب کے سلیقے نے حرفوں کو بھی حرمت عطا کی تھی اور مفہوم کو بھی حدود آشنا رکھا تھا حتیٰ کہ اعمال و افعال کو شریعت کی شائستگی عطا کی تھی، "محمد یار" نام تھا اور صاحبِ اسم کے ہاں اس کی حرمت کا احساس قوی تھا، یہ ضرور یاد رہے کہ اس ہمنامی نے ہمسری کی تحریک کبھی نہ دی، ہر لمحہ وابستگی کی رہ دکھائی۔

ہم نامِ محمد ہوں، مداحِ محمدؐ ہوں
ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا دامان محمدؐ کا

اس لیے کہ یہی نسبت ہمہ وقت حصارِ عافیت ہے:

ڈوبا تو نکالا ہے، پھسلا تو سنبھالا ہے
میں بھول نہیں سکتا احسان محمدؐ کا

وارفتگی کا ایک اور اظہار جو ہمہ جہت بھی ہے اور ہمہ پہلو بھی

قمر چیر ڈالا کیا موم پتھر
زہے قوت دست و پائے محمدؐ

WWW.NAFSEISLAM.COM

بشر کو محمدؐ سے نسبت نہیں ہے
پڑھو غور سے ثنائے محمد
میرے منہ کو کیوں چومتا ہے زمانہ
کہ میں بن گیا نقش پائے محمدؐ

مگر خروشِ عشق میں بھی استقامت یقین اور توازن ایمان کی پہرہ داری موجود ہے، کہا

ہے مسجود میرا خدا جانتا ہے
خدائے محمدؐ بجائے محمدؐ

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کا محور یہی جذبہ محبت ہے، اس کا تفصیلی تذکرہ آپ کی شاعری پر گفتگو کے ضمن میں زیادہ مناسب ہوگا، اس مرحلے پر توجہ کا مرکز 'وعظ' ہے، آیئے اصحاب قلم کے تجربات سے عشق ومحبت کی کیفیات کا اندازہ لگائیں، سید بشیر احمد شاہ کا بیان ہے کہ:

''آپ کے تن من میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدت وتپش کا یہ عالم تھا کہ آپ ہمہ وقت اشک بار رہتے تھے یعنی آپ ہجر کی لذت کو اشکوں سے ملذذ کرتے تھے، آپ کی کئی راتیں جاگتے اور اشک بہاتے گذر جاتی تھی، آپ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قدر اشک بار رہتے تھے کہ آپ کی آنکھوں کو دیکھ کر آشوب چشم کا گمان ہونے لگتا تھا''۔

(بانگ سحر، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج خانپور ۷۔۲۰۰۶)

آپ کی ذات ہجر کی لذتوں سے ہی آشنا نہ تھی، وصال کے قرینوں سے بھی باخبر تھی اس لیے وجود میں ایک باوقار انکسار آ گیا تھا، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

''عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاعر کو تواضع وانکساری میں آخری حد تک پہنچا دیا تھا چنانچہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اب صرف اپنے محبوب کا نقش پا رہ گیا تھا''۔

شہ خیر الوریٰ کے عشق میں اب تو محمد بھی
محمد مصطفیٰؐ کا نقش پا معلوم ہوتا ہے

(قلمی مضمون)

بشری رحمٰن صاحبہ نے منزلِ شوق کے اس راہی کے فریدی سے محمد یار ہونے کا حوالہ دیا، لکھا:

''جب آپ فریدی ہوئے، تو رمزِ محبت سے آشنا ہوئے، دیدِ مزید کی لذت سے آگاہی ہوئی تو محمد یار، محمد کا یار بن گیا، محمد نام کا خمار ایسا تھا کہ تزکیہ نفس و معرفت الٰہیہ کی ساری منزلیں طے کر گئے، اپنے ہی نام سے نسبت کا عصا نکالا جس نے حیات کے چڑھے دریا کو بیچ دھارے میں سے دولخت کر دیا، جہاں وصالِ محبوب کا حسین سنگھم تھا وہیں پر خواجہ محمد یار کو دل کی ہر تمنا کا سراغ مل گیا''۔ (فیضانِ فرید رحمۃ اللہ علیہ)

ارشاد احمد عارف لکھتے ہیں:

''عشقِ رسول (ﷺ) ان کا اوڑھنا بچھونا اور مقصدِ حیات تھا، یہی وجہ ہے کہ فقط پنجاب جہاں ان کی خوش الحانی، جادو بیانی اور گرمی گفتار کا معترف اور گواہ ہے وہاں ان کا اصل تعارف تاجدارِ مدینہ سرورِ کائنات ﷺ کے عشق و محبت سے معمور ایک ایسے صوفی کا ہے جس کے شب و روز ذکرِ رسول ﷺ میں کٹتے اور حبِ رسول ﷺ کی دولت کو عام کرنے میں گزرتے ہیں''۔

(عاشقِ رسول ﷺ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ)

یہ تمام شہادتیں اس حقیقت کا واشگاف اعلان ہیں کہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے مہ و سال بلکہ شب و روز ایک ہی کیف میں گزرتے تھے، مقصودِ نظر کی یکتائی جب انسانی رویوں کو اسیر کر لیتی ہے تو پھر پریشان نظری کا کوئی لمحہ نہیں آتا، ایمان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ وحدت آشنائی کا ذوق پختہ ہو جائے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ اس حوالے سے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، اس لیے آپ کی علمی و فکری جولاں گاہ قربِ مدینہ کی لطافتوں سے عطر بیز ہے، آپ کا جہاں سے گزر ہوا یا آپ نے جہاں قیام کیا ایک خوشبوئے عقیدت نے ہر لمحہ ہالہ بنائے رکھا، سید فاروق القادری کی معلومات کا ماحاصل یہ ہے کہ:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے نصف صدی کا طویل عرصہ 'پیغام یار' کو عام کرنے میں گزارا، اس دوران ان کے خلاف فتوے جاری ہوئے، انہیں بدعتی اور کافر تک کہا جاتا رہا مگر وہ اپنے مشن پر برابر قائم رہے، آپ نے زندگی بھر مناظرہ بازی اور بحث وتکرار سے اجتناب کیا، میرا احساس ہے کہ برصغیر پر انگریز کی گرفت کے بعد عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبے میں کمزوری کے جو آثار پیدا ہو چلے تھے اسے دوبارہ زندگی عطا کرنے کے سلسلے میں خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا شمار فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی صف میں بآسانی کیا جا سکتا ہے''۔

یہ صف بندی واضح کر رہی ہے کہ یہ اعلانِ عشق صرف زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ یہ ہم خیال رویوں کے ساتھ ہم قدم بڑھنے کے عزم کی بھی غماز تھا، یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جبکہ خیال، عمل کا محرک اور عمل فکر کا موید بن جائے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہر دعویٰ دلیل رکھتا تھا اس لیے کہ اس کے پیچھے اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل پیرا ہونے کا وقار تھا۔

''آپ حب نبوی کا ایسا پیکر تھے جس کی ہر تار ذات نبوی کے کسی نہ کسی وصف وجمال سے جڑی ہوئی تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی، اسم گرامی آتا تو یوں تڑپ اٹھتے جیسے بے خبری میں کسی نے ہتھیلی پر انگارہ رکھ دیا ہو''۔

ایسا کیوں تھا؟ اس شدتِ محبت کی استواری کی تحریک کہاں سے ملتی تھی، اس پر فاروق القادری کا تبصرہ چشم کشا ہے:

''سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نتیجہ بھی یہی تھا کہ ان پاکیزہ اوصاف اور احکام کی تبلیغ وترویج کی جائے جن پر آپؐ فائز تھے، اس حیثیت سے ہم دیکھتے ہیں تو خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر تھی، آپ کا بیشتر وقت اللہ (تعالیٰ) اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قیل وقال میں گزرتا، آپ نے زندگی ایک عام فرد کی حیثیت سے بسر کی، عام آدمیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا، سب لوگوں کو حتی الامکان راضی رکھنے کی کوشش کرنا، اپنے لیے کوئی

WWW.NAFSEISLAM.COM

امتیازی علامت قائم نہ کرنا، اہل بیت اور مشائخ کے خانوادوں کے سامنے اپنی ہستی کو مٹا دینا، اپنی دوستی دشمنی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تعلق کو معیار بنانا آپ کی ایسی خصوصیات ہیں جنہیں محبت رسول ﷺ کے بغیر نہیں اپنایا جا سکتا''۔ (حضرت خواجہ محمد یار اور عشق رسول ﷺ)

محبت، ذات کے مجموعی تاثر سے قوت پاتی ہے، ہر عضو بدن دعوتِ نظارہ بنتا ہے تو ہر لاحقہ، ذات تک رسائی کا وسیلہ ہوتا ہے، یہ لاحقے ان نسبتوں سے عبارت ہوتے ہیں جن کا کوئی پہلو ذاتِ محبوب تک رسائی کا سبب بنتا ہے، خاندان، شہر، مکانی و زمانی حوالہ حتیٰ کہ دائرہ اتصال میں آنے والے شجر و حجر، سب محبوب ٹھہرتے ہیں، یہ ہمہ جہتی تعلق خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہر رویے اور ہر عمل سے عیاں رہا۔ صرف ایک حوالہ جو موصول الی المطلوب کا عمدہ ذریعہ ہے، کا ذکر کرتے ہیں، سادات کرام کے احترام و ادب کے حوالے سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ احباب نے شکایتاً عرض کیا کہ آپ اس رویے میں غلو کرتے ہیں کہ اس کو بھی وہی مقام دیتے ہیں جو اصل سادات ہے، اگرچہ وہ جھوٹا دعویٰ کر رہا ہو، آپ ایسے لوگوں کے لیے احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں، جواب دیا ''میں تو سید کو سلام کرتا ہوں کرتا رہوں گا'' اور دلیل کے طور پر شیخ بہاء الحق متانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا کہ لوگ دیکھتے تھے حضرت شیخ ہر اس سید گھرانے کے فرد کو ایک سو روپیہ نذرانہ پیش کرتے ہیں جو سلام کے لیے آتا ہے، ایک نادار موچی نے جب یہ رویہ دیکھا تو باوجود یہ کہ معروف تھا مگر دو جوان بیٹیوں کے نکاح کے لیے سید ہونے کا بہانہ رچا آیا، مصاحبین نے پہچان لیا مگر حضرت شیخ نے رخصتی پر اُسے دو سو روپے نذرانہ دیا، ساتھیوں نے عرض کیا کہ یہ تو موچی تھا آپ نے ایسا کیوں کیا اصرار پر آپ نے فرمایا سید الثقلین ﷺ کا ارشاد تھا کہ ایک مجبور میرے روپ میں تمہارے ہاں آ رہا ہے اس کا خیال رکھنا، جواب دیا ''اب آپ ہی بتائیں کہ میرے آقا و مولا ﷺ کا حکم تھا تو میں کیوں کر اس کی تعظیم اور خدمت بجا نہ لاتا''۔

ایسے متعدد واقعات مشاہدین و حاضرین نے نقل کیے ہیں، مختصر یہ کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ و ارشاد کا مرکزی موضوع ہمیشہ عشق رسول ﷺ رہا۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

مسئلہ وحدۃ الوجود:

اسلام دین توحید ہے کہ عقائد اسلام کی اساس اور بنیاد عقیدۂ توحید ہی ہے، وہ خالق و مالک جس نے انسان وحیوان ہی نہیں مخلوق کا ہر مظہر تخلیق کیا اپنی ذات میں بھی یکتا ہے اور اپنی صفات وقدرت میں بھی واحد ہے، ذات وصفات کے کسی اظہار میں بھی کسی اور کی شراکت کا تصور شرک ہے، وہ حی وقیوم ہے کہ :

"وجودہٗ بِہٖ وَجُوْدُ کُلِّ شَیْءٍ بِہٖ"

اس کا وجود قائم بالذات ہے جب کہ ہر چیز کا وجود اس کے سہارے قائم ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے کہ نہ کسی نے اس کو جنا اور نہ کسی کو اس نے جنا، وہ اس قدر بے نیاز ہے کہ کوئی اس کی مثل بھی نہیں، اسی کی قدرت سے جہاں تخلیق ہوئے اور اس کی قدرت ان کو قائم رکھے ہوئے ہے، توحید کا عقیدہ علماء امت کی محفلوں میں ہر دور میں زیر بحث رہا، وحدت آشنائی کا جوش کبھی اس قدر نمایاں ہوا کہ غیر حق کسی وجود کا ہونا ہی تسلیم نہ کیا، مست الست بزرگ غیر کے وجود کے خیال کو بھی شرک کہتے ہیں، یقیناً یہ تصور توحید خواص کی مجالس کا موضوع تھا مگر بسا اوقات ان لوگوں نے اس پر ہاتھ ڈالا جو وحدت کے تقاضوں کو نہ جانتے تھے، اگر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اس پر گفتگو کریں تو عقیدے کی متانت ضرور محافظ رہے گی، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ عقیدہ مرکز ایجات بنا، وحدت الوجود کی آپ کے بعد تمام تشریحات وتوجیہات آپ کے اثرات لیے ہوئے ہیں، مخالفت بھی ہوئی اور موافقت کی صف بندی بھی ہوئی، صوفیاء کے ہاں ایسے مباحث ہر دور میں زندہ رہے، شعراء نے بھی ان بحثوں میں حصہ ڈالا، اگر نقشبندیہ اس کی بعض تشریحات سے متفق نہ تھے بلکہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے وحدت الشہود کا تطبیقی نظریہ بھی سامنے آیا تو دیگر سلاسل تصوف، خصوصیت سے چشتیہ کے ہاں فکر کی ساری اساس اسی نظریہ پر رہی، سید عبدالرحمٰن بخاری کی رائے ہے کہ :

"چشتی وبستانِ تصوف کے مابعد الطبیعاتی عقائد کی اساس وحدت الوجود کا

WWW.NAFSEISLAM.COM

نظریہ ہے، چشتیہ تعلیمات کا سارا فکری منظر نامہ اسی فلسفہ کے گرد تشکیل پاتا ہے، اس لیے برصغیر اور ایران کے دیگر صوفی شعراء کی طرح خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے نظامِ فکر و فن کا تانا بانا بھی اساسی طور پر اسی عقیدے سے بُنا ہوا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں وحدت الوجود کا اعلانیہ، پرجوش اور دوٹوک اظہار رہوتا ہے، تاہم انہوں نے اس نظریے کو مجرد تعقلائی و فلسفیانہ سطح پر نہیں برتا اور نہ ہی اسے زندگی کی پست سطحوں تک اترنے دیا بلکہ ایک مسلم صداقت کے طور پر اس کے مذہبی اور سماجی نتائج اخذ کیے اور اسے ایک تحریک و افادیت بخش سماجی نظریے میں ڈھال کر پیش کیا ہے"۔ (پیکر عرفان و آگہی)

وحدت الوجود کے اسی سماجی رُخ کی طرف سید فاروق القادری اشارہ کرتے ہیں:

"یہی وحدت الوجود کا وہ تصور ہے جو الخلق عیال اللہ (مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کا نظریہ پیش کر کے انسانوں میں تسلی، وطنی اور دوسری تمام تفریقیں مٹاتا ہے، اور یہاں پہنچ کر انسان اپنے بھائی بند (انسان) تو درکنار جانوروں، پرندوں بلکہ نباتات اور جمادات سے بھی محبت کرنے لگتا ہے، خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اپنے تمام پیشرو صوفیاء کی تقلید میں اسی مسلک محبت اور مشرب عشق کے علمبردار ہیں"۔ (حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ وحدت الوجود کے بے باک ترجمان تھے ان کے مواعظ میں یہ عقیدہ بار بار موضوعِ بحث و تقریر بنتا تھا مفتی محمد مختار احمد درانی نے اس کا ذکر علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بھی کیا تھا کہتے ہیں:

"فقیر نے حضور قبلہ کاظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں دست بستہ عرض کی کہ سنتے ہیں امیر کاروانِ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضور خواجہ محمد یار صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر وحدت الوجود کے موضوع پر خطابات فرماتے تھے"۔

بشیر حسین ناظم تحریر کرتے ہیں کہ:

WWW.NAFSEISLAM.COM

"ایک دن میں نے ان (یعنی علامہ محمد حسین عرشی) سے پوچھا کہ آج کل یا پچھلے کئی سالوں سے مسئلہ وحدت الوجود پر کون سی شخصیت علمی لحاظ سے مستند ہے، علامہ محمد حسین عرشی صاحب نے بتایا کہ حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ مستند شخصیت ہیں لیکن جس شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسرار و غوامض سمجھے اور انہیں اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا وہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ تھے"۔

(عبدالنبی المختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں، کچھ تذکرے)

مسئلہ وحدت الوجود کے بیان میں خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی انفرادی و امتیازی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے رہبر رشید محمود تقابلی جائزہ لیتے ہیں، گلشن تصوف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مگر فلسفۂ وحدت الوجود کے جن پھولوں کی طرف ہماری قوت شامہ حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دم قدم سے متوجہ ہوئی، انہوں نے مشام جاں کو معطر کر دیا، اس سوتے کی طرف جس نے دست طلب بڑھایا نور کے دھاروں سے مستفید ہو گیا، مفاہیم و معانی کی روشنی کا یہ جھرنا سرمدی ہے" مزید کہا "فلسفہ وحدت الوجود کو تقریر میں بھی قابل فہم بنا دیا اور شعر میں بھی سہل ممتنع بنا دیا"۔ (آشنا و راز)

سید فاروق القادری وحدت الوجود کے فریدی نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"راقم السطور کے نزدیک خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ وحدت الوجود کے صرف شارح اور مفسر نہیں ہیں، وہ اس کے عملی معلم اور پیکر ہیں، جب وجود ہے ہی ایک تو ظاہر ہے کہ اس کے سوا کا تصور ہی عنقا ہے، اب یہی وجود محبّ بھی ہے محبوب بھی، طالب بھی ہے مطلوب بھی، وہ ظاہری اشکال و اجسام کو وجودِ حقیقی کے پرتو یا عکس سے قطعاً کچھ اور نہیں سمجھتے، یہی وجود ان کے ہاں محمد (قابل تعریف یا لائق حمد) ہے، یوں بھی اگر اس نظریے کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھیں تو تمام اکابر و صوفیاء کے نزدیک حقیقت محمدیہ ہی وہ حقیقت الحقائق ہے جسے انہوں نے النفس الکائنہ، القلم الاعلیٰ، نور الانوار اور انسانِ کامل

WWW.NAFSEISLAM.COM

تحریک آزادی، تشکیل پاکستان:

انسان روشن ضمیر ہو، تلاش احسن کا ذوق رکھتا ہو اور ملی درد کا امین ہو تو اجتماعی فلاح کی ذمہ داری سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا، صوفی جس کی ساری تگ و دو کا حاصل

اصلاح معاشرہ ہوتا ہے کبھی کوتاہ نظر نہیں ہوتا، وہ فرد کی تربیت کی ذمہ داری بھی نبھاتا ہے اور معاشرے کی مجموعی فلاح کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ تاریخ تصوف کا ورق ورق شہادت دے رہا ہے کہ صوفی کا حلقہ اثر بہت وسیع ہوتا ہے، اسے دلوں کی تسخیر کا ہنر آتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی تسخیر دیرپا ہوتی ہے، صدیاں گزرنے پر بھی اس کی فرماں روای کو زوال نہیں آتا، وہ شہر میں رہے یا صحرا میں، ارباب ثروت میں سے ہو یا تہی دست، گروہ میں ہو یا تنہا مگر اس کی اثر آفرینی کسی محدودیت کا شکار نہیں ہوتی، اُس کا فیضان، ہواؤں کی روانی کی طرح پر کہیں ارتعاش کا ذریعہ ہوتا ہے، برصغیر میں مسلمان حکمرانی زوال پذیر ہوئی، سازشوں کا شکار ہوئی یا خواہشات نفس کے گرداب میں غرق ہوئی مگر یہ حقیقت ہے کہ صوفیاء کی فرماں روائی ہر دور میں قائم رہی برصغیر کا مسلمان ۱۸۵۷ء کے المیہ کے بعد سیاسی طور پر نڈھال ہو گیا تھا، مایوسیوں نے یوں گھیر لیا تھا کہ اپنی قوت پر سے اعتماد اٹھ گیا تھا، استعمار کی مکارانہ چالیں جسد ملت کو ڈھلا گئی تھیں اور جو بچ گیا تھا اُسے عیار ہمسایہ اپنے دام تزویر میں لانے کی کوشش میں تھا، اس قدر وحشت پیا تھی کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ بھی ناپید ہوا جا رہا تھا۔ ایسے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی حقائق شناس نظر ملت کا سہارا بنی، غلامی سے نکلنے کی تدبیر سامنے آئی، قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی پختہ کاری وسیلۂ ظفر بنی ایک تحریک نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانانِ ہند ایک طاقت ور رشتۂ اخوت میں پروے گئے اگرچہ ملی شناخت کے اس دور میں شپرہ چشمی کے مظاہرے بھی ہوئے، خالص مسلمان علاقوں میں افتراق کے بیج بوئے گئے اور بہت سے راہنمائی کا دعویٰ کرنے والے وقف دیر بھی ہوئے اور رہن غیر بھی، ان حالات میں راست فکری ایک نعمت تھی اور یہ اس صوفیانہ فکر کا نتیجہ تھی جو ہمیشہ راست رو رہتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا قیام صوفیاء کی بصیرت اور تعاون کی وجہ سے ممکن ہوا ہے، مومنانہ بصیرت کا کمال تھا کہ علماء حق اور صوفیاء باصفا مجموعی طور پر اس تحریک کے

دست و باز و تھے، ان اکابر میں ایک نام خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے، ان کی کاوشوں سے پس ماندہ علاقوں اور صحرائی بود و باش کے خطوں میں تحریک پاکستان ایک حقیقت بن کر سامنے آئی، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک پاکستان کی نظریاتی تائید ہی نہ کی عملی جد وجہد میں بھی بھرپور حصہ لیا، سرائیکی علاقہ تو آپ کا وطن مالوف تھا۔ اس کے ذہنی رجحانات اور قلبی میلانات سے آپ بخوبی آگاہ تھے اس لیے اس علاقہ میں عوام و خواص پر آپ کے علمی و روحانی اثرات بڑے نمایاں تھے، یہ بھی ایک سماجی حقیقت ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں یا باجگزار طبقوں کی ذاتی رائے عموماً مفقود ہوتی ہے، دیہاتی ہو یا شہری اگر اُن کی معیشت کسی جاگیردار یا سرمایہ دار کے قبضے میں ہو تو آزادیٔ فکر کی کوئی تحریک کارگر نہیں ہوتی، پنجاب کے صوبے کا اکثر حصہ ایسے ہی حاقت ور لوگوں کے قبضے میں تھا، معاشی بدحالی کے خطوں میں معاشی رویے دولت مندوں کی اجازت سے ہی متعین ہوتے ہیں، بندۂ مزدور اس قدر جبر کا شکار رہتا ہے کہ اُس کی ذات، خاندان، رشتہ داریاں بلکہ دینی ذمہ داریاں بھی کہیں اور مقام پر طے ہوتی ہیں، بقول حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ

ع ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اس ماحول میں آزادانہ فیصلے ایک خواب ہوتے ہیں، سرائیکی علاقہ ایسے ہی جبر کا شکار تھا، ایک اور خطہ جسے روایات کے بندھنوں نے یوں جکڑ رکھا تھا کہ کسی ذاتی سوچ کی نمود ممکن نہ رہی تھی، یہ صوبہ سرحد تھا جہاں کانگریس کی ریشہ دوانیاں اتنی منہ زور تھیں کہ خالص مسلم اکثریت کے علاقے کو تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے سے محروم رکھا گیا تھا، سوچا جائے کہ جب برصغیر کو مسلم اور غیر مسلم کے حوالے سے تقسیم ہونا تھا اور یہ فیصلہ ایک مسلسل جد وجہد کے بعد ہو چکا تھا تو صوبہ سرحد کو ریفرنڈم کی سازش کا شکار کیوں کیا گیا، اسی لیے کہ مکر و فریب کی سیاست کے ماہرین ان لوگوں کو ورغلا کر کے جد ملت اسلامیہ سے کاٹ دینا چاہتے تھے، یہ سازش کی انتہا تھی کہ بھائی سے بھائی کا تعلق پوچھا جا رہا تھا،

وہ علاقے جن کا پاکستان میں شامل ہونا عملاً ممکن نہ تھا وہاں کے مسلمان تو مسلمانانِ ہند کی آزادی کی اس تحریک پر قربان ہو رہے تھے اور وہ لوگ جو جغرافیائی وحدت کا حصہ تھے اُن سے شمولیت یا عدم شمولیت کا سوال کیا جا رہا تھا، یہ مرحلے دشوار بھی تھے اور اپنوں کے خلوص کا امتحان بھی تھے، اس لیے اس پر خصوصی توجہ دی گئی کہ کہیں فریب دہی کی یہ سازش جسد ملت کو ٹکڑا ٹکڑا نہ کر دے، اس گھمبیر ماحول میں قیادت کی نظر جن اصحاب عزم و یقین پر پڑی اُن میں بھی خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ پوری قوت سے شامل تھے، آپ نے سرائیکی علاقہ سے لے کر سرحد کے ناقابل عبور علاقوں تک ملت کی بیداری کے لیے وعظ و تقریر کا وسیع سلسلہ شروع کیا، آتش نوا تو آپ تھے ہی، اب مقصد کی واضح تعبیر بھی سامنے آ گئی تھی اس لیے حرف حرف میں خلوص کی تمازت جلوہ نما تھی، تقریر تقریر گئے اور یوں گویا ہوئے کہ ہندو ملفوفیت کو تار تار کر دیا، سچی بات یہ ہے کہ راست فکری، ہمہ جہت ہوتی ہے۔ خلوص کی اپنی جھنکار ہوتی ہے۔ کانگریس کے ہمواؤں نے دین کا حوالہ بھی دیا، ازدیادِ علم کا نعرہ بھی لگایا، خدمت و تعاون کو وسیلہ بھی اپنایا، غرضیکہ ہر مرغوب حربہ آزمایا گیا مگر ایمانی بصیرت کی قوت کا مقابلہ نہ ہو سکا، صدق و وفا کے علمبردار دور سے آئے تھے مگر دلوں کے قریب تھے، لہجہ بھی زیادہ مانوس نہ تھا، ہمسائیگی کی گرفت بھی نہ تھی، زبان کی بیگانگی بھی حائل تھی مگر دل کھنچتے چلے گئے اس لیے کہ خلوص و محبت کی زبان بھی اپنی ہے اور لہجہ بھی اپنا، جگر مرادآبادی نے کہا تھا

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

یہی ہوا کہ صداقت نے دل تسخیر کر لیے اور حقیقت منوا لی گئی، سرحد کا ریفرنڈم اعلانِ حق ثابت ہوا اس مہم کو سر کرنے میں اکابر کی فہرست میں خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی درخشندہ ستارا ہے، اس حوالے سے بشیر حسین ناظم کا ذاتی مشاہدہ ہے لکھتے ہیں:

"ان دنوں تحریک پاکستان و تخلیق پاکستان کے لیے جدوجہد عروج کو پہنچنے والی

تھی، قرار دادِ پاکستان کے بعد بریلوی مکتبِ فکر کے چند علماء (اللہ تعالیٰ ان کے دنیوی و روحانی مراتب و مدارج بلند فرمائے) نے پورے برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ پاکستان میں زبردست علمی حصہ لیا اور مرکزی حزب الاحناف کے سالانہ جلسوں میں قرار دادِ پاکستان کے عملی پہلوؤں پر کام کرنے کے لیے علماء کرام کو مخصوص علاقوں میں متعین کیا گیا، حضرت ممدوح ما سرکار محمد یار فریدی علیہ الرحمہ کو بنارس سنی کانفرنس کے بعد پورے سرائیکی بیلٹ میں پاکستان کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے فرائض سونپے گئے۔ آپ نے صرف سرائیکی بیلٹ میں ہی نہیں تحریکِ پاکستان و تشکیلِ پاکستان کے لیے کام کیا بلکہ حضرت مولانا محمد بخش مسلم علیہ الرحمہ کے ساتھ پنجاب کے اضلاع جہاں یونینسٹ پارٹی کا اثر و رسوخ تھا، میں بھی کامیاب دورے کیے اور انگریز کی ٹوڈی پارٹی کا طلسم و سحر اچھی طرح توڑا، حضرت مولانا مسلم علیہ الرحمہ نے بتایا کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمہ صوبہ سرحد ریفرنڈم کے وقت بھی ان کے ساتھ تھے، انہوں نے پختونوں کو قیامِ پاکستان کی برکات سے آگاہ کیا اور علالت کے باوجود پہاڑی علاقوں میں بھی ان کے ساتھ جا کر سرحدی گاندھی عبدالغفار خان، ڈاکٹر خان صاحب اور دیگر مخالفین پاکستان کو منہ توڑ شکست دی۔"

(عبدالنبی المختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں کچھ تذکرے)

ایک درویش جو فیضانِ علم کے سلاح سے بھی لیس تھا اور جسے ذکر و فکر ہی نہیں، زبان کے استعمال کا فن بھی آتا تھا، جس کے لفظوں میں آبشار کی سی روانی تھی اور جس کے جذبوں میں عشق و مستی کی رستاخیزی بھی تھی، وہ جب کسی ملی فریضے کی ادائیگی کا بیڑا اٹھاتا ہے تو کامیابی استقبال کرتی ہے۔ تحریکِ پاکستان میں ایسے ہی اصحاب عزم شامل تھے کہ جسے لوگ دیوانے کا خواب کہتے تھے ایک حقیقت ثابتہ بن کر تعبیر آشنا ہوا، وطن عزیز کی مٹی گواہ ہے کہ اس پر سے کیسے کیسے آتش نفس راہنماؤں کا گزر ہوا ہے، بصیرت کا

در وا ہو اور گوشِ نصیحت نیوش بیدار ہو تو آج بھی ان بزرگوں کے نقوشِ قدم دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور ان کے کلماتِ خیر کا امرت، ساعتوں کو نوازتا ہے،

ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

بدقسمتی یہ ہوئی کہ مؤرخ کا قلم اُن کے ہاتھ آلگا جو صرف حرفوں کا رزق کھانے پر کمربستہ ہیں، اگر دیانتداری سے سفر استقلال پاکستان کی روداد قلم بند کی جائے تو خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ اور آپ ایسے بہت سے روشن ضمیر بزرگ لوحِ تاریخ پر دمکنے لگیں گے، کاش حق شناس مؤرخ یہ فرض بھی انجام دیں اور قوم کی جوان نسل کے سامنے 'حق بحقدار' کی صداقت کا علم بلند کریں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایک شاعر کی حیثیت سے

انسان ایک معاشری وجود رکھتا ہے، معاشرہ اسی حس اجتماع کا مظہر ہوتا ہے، انسان کی قوتِ تعبیر اس اجتماع کا اساسی جوہر ہے کہ قدرت نے "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کا اختصاص انسان ہی کو عطا کیا ہے۔ تدبّر اور تفکر احسنِ تقویم ہونے کے بنیادی حوالے ہیں، اشتراک فکر انسان کی بھی ضرورت ہے اور اجتماع کی بھی۔ اس اشتراک کا ذریعہ قوتِ بیان ہے کہ اس کے سہارے انتقالِ فکر ممکن بنتا ہے، نقل افکار کا یہ ملکہ انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز رکھتا ہے، انسان اپنی تفویض کردہ صلاحیت کو جب کسی فکر کا محرک بناتا ہے تو اس کے وجود کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس فکر کو دوسروں تک منتقل کرے تا کہ اجتماعی فکر کی افزائش ہو، طریق نقل یہ ہے کہ انسانی فکر یا سوچ صوت میں ڈھلتی ہے، صوت اُن حروف و کلمات میں تحویل ہوتی ہے جو دوسروں کے لیے مانوس ہوتے ہیں، یہ اصوات جو معاشرتی پہچان میں ڈھل چکی ہوتی ہیں ہوا کے دوش پر سامع کی سماعت سے ٹکراتی ہیں، سماعت قبولیت کی منزل سے گزر کر سامع کے اندر قرار لیتی ہے اور وہاں ایک اور تحویلی عمل انجام پاتا ہے، وہ یہ کہ وصول کیے گئے اصوات دوبارہ فکر میں بدل جاتے ہیں، اس طرح نقل افکار کا عمل مکمل ہوتا ہے جس سے ایک کے افکار دوسرے کے افکار کی صورت لے لیتے ہیں، قوتِ اظہار کا یہی شرف ہے کہ نقل افکار کا یہ سارا عمل بہر طور معیاری ہو، سوچ، صوت میں درست طور پر تحویل ہو۔ صوت مناسب کلمات کا روپ لے، کلمات کا اخراج

WWW.NAFSEISLAM.COM

باضابطہ ہو اور وہ کلمات سامع کی سماعت تک درست پہنچیں اور وہاں صوت و کلمہ کی فکر میں تحویل با سلیقہ ہو، کسی ایک مرحلہ پر کوتاہی، خامی یا ناکامی سارے عمل کو بے توفیق بنا دیتی ہے، انسانی معاشرہ ان مراحل کی بحفاظت تکمیل کے لیے تربیت فراہم کرتا ہے، جہاں معاشرہ فعال مگر مثبت کردار انجام دیتا ہے وہاں نطق و سماعت کی پختہ کاری جنم لیتی ہے، انسانوں کے درمیان فکری اور سماجی ربط اسی صلاحیت بیان کا مرہون منت ہے، اس لیے باخبر اقوام تدریس زبان پر پوری توجہ دیتی ہیں اور اس کے لیے مسلسل مشق اور تدریب کا اہتمام کرتی ہیں،

'زبان' انسان کا وہ جوہر ہے جس سے نقل افکار ہی نہیں، انسان، انسان کے درمیان تعلق اور رابطہ بھی استوار ہوتا ہے اور انسانی معاشرت کی تشکیل ہوتی ہے، تعبیر، اشتراکِ عمل کی اساس ہے اور یہ دو طرح ممکن ہے، نثر میں یا نظم میں، اگرچہ درمیانی شکلیں بھی ہر دور میں دریافت ہوتی رہی ہیں مگر نظم و نثر کی تقسیم ہی ہمیشہ افکار کے بروز کا ذریعہ رہی ہے، نثر کے لیے کون سے قاعدے اور ضابطے مقرر رہے ہیں یہ ہماری اسی تحریر کا موضوع نہیں ہمارا مقصود شعر ہے اس لیے اسی پر توجہ دی جارہی ہے۔

شعر ایک اندازِ اظہار ہے، اس سے شاعر کے افکار زیادہ قوت کے ساتھ سامع تک پہنچتے ہیں، یہ سوال ہر طالب علم کے سامنے رہا ہے کہ شعر ہے کیا؟ تاریخ ادب میں بنیادی اشتراک کے باوجود بہت سی آراء ضمناً بیان ہوئی ہیں جن میں قدرے اختلاف ہے، عموماً کہا گیا کہ شعر ایسا کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ ہو، اس پر زور بھی دیا گیا کہ ان بنیادی عناصر کے بغیر شعر کی صورت نہیں بنتی، یہ ضرور کہا گیا کہ قافیہ کی اہمیت تو بہت ہے مگر اس کی حیثیت وزن کے مقابلے میں ثانوی ہے، ظاہری ہیئت کے اعتبار سے یہ تعریف مستند سمجھی گئی ہے مگر عرب کے ایک با اثر ناقد ابن رشیق (م: ۴۶۳ھ) نے شعر کو چار عناصر سے ترتیب پانے والا کلام کہا ہے، لفظ، وزن، معنی، قافیہ، معلوم ہوا ابن رشیق کے ہاں وزن اور قافیہ کے علاوہ لفظ اور معنی کو بھی اہمیت حاصل ہے، لفظ، معنی، جسم و روح

WWW.NAFSEISLAM.COM

کی طرح ہیں، پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ شعر وزن، قافیہ، لفظ و معنی کے ضابطوں سے ترتیب پاتا ہے مگر دراصل یہ شاعر کے خیالات، جذبات اور میلانات بلکہ اُس کے مجموعی شعور کی ایسی سچی جھلک ہوتا ہے جسے سامع اپنے دل کی آواز اور روح کی تڑپ محسوس کرتا ہے، شعر، اظہار کی ایسی اکائی ہے جو تاثیر کی سرحد تبھی عبور کرتی ہے جب اس کے اندر جذبۂ صادق ہو، ایسے شعر ہی انسانی ذہنوں کو اسیر کرتے ہیں اور ایسے شعر کہنے والے شاعر کو ہی حیات دوام حاصل ہوتی ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ شعر نے معاشروں کی تہذیب و تشکیل میں بہت اہم کردار انجام دیا ہے، شعر شعور انسانی کا ترجمان ہے، وہ شاعر جو پختہ شعور، پرخلوص جذبے اور کونیاتی صداقت کا ترجمان ہو، اثر آفرین ہوگا، اور اگر اُسے بات کہنے کا سلیقہ بھی حاصل ہو اور وہ مطابق موقعہ، لہجہ بدل کر آہنگ کے تنوع اور اصناف کے تغیر کے ساتھ بات کہہ سکے تو وہ قاری یا سامع تک پُرتاثیر اور پُرکیف رسائی پاتا ہے، اور اگر اُسے جو کہنا ہے وہ لائق اخذ اور قابل اعتماد صداقت ہو تو شعر دو آتشہ ہو جاتا ہے، ایسا شعر دوام پاتا ہے اور ایسے شاعر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

شعر، مضامین شعر کے حوالہ سے متعدد اصناف میں تقسیم ہوتا ہے ہیئت اور صورت کی نسبت سے بھی کئی صورتیں اختیار کرتا ہے، بعض شعراء ایک ہی اسلوب کے حامل ہوتے ہیں کہ غزل کہتے ہیں یا نظم، قطعہ کہتے ہیں یا رباعی، اسی طرح بعض مرثیہ کہنے میں نام پاتے ہیں تو بعض ہجو نگاری میں شہرت پاتے ہیں لیکن باکمال شاعر، تمام اصناف یا بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں جبکہ کچھ ایسے شاعر بھی ہیں جو کئی زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں اور ہر زبان کے آداب کو جانتے ہیں، جس شاعر کا ہم ذکر کرنا چاہ رہے ہیں وہ ایسے ہی کثیر الجہت شاعر تھے۔ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری، موضوع و ہیئت کے اعتبار سے بڑی متنوع ہے اگرچہ ہر مظہر ایک ہی وجود کی نشاندہی کرتا ہے، آپ ایک واعظ بھی تھے جن کے حلقہ وعظ میں لوگ سانس روک لیتے تھے کہ تاثر

WWW.NAFSEISLAM.COM

تحلیل نہ ہو جائے۔ آپ صوفی تھے کہ صوفیاء کا سا وقار رکھتے تھے، گفتگو میں ادبی حوالہ بھی تھا اور عشق و مستی کا وفور بھی، آپ کا دیوان جسے آپ نے ''دیوان محمدی'' قرار دیا ہے، ادب و جذب کا حسین پیکر ہے۔ کوشش کریں گے کہ اس دیوان کا ناقدانہ جائزہ بھی لیں اور دنیائے شعر میں اس کی حیثیت و مقام کا تعین بھی کریں۔ اس حوالے سے ہم عصر علماء کی آراء کا ذکر بھی کریں گے اور نامور ادباء کے تاثرات کا حوالہ بھی دیں گے۔

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے شاعر تھے جن کے خیال و تصور پر صوفیانہ افکار کی گہری چھاپ ہے اس لیے آپ کی شاعری اُس قبیل کی ہے جس میں امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۲۵ھ) مؤلف فوائد الفواد حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۲۸ھ)، شیخ حامد جامی (م:۹۴۲ھ) صاحب سیر العارفین، ملا شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۰۷۲ھ) جیسے تصوف نگار شامل ہیں، یہی نہیں اسی گروہ حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۰۲ھ) اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۱۷۶ھ) جیسے نابغہ روزگار اہل علم و فضل بھی موجود ہیں۔ شعری میدان میں اردو کا باکمال شاعر خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۷۸۳ھ) اور قاضی طالا محمد پشاوری رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۲۹۷ھ) جیسا صاحب فن آپ کے پیش رو ہیں، ان سب سے زیادہ آپ کے شعر اور خیالات پر سلسلۂ چشتیہ کے امام حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (م:۶۶۰ھ) اور خصوصیت سے حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۳۱۹ھ) کا رنگ نمایاں ہے، برصغیر کی سیاسی و دینی کیفیات کا بھی آپ نے ایک حساس شاعر کی حیثیت سے اثر قبول کیا ہے، برصغیر آپ کے دورِ حیات میں بدترین غلامی کا شکار تھا، ایسے میں ارفع خیالات اور پاکیزہ معمولات کی حفاظت کرنا ہر دردمند انسان کا فرض ہوتا ہے، برصغیر میں کیا کیا طوفان اٹھ رہے تھے، ان طوفانوں کے سامنے حصارِ ملت کو قائم رکھنا کس طرح ممکن ہوا اور کون کون مسیحائے وقت تھے جنہوں نے نیم مردہ جسدِ ملت میں مدافعت کی قوت پیدا کی اور تحفظ عقیدہ و صیانت عمل کا معرکہ سر کیا، آیئے اس دور کے حالات کا ایک مختصر سا جائزہ لیں۔

اسلام کے آفاقی پیغام کی اساس عقیدۂ توحید ہے، ایک خالق، ایک رازق،

WWW.NAFSEISLAM.COM

ایک معبود اور ایک مالک، غیر کی کوئی صورت قبول نہیں، پیغام اسلام یک نظری کا داعی ہے اور یکجائی کا محرک، اس سے وحدت کی نمود ہوتی ہے اور اتحاد انسانیت کی عملی اساس واضح ہوتی ہے، خالق واحد کی تخلیق میں وحدانیت کا ایقان اور یکتائی کا تصور قرب کی راہیں دکھاتا ہے، صوفیاء کے افکار کا یہ تصور توحید مرکزی نقطہ رہا ہے، 'الہ واحد' کا عقیدہ "کلکم من آدم" کے حسی حوالے کا اعتبار قائم کرتا رہا ہے، صوفیاء کی ساری تگ ودو اسی وحدت آشنائی کو آسان بنانے کے لیے رہی ہے مگر بدقسمتی سے بعض ناپختہ کار مدعیانِ تصوف اس وحدت شناسی میں مغالطوں کا شکار ہو گئے، ہندو ویدانت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور امتیازات ایمان وکفر کی پامالی کا آغاز ہوا، سب سے بڑا فتنہ یہ اٹھا کر مقام نبوت کی عظمت سے انکار ہونے لگا، شریعت کے ضابطے پامال ہونے لگے اور تو اور اخلاق وآداب کے ضابطے بھی ٹوٹنے لگے، رسالت کی عظمت سے صرف نظر نے عملی بے باکیاں پیدا کر دیں، ختم نبوت کے اساسی عقیدے کا انکار اسی بدعملی اور بے باکی کا شاخسانہ ہے، نبوت کے دعوے بھی ہوئے اور الہام کے بھی، خودفریبی اور خودنگری نے جاہلانہ رویوں کو جنم دیا تو ملت فکری وعملی انتشار کا شکار ہوگئی، یہ دور بہت کڑا تھا، ظالم ومخالف حکمرانی اور معاند ہمسائیگی فسادِ نظری کا ذریعہ بنی، ایسے دور میں سب سے مقدم ضرورت نظریاتی اصلاح کی تھی، یہ اصلاح صرف ایک صورت میں ممکن تھی کہ انتشارِ ذہنی کا مداوا کیا جائے اور یہ تبھی ممکن تھا جب فکر وعمل کو مرکز آشنا کیا جائے۔ مرکزی وجود اور وحدتِ نسل کا اصل حوالہ صرف اور صرف یہ تھا کہ نبی اول وآخر ﷺ سے وابستگی کو مستحکم کیا جائے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علماء حق اور صوفیاء باصفا پر یہ بڑی ذمہ داری آ گئی تھی کہ گروہوں، نسلوں، قبیلوں اور علاقوں میں بٹی ہوئی قوم کو پھر سے سوئے حرم لے جائیں اور اُسے یقین دلائیں کہ اُس کا فرض ہے کہ

ع بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہم اوست

خوش قسمتی یہ کہ علماء وصوفیاء نے یہ کردار پوری تندہی سے انجام دیا، اگر مولانا فضل حق خیرآبادیؒ

کی نظم ونثر دعوتِ فکر کا موثر ذریعہ بنی اور اگر فاضل بریلی مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر وتقریر کا ایک ایک کلمہ اور ایک ایک حرف ثبات عقیدہ کے لیے وقف رہا تو خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ونغمہ بھی اسی وحدتِ ملت کا نقیب قرار پایا۔

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کو بظاہر ایسی کوئی آسائش وسہولت حاصل نہ تھی جو آپ کو اس راہ ہدایت کا تابندہ ستارا بناتی، ماحول تقریباً پس ماندہ، جغرافیہ تقریباً بے توفیق اور معاشرتی رابطے صحرائی دھند میں لپٹے ہوئے، برصغیر کا مسلمان ۱۸۵۷ء کے نعرۂ آزادی کی پاداش میں مسلسل عتاب کا شکار، علم کدوں کی بے توفیقی عیاں اور اس پر بعد کی تمازت مستزاد، ۱۸۸۱ء میں ایک متوسط، دیندار گھرانے میں پیدا ہونے والا نونہال، ایسے گاؤں میں متولد ہوا جہاں سے پُرآسائش آبادیوں کی طرف دیکھنے کے لیے بے غبار راستہ بھی مہیا نہ تھا، وسائل نہ تھے، ذرائع نہ تھے، مگر ولادت کے لمحہ اول سے ہی ایک جذبِ دروں تھا جو مسلسل تحریک دیتا رہا، جوانی، شباب کی راعنائیوں میں داخل بھی نہ ہوئی تھی کہ اس جوان نے شریعت کی قبا اوڑھ لی، دل کے تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے خیر کے مصادر تک رسائی پالی، خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ ایسے شجر سایہ دار کی گھنی چھاؤں نصیب ہوگئی، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ عالم باعمل اور صوفی بے ریا تھے اور سلطنت عشق کے تاجدار تھے، آپ کی سانسوں میں روہی کا گداز اور بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کا بے تابانہ سوز شامل تھا، اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ جوان جسے 'محمد یار' کی شناخت حاصل تھی مستیوں کا اسیر ہوگیا، محبت یوں شعلہ بار ہوئی کہ پورے وجود کو دھکتا ہوا انگارا بنا گئی، شاعر نے خوب کہا تھا

؎ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے لفظ یوں لپکتے کہ سامع کے کانوں پر پُرکیف دستک کا احساس ہونے لگتا اور پھر وہ لفظ محل سرائے دل میں رقص کناں ہوجاتے، تصوف اور کیا ہے، یہی کہ ایک پاکیزہ دل کی دھڑکن جذاب دل کو مسکن بنالے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا باطن تو

WWW.NAFSEISLAM.COM

عالم طفلی سے ہی کشکولِ جذب تھا، قرب نصیب ہوا تو آتش فشاں بن گیا اور پھر عمر بھر تمازتیں بکھیرتا رہا، حیرت سی حیرت ہے کہ قبر میں آسودہ ہونے کے باوجود یہ حرارت اب بھی ہر کسی کو بے خود کیے دیتی ہے۔

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کو محاسن شعر کا بھی شعور تھا اور آداب شعر کا بھی، آپ عروضی درولیت سے بھی آگاہ تھے اور قافیہ وردیف کی نزاکتوں کو بھی جانتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ جذبوں کی رفتار سے بھی آشنا تھے اور احساس کی رنگینیوں سے بھی باخبر تھے، اس قدر رمست الست تھے کہ بقول مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ

زیں قدر مستم کہ از چشم شراب آید بروں
و از دل پُر سوز من دود کباب آید بروں

اس لیے جب شعر کہتے تو ہر مصرعہ کو دینے لگتا، تقریر میں شعر پڑھتے تو تڑپ اٹھتے بلکہ تڑپا جاتے، جس نے سنا وہ خود شعلہ جوالہ بن گیا، یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی آپ کی محفل میں آئے اور اس ذوق بے خودی کا سفیر نہ بن جائے، علماء سراپا گوش ہوتے تو عوام بے حال، بڑے بڑے صوفیاء بیدلرزاں کی صورت تھرا اٹھتے، عشق کی مستی آپ کی شناخت بھی تھی اور حوالہ بھی اور عنوان داستان بھی، حرف حرف سے یوں پھوار اٹھتی کہ نیم خوابیدہ وجود بھی لہرانے لگتے، گفتگو وقت کی قید میں نہ رہتی، ساعتیں تیز آندھیوں میں اڑتے پر وبال کی طرح گزر رہی ہوتیں، گفتگو کی طوالت میں بھی ابتدائے کلام کی سی تازگی ہوتی، داستانِ عشق تھی کہ نو بنو رہتی، اشعار روح پرور ہوتے تو اندازِ ادا روح کے تار چھیڑتا، آج بھی آپ کے کسی جانثار کی محفل میں جائیں، قصہ درد شروع ہو جائے تو فریدی رنگ، شکست رنگ کی مہکار بن کر ہالہ بنا لیتا ہے، اللہ اللہ کس قدر آتش بداماں تھے یہ لوگ، اور کس قدر نور آفریں تھے ایسے وجود،

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری آپ کی بے تابیوں کی حکایت دلپذیر ہے، ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرعہ یوں دمکتا ہے کہ ادا ہوتے ہی اندر تک روشنی پھیل جاتی ہے، عشق و محبت

WWW.NAFSEISLAM.COM

کی یہ ساری حکایت اپنی سرمستیوں کے باوجود پابند آداب ہے، ہر لفظ باوضو ہے کہ ذکر اس وجودِ مکرم ﷺ کا ہے جو سراپا طیب و طاہر ہے، آداب کی اس طرح پاسداری عموماً نا پید ہوتی ہے کہ عشق بلاخیز حدود آشنا نہیں ہوتا، ایسی جذباتی کیفیت میں شریعت کے ضوابط اور طریقت کے دائرے بھی پامال ہو جاتے ہیں، ایسی بے راہ روی پر فخر بھی کیا جاتا ہے کہ یہ سب وفورِ عشق کے مظاہر قرار دیئے جاتے ہیں، مگر حیرت ہے اُس مردِ حق آگاہ پر جو عشق و محبت میں گھائل بھی ہے، سوزِ محبت کا نخچیر بھی ہے مگر اپنی تمام تر جولانی میں بھی آدابِ رسالت کے تقاضوں سے آگاہ ہے اور اطاعت کی حکمتوں کا سلیقہ جانتا ہے، یہی سلیقہ الفاظ کی حرمت اور معانی کو حدود آشنا رکھتا ہے حتیٰ کہ رویوں اور جذبوں کو شریعت کی شائستگی عطا کرتا ہے "محمد یار" نام کی ترکیب کے لفظی و معنوی حسن پر خود صاحب اسم کو ناز ہے مگر اس سے کسی طرح کی ہمسری کے خمار نے جنم نہیں لیا، ہاں وابستگی کی راہ ضرور دکھائی ہے۔

ہم نام محمدؐ ہوں مداح محمدؐ ہوں
ہاتھوں سے نہ چھوٹے گا دامان محمدؐ کا

ڈوبا تو نکالا ہے پھسلا تو سنبھالا ہے
میں بھول نہیں سکتا احسان محمدؐ کا

ہمنامی کی وارفتگی نے آپ سے بڑے بلیغ شعر کہلوائے ہیں، نام کا مرکب متعدد مرکب معانی کی آفرائش کا ذریعہ بھی بنا ہے، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اس کا کئی بار تذکرہ کیا ہے مثلاً فرماتے ہیں:

"اپنے نام کی مناسبت سے یا دوسرے لفظوں میں رسول اللہ ﷺ سے ہمنامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا خوب شاعرانہ بات پیدا کی ہے، جس طرح یہ ہمنامی نادر الوقوع ہے اسی طرح یہ شاعرانہ ہنرمندی بھی شاذ و نادر ہی شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

؎ کنارِ یار سے نکلا نہیں محمد یار
جہاں رہا وہ محمدؐ سے ہم کنار رہا

(قلمی نسخہ)

اس فخر کو آپ نے کس طرح ایک محرک عظمت بنایا ہے، اس کا اندازہ ڈاکٹر ظہور اظہر کے ان کلمات سے عیاں ہے:

''آپ کو اپنے نام پر فخر ہے کہ آپ رسالت مآب ﷺ کے ہمنام ہیں بلکہ اس نام کی بدولت تو آپ خود کو کامیاب و کامران تصور کرتے ہیں اور اس دولت کو سیم وزر کے عوض دینے کے لیے بھی تیار نہیں، یہ پاک نام سرفرازی و خوش بختی کی ضمانت ہے

؎ جب نام محمد ہے ناکام رہوں کیوں میں
ناکام ہی رہتا میں گر طالبِ زر ہوتا

سرورِ کائنات ﷺ کے نقشِ قدم پر چل کر اور سیرت طیبہ کو اپنے کردار میں سمو کر ہی صحیح مسلمان ہوسکتا ہے۔ فنا فی الرسول ہو کر ہی یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے۔

؎ محمد میں فنا ہو کر محمد بن کے نکلا ہے
حبیبِ کبریا کا شیخ فانی دیکھتے جاؤ

جام توحید اور سنت مصطفیٰ ﷺ پر عمل ہی حقیقی عشق ہے۔

؎ محمد بن کے جینا، جام توحید خدا پینا
قلندر اس کو حضرت عشق کی تفسیر کہتے ہیں

لیکن حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات پر پختہ یقین ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ہمنام ہونا اور بات ہے اور مقام مصطفیٰ ﷺ اور ہی چیز، ازراہ تواضع اور بطور اعترافِ حقیقت ارشاد ہوتا ہے

''دیوان محمدی'':

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا دیوانِ شعر، 'دیوان محمدی' کہلایا، اس میں اشعار کی کمیت، ماہیت اور نوعیت کیا ہے؟ آیئے ایک مختصر سا جائزہ لیں۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا دیوان تین نمایاں حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ فارسی اشعار پر مشتمل ہے دوسرا اردو شعر کا مرقع ہے تو تیسرا حصہ پنجابی/سرائیکی اشعار سے ترتیب پایا ہے۔ قاری ایک نظر میں ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیتا ہے کہ شاعر کو تینوں زبانوں پر یکساں دسترس حاصل ہے بلکہ بعض اشعار تو عربی شعر، پر قدرت کی بھی خبر دیتے ہیں، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ جس دور میں اظہار خیال کی راہیں تلاش کر رہے تھے اُس دور میں فارسی زبان اپنا دورِ عروج دیکھ چکی تھی اور استعمار کی یلغار اسے پسپائی پر مجبور کر رہی تھی، یوں کہہ سکتے ہیں کہ فارسی انحطاط کی ڈھلوان پر تھی اور انگریزی قوت وجبر کی زبان بن کر

اپنا سکہ جما رہی تھی ۔ اردو روابط کی بوقلمونی کے خمیر سے ترابط کی زبان بن کر نمایاں ہو چکی تھی، سرائیکی زیریں پنجاب کی مقامی بولی تھی جو گھر گھر استعمال ہو رہی تھی۔ آپ نے تینوں زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا، فارسی کو اس لیے کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی میراث تھی، اس میں مسلمان تہذیب وتمدن کی بو باس پوری قوت سے موجود تھی اور یہ کہ ابھی تک فارسی آشنائی کا دور باقی تھا، برصغیر کا مسلمان سبک خراسانی سے بہت مانوس تھا اس لیے فارسی شعر شعور کو حرکت دینے کا عمدہ تر ذریعہ تھا بلکہ کسی حد تک اب بھی ہے۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم پر فارسی کے ہمہ جہت اثرات تھے، ادبی حوالے سے مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی آپ کے حاشیہ خیال پر اس طرح محیط تھی کہ شعور وفکر کی ہر جہت اس سے منور تھی، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی مستی ووارفتگی نے بھی جذباتِ عشق کو بیدار کر رکھا تھا، یہ ہمہ گیر سایہ افگنی تھی کہ 'دیوانِ محمدی' کا بیشتر حصہ 'فارسی شعر' کے لیے وقف ہے بلکہ اردو اور سرائیکی اشعار کی دروبست کا ناقدانہ تجزیہ کریں تو ان کے پیراہن پر بھی فارسی کا ریشم دمک رہا ہے۔

'دیوانِ محمدی' میں تقریباً انیس سو اشعار ہیں جن کی ہیئتی حیثیت بڑی متنوع ہے۔ مگر ان میں تقریباً نو سو شعر فارسی میں ہیں، اس سے 'دیوان محمدی' میں فارسی کی کارفرمائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ان اشعار میں نعت کے اشعار کی تعداد ایک سو اسی ہے جبکہ سات سو تیس کے قریب اشعار منقبت، غزل اور تاریخ وصال کے حوالے سے کہے گئے ہیں، منقبت میں خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے مرشد کریم تھے کا تذکرہ زیادہ ہے، آپ کے بعد دوسرا نمایاں ذکر جو منقبت کا موضوع بنا وہ خواجہ محمد معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ انہیں سے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کو خلافت عطا ہوئی تھی، فارسی اشعار میں انتخاب کلمات، تدوین کلام کی عمدگی کے ساتھ ساتھ جذبوں کی فراوانی اور عقیدتوں کی جولانی قاری کو ہمنوا بنا لیتی ہے۔

'دیوان محمدی' میں اردو اشعار کی تعداد تین سو اکہتر ہے جن میں سے ایک سو پندرہ اشعار نعت کے ہیں اور باقی زیادہ تر غزل کے ہیں اگرچہ کچھ اشعار منقبت کے بھی

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت نعت گو شاعر:

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ دبستانِ عشق کے ایسے سچے فریدِ فرید تھے کہ آپ کے حرف حرف سے اسلوب و آہنگ سے وارفتگی کی مہک آتی ہے، ایک بے خود کرنے والی روانی دیکھیے

حسینوں میں ہے انجلائے محمدؐ ۔۔۔ جبینوں میں چمکا ضیائے محمدؐ
قمر چیر ڈالا کیا موم پتھر ۔۔۔ زہے قوت دست و پائے محمدؐ
زتحت الثریٰ تا سرِ عرش اعظم ۔۔۔ چلو دیکھ لو جلوہ ہائے محمدؐ
بشر کو محمدؐ سے نسبت نہیں ہے ۔۔۔ پڑھو غور سے انمائے محمدؐ
میرے منہ کو کیوں چومتا ہے زمانہ ۔۔۔ کہ میں بن گیا نقش پائے محمدؐ
ہے معبود میرا خدا جانتا ہے ۔۔۔ خدائے محمدؐ بجائے محمدؐ
محمد نے جس دم محمدؐ کو دیکھا ۔۔۔ تو ثابت ہوا مدعائے محمد
خطا میری سب سے بڑی تھی مگر ۔۔۔ محمدؐ نے بخشی خطائے محمد

(دیوان: ص ۱۶۳۔۱۶۴)

عظمتِ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار پُر کیف بھی ہے اور پر جوش بھی مگر عشق بے تاب اپنی تمام تر سرمستیوں کے باوجود پابند آداب ہے، فیضان کیشی کا دعویٰ بھی ہے اور اطاعت شعاری کا اعلان بھی، نسبتوں کی نارسائی کا اعتراف بھی ہے اور کرم بخشیوں کی جہتوں کا

WWW.NAFSEISLAM.COM

احساس بھی، منہ کا نقش پا بن جانا، اسلوبِ کلام کی جدتوں کا اظہار بھی ہے اور تسلیم عجز کا دلکش انداز بھی، ایک سیلِ محبت ہے کہ پہاڑی ندی کی طرح پُرخروش بھی ہے اور سنگِ آستان کی قید میں محو سروش بھی ہے،

فارسی میں خواجہ علیہ الرحمہ کو اردو سے بھی زیادہ سہولت محسوس ہوتی ہے کہ فارسی کی عشق کی قدیم روایت اور وارفتگی کی مستند حکایت آپ کے پیش نظر ہے، ایک جذبیوں میں ڈوبی ہوئی نعت جس میں عقیدہ وعقیدت میں مکمل آشتی ہے، نہایت رواں دواں فارسی میں لکھی گئی، ذرا جوشِ محبت کی روانی دیکھیے

بد قبلہ جاں صورتِ زیبائے محمد
شد کعبۂ دل نقش کفِ پائے محمد

حیران کن ہر فلسفی و عقل کل آمد
ممکن نہ بود حل معمائے محمد

از اسم و صفت درگزرو سرّ خدا بیں
از ذاتِ خدا بود تجلائے محمد

مقصود ز تکوین بُد ایں نقش محمد
نقاشِ ازل بود سراپائے محمد

شد نفی وجودم ہم از لائے محمد
اثبات من از رحمت الائے محمد

از قامت اوست قیامت بقیامت
قرباں بقیام قد بالائے محمد

از حسن محمد چہ تواں گفت محمد
خود حسنِ ازل بود تماشائے محمد

(دیوان محمدی: ص ۱۰۸-۱۰۹)

WWW.NAFSEISLAM.COM

جمال ظاہری کا تذکرہ عشاق کرتے رہتے ہیں کہ صورت نظر نواز بھی ہوتی ہے اور انبساط انگیز بھی مگر ظاہر کو باطن کی محبتوں کا محرک قرار دینا کہ "نقش کفِ پا" کعبۂ دل کی صورت" اختیار کرلے محبت کی معراج ہی نہیں اس کی صداقت کا نشان بھی ہے، ماوراء عقل، عظمت کی مخلوق ہو کر بھی کا خالق کی محبتوں کا حوالہ بن جائے اور مقصودِ خلق ٹھہرے، یا حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے بقول "نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے" کا منظر عیاں ہو جائے، یہ وہ مرحلہ ہے جہاں مداح رسالت تشبیہات کے تمام مروجہ اصول دربارِ حسن میں پیش کر دیتا ہے کہ مجھ یار کو حسن محمد ﷺ کے بیان کا یارا نہیں رہتا، یہ عجز اعتراف منزلت ہے کہ حق مدح ادا بھی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ حسن ازل خود بھی محو نظارہ ہے، نعت کا ایک ایک مصرعہ شاعر کی لفظی و معنوی قدرت کا مظہر ہے، خیال کا تسلسل ادائیگی کا حسن بن کر قاری کے دل پر دستک دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ یہ سراپا آمد ہے اور سچے جذبوں کا والہانہ اظہار ہے۔

شعر، شعور ذات کا ترجمان ہوتا ہے اور جب شعور کا ہر پرت محبت رسول ﷺ کا نقیب ہو جائے تو بے ساختگی میں بھی شعر کی پختگی کی نمو ہوتی ہے۔ ایک نعت جو روایتی آہنگ لیے ہوئے ہے مگر واردات ذاتی کی مظہر ہے پڑھیے

WWW.NAFSEISLAM.COM

کعبہ ام نقش کفِ پائے نبی ﷺ
قبلہ ام کوئے مصفائے نبی ﷺ
فارغم کردی ز دنیا و ز دیں
شادباش اے پاک سودائے نبی ﷺ
از مقام مصطفیٰ پرسی اگر
برسرِ عرش خدا پائے نبی ﷺ
در یداللہ است دستِ مصطفیٰ
قل ھو اللہ است طغرائے نبی ﷺ

در خدائے مصطفیٰ وانند فرق
برقہا بر فرق اعدائے نبی ﷺ
از ازل من بلبل مستانہ ام
برگلِ حسن دلآرائے نبی ﷺ

(دیوان محمدی: ص ۹۶۔۹۷)

خواجہ ؒ کے ہاں 'نقش پا' کی اہمیت بڑی معنی خیز ہے، آپ کے خیال میں یہ قبولیت کا نشان اور دوام کی ضمانت ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ 'مقام ابراہیم علیہ السلام' کی منزلت آپ کے پیشِ نظر ہے۔ ایک نشان ہی ہے جس نے سنگِ صحرا کو مقام ابراہیم بنا دیا ہے، عرب کی سرزمین تو پتھروں سے اٹی ہوئی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عراق سے مکہ مکرمہ تک کا سفر سنگ ریزوں پر ہی تھا مگر کوئی سنگ ریزہ نشان محبت قرار نہ پایا ایک وہی سنگ جس نے پتھر دل ہوتے ہوئے بھی نبی کا قدم پہچان لیا۔ یہ پہچان وجود کو لرزا گئی اور اس نے قدم نبی کے لیے سینہ کھول دیا، بس پھر کیا تھا ''ثبت است برجریدہ عالم دوام ما'' کا نمائندہ بن گیا۔ ہمارے ممدوح شاعر کی تمنا بھی یہی ہے کہ اگر 'نقش پا' کو کعبہ عقیدت بنانے کا ذوق رکھتے ہیں اس لیے آپ دنیا و دین کے روایاتی مشرب سے بیزار سے لگتے ہیں، یہ تلازمہ خیال آپ کو مقام ابراہیم سے یوں اٹھاتا ہے کہ 'نشانِ قدم' کا نظارہ عرش پر بھی آپ کے سامنے ہوتا ہے، ایک غیر محسوس تقابل بھی ہو گیا کہ کعبہ کے سامنے نشان نبوت کے آثار پہ وارفتہ ہونے والو اُس عظمت کا بھی احساس کرو جو عرش پر ثبت ہو گئی ہے، رفعتوں کا یہ حوالہ آپ کو شانِ نبوت کی کئی جہتیں دکھاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں برتری کا تصور 'وحدت الوجود' کے ایقان میں ڈھل جاتا ہے، دستِ کریمانہ، دستِ عطا کی منزلت پاتا ہے یہ نازک رفعتِ سفر ہے جہاں کسی مستند سہارے کی ضرورت ہے، بالغ نظری دیکھیے اس مقام حیرت پر قرآن مجید کا فرمان آپ کا چارہ ساز بن گیا ہے کہ یہ اُن کی خواہش ہے جو توحید و رسالت کی نزاکتوں کو سمجھتے نہیں بلکہ

﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ (النساء:۱۵۰)

''وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں۔''

اُن کے اردے کیا ہیں؟ وہ کس لیے یہ تفریق پسند کرتے ہیں۔ اُس کی وضاحت تو کر دی گئی مگر آخری فیصلہ یہ کیا گیا کہ

﴿اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء:۱۵۱)

''وہ وہی ہیں جو حقیقتاً کافر ہیں۔''

اس لیے غیرت مند مداحِ رسول ﷺ پکار اٹھا کہ

؎ برقہا برذوقِ اعدائے نبی ﷺ

یہ نعرۂ مستانہ اُسی کا وظیفہ ہو سکتا ہے جس کا خمیر ہی محبت سے گندھا گیا ہو، اسی کو زیب دیتا ہے کہ وہ 'بلبل مستانہ' ہونے کا دعویٰ کرے،

'دیوان محمدی' مدحِ رسالت مآب ﷺ کے ضمن میں سلام بھی کہے گئے ہیں، ان سلاموں میں بھی جذبوں کی توانائی برقرار ہے، ایک آزمودہ اسلوب اور ایک روایتی انداز مگر ان میں بھی شاعر کی ذات اپنا عکس دکھاتی ہے اور عقیدہ و عقیدت کی استواری و استحکام نمایاں ہوتی ہے سلام پیش کرتے ہوئے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ عرض کرتے ہیں

؎ سید و سالارِ سلطان الصلوٰۃ والسلام
بادشاہِ جن و انساں الصلوٰۃ والسلام
مظہر حسن الٰہی الصلوٰۃ والسلام
مظہر ذات کماہی الصلوٰۃ والسلام
خاک پایت سرمۂ جاں الصلوٰۃ والسلام
گردِ راہت جاں و ایمان الصلوٰۃ والسلام

(دیوان محمدی: ص ۹۹_۱۰۰)

اوصاف و کمالات کا تذکرہ اسی منزل عروج تک بڑھتا ہے کہ 'خاک راہ' سرمۂ جاں ہے بلکہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

گرہ راہی جان و ایماں ہیں، فارسی شاعری ایسی والہانہ مناجاتوں سے بھری ہوتی ہے۔

انسانی فکر کا اظہار اُس وقت تیز تر اور زود اثر ہوتا ہے جب اُسے اس زبان کا پیرہن نصیب ہو جائے جو اس کے ابتدائی شعور کی ترجمان ہے، مادری زبان خیال کے تمام جوانب کو فطری سلیقے کے ساتھ احاطہ کر لیتی ہے جبکہ ثانوی زبان کی ماہرانہ دسترس سے بھی ایسا ممکن نہیں ہوتا اس لیے مادری زبان کا بدل کبھی بھی ممکن نہیں ہوتا، خواجہ محمد یار علیہ الرحمۃ کی مادری زبان سرائیکی تھی، ماحول پر بھی سرائیکی ذخیرہ الفاظ اور سرائیکی لہجوں کی حکمرانی تھی، آپ نے اردو زبان پر نا قابل یقین حد تک مہارت پائی کہ کبھی اُن کے اشعار میں حتیٰ کہ وعظ کی روانی میں سامعین و قارئین کو یقین نہ آتا کہ یہ شاعر یا واعظ سرائیکی علاقہ سے تعلق رکھتا ہے، لکھنوی محاورے، دہلوی طرز بیان اور کلاسیکل اردو کا استعمال حیرت زدہ کر دیتا حالانکہ یہ بھی حقیقت تھی کہ بچپن میں بلکہ تدریسی زندگی میں بھی اردوئے معلیٰ کا ماحول آپ کو میسر نہ رہا تھا، فارسی تو صرف کتابی کسب فیض کی حد تک تھی مگر طبعی سلاست نے آپ کو ان زبانوں سے حد درجہ قریب کر دیا تھا، اس قرب صلاحیت کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ سرائیکی میں تحویل خیال کی شدت حد درجہ تھی، آپ کے دیوان کا آخری حصہ جو اردو سے بہت زیادہ ہے سرائیکی میں ہے، سرائیکی طرز ادا کو اس وقت اور بھی روانی مل جاتی ہے جب آپ ماحول کے تقاضوں اور ادائیگی کے مقامی ضابطوں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، سرائیکی لہجے کی بلاخیزی دیکھئے

محبوب سبھے رکھ ہک پاسے،	نازک متوارہ ہک پاسے
نمکین رخسارہ ہک پاسے	قرآن دا پارہ ہک پاسے
ابرو خمدارہ ہک پاسے	تلوار دا دھارہ ہک پاسے
تلوار دو دستی ہک پاسے	ابرو دا اشارہ ہک پاسے
سب نبی تے مرسل ہک پاسے	میڈا نبی سونہارہ ہک پاسے
میڈے درد دے دفتر ہک پاسے	مجنون وچارہ ہک پاسے
مسجود محمدؐ ہک پاسے	ساجد جگ سارا ہک پاسے

WWW.NAFSEISLAM.COM

پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اک آبشار ہے جو پہاڑ کی ہر رکاوٹ کو توڑتی ہوئی رواں دواں ہے، قاری اس قدر بے خود ہو جاتا ہے کہ کہیں تھمنے کا سوچتا بھی نہیں، خیال کا فشار موجوں کی طرح اچھلتا ہوا مچلتا ہوا برس رہا ہے اور آہنگ کا بانکپن ہر سمت لہرا رہا ہے، محبت کا یہ ترانہ شعور و وجدان کو یوں تحریک دیتا ہے کہ پورا وجود انبساط انگیز تحریک کا حصہ بن جاتا ہے۔ روایتی آہنگ میں ڈوبی ہوئی ایک نعت میں شاعر کے لہجے میں عقیدت کی تپش ملاحظہ کیجیے۔

؎ محمد مصطفیٰ رازِ خدا دی گال کیا پچھدیں
تھیا حق نال ہک حق دی حقیقت حال کیا پچھدیں
ایندی رفتار توں صدقے، ایندی گفتار توں صدقے
ایندے دیدار توں صدقے، ایندے خط حال کیا پچھدیں
ایندے اقوال توں صدقے، ایندے افعال توں صدقے
ایندے احوال تو صدقے، میڈے اعمال کیا پچھدیں
خدائی ایندی جاگیرے، ایندی تدبیر تقدیرے
اشارے کر کے چن چیرے، ہے قدرت نال کیا پچھدیں
ہے حاضر ہر مکان اندر، تے ناظر ہر زمان اندر
مکان و لا مکاں اندر، رہے ہر نال کیا پچھدیں

پھر خواجہ رحمۃ اللہ علیہ پر ''وحدت الوجود'' کی مستی چھا جاتی ہے تو ان کا لہجہ دو آتشہ ہو جاتا ہے اور آپ پکار اٹھتے ہیں

؎ کلامِ او کلام اللہ، سلام او سلام اللہ
غلامِ او غلام اللہ لکھاں پامال کیا پچھدیں
جلالِ او جلال اللہ، وصال او وصال اللہ
جمال او جمال اللہ ایندے ادلال کیا پچھدیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

اے دل ازلوں ہے دیوانی شراب حب دی مستانی
محمد یار وچ فانی، وڈے جنجال کیا پچھدیں

(دیوان محمدی: ص ۲۰۸۔۲۰۹)

'کیا پچھدیں' کی تکرار، مسکت جواب کا اعلان بھی ہے اور سوال کرنے والے کی کوتاہی نظر کا حوالہ بھی ہے اُس محبوب کائنات ﷺ پر کیا کیا قربان کرنا ہے؟ اس پر سوال کیسا کہ سوال تو تب ہوتا ہے کہ قربان کرنے کے لیے کسی انتخاب کا مرحلہ درپیش ہو، یہ تو وہ دربار ہے جہاں سب کچھ فدا ہونا چاہیے بلکہ بقول حسرت موہانی اعتراف رہنا چاہیے کہ کچھ نہیں رکھتے، جو ہے وہ اسی کا ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تم پر
فقط یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں

اور بقول ذوق دہلوی عرض گزاری کا لہجہ یہی ہونا چاہیے کہ

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ وحدت میں ذاتِ رسالت مآب ﷺ یوں پیوست ہے کہ کہیں غیریت کا خیال راہ نہیں کاٹتا، ہاں یہ احساس آپ کو ضرور رہا ہے کہ اس وحدت کی صورت گری کیسے ہو اس لیے وہ عمر بھر اس پیوستگی خیال میں محو کلام رہے، فرماتے ہیں

محمدؐ محمدؐ پکیندیں گزر گئی
احد نال احمد ملیندیں گزر گئی
خدا کوں ڈٹھوسے محمدؐ دے اولے
محمدؐ کوں ڈہڈیں ڈکھیندیں گزر گئی
اے باندی تساڈی تے ماندی تساڈی
پٹیندیں تے روندیں رویندیں گزر گئی

(دیوان محمد: ص ۲۱۹۔۲۲۰)

اس لیے آپ کو ہر اظہار کے باوجود اعتراف ہے کہ

ے
حقیقت محمدؐ دی پا کوئی نی سکدا
اتھاں چپ دی جا ہے الا کوئی نی سکدا
محمدؐ دی صورت ہے صورت خدا دی
میڈے دل توں نقش مٹا کوئی نی سکدا
انا الحق، انا اللہ الاون ہے سوکھا
انا احمد کوں الا کوئی نی سکدا
وَلَا تَرْفَعُوْا فَوْقَ صَوْتِ النبی
بحکم خدا غل مچا کوئی نی سکدا

(دیوان محمدی: ص۱۸۴_۱۹۸۴)

جب خواجہ علیہ الرحمۃ اس رفعتِ مقام پر اپنے یقین کا اعلان کرنے لگتے ہیں تو اُن پر انکسار کی ایسی چادر تن جاتی ہے کہ آپ ہر دعوے سے دستبردار ہو کر سراپا دعا بن جاتے ہیں، یہ دعا روایتی صورت نہیں لیتی بلکہ آپ کے اندر کا گداز بن کر سراپا کشکول بن جاتی ہے، ایسے بے خودی کے لمحوں میں پکارتے ہیں

ے
یا رسول اللہ کرم بے حال تے
ہیں تتی بدکار تے بد اعمال تے
او کرم تھیوے جیویں کیتا ہاوے
اوں یمن دے لعل تے جتوال تے
درد میڈے وچ جیواں ہیں وچ مراں
حشر تھیوے میڈا تیڈے خیال تے
یا شفیع المذنبین رحمت تھیوے
ہیں محمد یار گڑھی وال تے

(دیوان محمدی: ص۲۵۸)

ایک ایسی التجا جو انوکھے انداز میں خواہشات کا الاؤ جلائے، فریاد گزار بھی ہے اور مستانہ حال بھی۔

تیڈے مکھڑے ڈٹھیں مٹھا مدنی موہن   سک لہندی نہیں، دل رجدی نہیں

اساں خاص قدیمی بردے ہوں
اساں نوکر تیڈے در دے ہوں
اساں کٹھڑے تیغ نظر دے ہوں
ہے گالھ پرانی، اج دی نہیں

اے خاص قدیمی بردی ہے
اے گتری میڈے درد دی ہے
اے کٹھڑی تیغ نظر دی ہے
ہے روز ازل دی، اج دی نہیں

میں کوجھی تے بدعملی ہاں
بے کاری تے بے عملی ہاں
لج میڈی ہاں تونیں کملی ہاں
کیا پاس تساکوں لج دی نہیں

جو در تیڈے مر خاک تھئی
ہر عیب کنوں ونج پاک تھئی
ہر آن سدا غمناک تھئی
ہم غم دی ری وچ وجدی نہیں

(دیوان محمدی: ص ۱۹۴۔۱۹۵)

ایک ایک مصرعہ سامع کی سماعتوں کو اسیر کر رہا ہے، بے چارگی کا گھیرا ہے جو شاعر عظیم کو نفی ذات کی راہ دکھا رہا ہے مگر حیرت ہے خاک بھی ہوئے اور غمناک بھی، تو کر بھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

کہلائے اور بردا بھی، ازل کا غلام جو اپنی ذات کو قربان گاہ پر لے آیا ہے کہ اُسے اپنے استحقاق کا دعویٰ نہیں رہا، اس کس مپرسی کے عالم میں یہ شعور ضرور رکھتا ہے کہ جس درد کی گدائی، کارِ حیات بنی ہے اس درد کا مالک بے خبر نہیں اور نظر چرانے والا بھی نہیں، کس قدر حوصلہ ہے کہ ذرہ دربار ہو کر بھی یہ مصرعہ زبان پر آ گیا کہ

ع کیا پاس تسا کوں لج دی نہیں؟

یہ استفہام انکاری نہیں سراپا اثبات ہے، اس یقین کے ساتھ ہے کہ جس کو پکارا جا رہا ہے وہ لج پال ہے۔ یہی اعتماد مومن کا سرمایہ حیات ہے اور اسی کلید امید سے رحمت کا ہر دروازہ کھل جاتا ہے۔ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ اطاعت کا لمحہ لمحہ اس درکشادگی کی خبر دے رہا ہے، واصلین محبت کو اعتماد وصل بھی حاصل رہتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ کھٹکا بھی رہتا ہے کہ 'دربار نازک' پر کوئی جنبش لب غیر مستقیم نہ ہو جائے، کوئی حرکت آداب سے متصادم نہ ہو جائے کہ یہاں رضائے محبوب کے ساتھ بقائے دوام کی جزاء منسلک ہے۔ اور مشاہدہ یہ ہے کہ یہ تعلق، محبت کی وہ پل صراط ہے جہاں لڑکھڑانے کا خطرہ ہر دم رہتا ہے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ احساس قدم قدم پر محتاط رہنے کا مشورہ دیتا رہا، لغزش کیوں نہ آتی اس کی وجہ خود بیان فرماتے ہیں

ہزاروں پھسلے ہیں اس راہ میں مگر میں تو
کریم کے کرم خاص سے پھسل نہ سکا

(دیوان محمدی: ص ۱۴۱)

یہ کرم خاص آپ کا اعزاز بھی ہے اور ہمہ وقت وظیفہ حفاظت بھی، آپ کا یہ یقین ہر لمحہ دمساز رہا کہ دربار رسالت سے استقامت بھی ملتی ہے اور راستی کی نوید بھی اس لیے نعت کے آہنگ میں بھی دستِ طلب کو پھیلائے ہوئے نظر آتے ہیں، یقین و ایمان کی دادات کا حاصل دیکھئے:

WWW.NAFSEISLAM.COM

؎ کیا کہوں حیرت میں ہوں رتبہ رسول اللہ کا
سب بڑوں سے ہے بڑا چھوٹا رسول اللہ کا
بندگی سے آپ کی ہم کو خداوندی ملی
ہے خداوندِ جہاں بندہ رسول اللہ کا
حی وقیم ہے ہمارا مصطفیٰ صل علی
تا ابد رائج رہے سکہ رسول اللہ کا
خاکِ پائے مصطفیٰ کی حق نے فرمائی قسم
کون ہو سکتا ہے ہم پایہ رسول اللہ کا
آپ ہیں یکتا خدا یکتا کی یکتائی کو دیکھ
شانِ یکتائی میں ہے جلوہ رسول اللہ کا
ہے نظیر احمد مرسل یقیناً ممتنع
اس لیے ملتا نہیں سایہ رسول اللہ کا

(دیوان محمدی: ص ۱۳۰۔۱۳۱)

ان اشعار کے بعض کلمات اور تراکیب نے بہت سوں کو برافروختہ کیا ہے کہ اس میں اتحادِ ذات کے اشارے اُن کو محسوس ہوتے ہیں مگر اشعار کا مجموعی تاثر واضح کر رہا ہے کہ شاعر معرفت نے ان کلمات کو کن حدود میں رہتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ یکتائی کا دعویٰ کس کے لیے ہے جو رسول اللہ ہیں، جلد بازی میں فیصلہ کرنے کی عادت نہ ہو تو صاف دکھائی دے گا کہ رسول تسلیم کرنے کے بعد ہی رفعت شان کا ذکر کیا جا رہا ہے خاک پا کی رفعتوں کا سارا دعویٰ اس اساس پر ہے کہ خدا برتر نے قرآن مجید میں اس کی قسم کھائی ہے اور یہی عظمتوں کے تفویض ہونے کا اصل سبب ہے، جس کی ایک نسبت سے برتری حاصل ہو رہی ہے اُس کی ہمسری کیسے ممکن ہے، مدح سرائی جب دل کی آواز بنتی ہے تو جذبات کی ادائیگی متعدد رُخ لیتی ہے اور وہ مدّاح جو روزِ اول سے ہی مدح سرائی کو حرزِ جاں بنائے ہوئے

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے اس کے قلبی احساسات پر بے جا پابندیاں کیسے عائد کی جا سکتی ہیں، یہ دعویٰ تو پورے دیوان میں شناخت کی علامت ہے کہ حمد خدا اور مدح رسالت ازل سے ضمیر کی آواز ہے فرماتے ہیں

ما سلطنت بکوچۂ جاناں فروختیم
موئے حقیر را بسلیماں فروختیم
ما وصل یار خویش بہ ہجراں فروختیم
یوسف فروختیم وچہ ارزاں فروختیم
دربندگی پیر مغاں پیر گشتہ ایم
ما زندگی بہ بندگیٔ آں فروختیم

اور اس 'خود فروشی' کی انتہاء یہ ہے کہ

ما حامدِ محمدؐ پاکیم از ازل
حمد خدا بحمد خداواں فروختیم

(دیوان محمدی: ص ۱۱۵-۱۱۶)

خداواں کی ترکیب اعلان کر رہی ہے کہ شاعر ذی وقار کو ذات و مقام کی حدود کی شناخت ہے۔ ہاں اُس کا وظیفہ اسی خداوند کی مدح و حمد ہے یہ اس لیے کہ اس کا خمیر اسی مدح کے لیے ہی تخلیق کیا گیا ہے، یہ بھی خالق کی عنایات کے مظاہر ہیں کہ مدحِ رسالت ہی مقدر ٹھہرے۔ اس لیے کہا گیا

کنارِ یار سے نکلا نہیں محمد یار
جہاں رہا وہ محمدؐ سے ہمکنار رہا

یہ ہمکناری سعادت نہیں تو اور کیا ہے، یہ بھی بجا کہ ایسی سعادتیں ہر ایک کے مقدر کا حصہ نہیں ہوتیں یہی وہ امتیاز ہے جو نگاہِ صداقت کو منزلِ قرب کا حقدار بناتی ہے اور یہی وہ معیار ہے جو دعویٰ حکمت کے فریب کو جہالت کی سند عطا کرتا ہے، خواجہ محمد یار علیہ الرحمۃ کے

Nafse Islam
نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

بحیثیت شاعر، ہم عصروں کی نظر میں:

جناب حفیظ تائب مرحوم دورِ حاضر میں نعت کے امام قرار پاتے ہیں کہ انہیں شعر کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے اور انتخاب کلمات کا قرینہ بھی حاصل ہے، عصر حاضر میں نعت کا انداز اوصاف شماری سے زیادہ معاشرتی اثرات سے عبارت ہے اور خواجہ محمد ﷺ تو 'مدح ممدوح' کو ہی مرکزِ شعر بنائے ہوئے ہیں اس لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ آج کا ناقد شعر کچھ بے اعتنائی کا رویہ اپناتا، جناب حفیظ تائب مرحوم کو اس کا احساس ہے مگر پھر بھی اُن کا

Nafse Islam
WWW.NAFSEISLAM.COM

فیصلہ سنیئے فرماتے ہیں

''ان نظریات سے قطع نظر کلام میں درد کی تفصیل نے پتھروں کو بھی رُلا دینے والی تاثیر پیدا کی ہے اور یہ اعجازِ کلام صرف عرفاء ہی کا حصہ ہے، انہوں نے خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی میں کافی کی صورت میں بھی نعت و منقبت کہی ہے، پیرایہ مثنوی سے بھی استفادہ کیا ہے مگر ان کے اصل جوہر غزلیہ نعت و منقبت میں کھلے ہیں، وہ غزل کے مزاج اور ڈسپلن کو خوب جانتے ہیں اور اس صنفِ سخن کے وسیع تر امکانات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے، انہوں نے صوفیانہ نعت و منقبت کی وہ روایت قائم کی ہے جس کے وہ موجد بھی ہیں اور خاتم بھی ..... وہ زبانوں کے مزاج سے بھی مکمل طور پر آگاہ ہیں اور انہوں نے فارسی، اردو اور پنجابی شاعری کی عظیم روایت کو جذب کر کے اپنا انفرادی و اجتہادی آہنگ پیدا کیا ہے جسے فکر و عمل کی یکجائی نے سوز و مستی کے ساتھ اعتماد بخشا جس کی بدولت وہ کہہ سکتے ہیں

ہم محمد ہیں درس دیتے ہیں
عشق احمد کی درس گاہ میں ہم

(قلمی مضمون)

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے دو مضمون لکھے، ایک کا عنوان ہے

'کنار یار سے نکلا نہیں محمد یار' اور دوسرے کا عنوان ہے

'پھول صحرا کا جو سدا بہار رہا'

دونوں میں ڈاکٹر صاحب نے شاعر محترم کے معنوی محاسن اور جدت طرازیوں کا ذکر کیا ہے، ہمنامی پر آپ کی رائے کا ہم ذکر کر چکے ہیں، شاعر کی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

''حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے مکمل و منفرد شاعر ہونے کے بہت سے پہلو اور مظاہر ہیں اور آپ نے تقریباً تمام فنونِ شعر اور اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، ان کے دیوان پر مفصل نظر ڈالنے سے عیاں ہوتا ہے کہ آپ نے قصائد مدح مرثیہ سے لے کر عارفانہ غزلیات تک، سہرا نویسی سے لے کر احباب کے نام خطوط اور اُن کے جوابات تک اور رباعی، مخمس اور مسدس سے لے کر سرائیکی شاعری کی مروج و متنوع اصنافِ سخن تک تمام فنون شعریہ میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ حق شعر ادا کیا ہے۔''

نعتیہ شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت ہے کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ثنا خوانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر ان کی مدحت نبوی محض اس لیے نہیں کہ نعت کوئی ایک صنفِ سخن ہے اس لیے انہیں بھی اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے بلکہ وہ تو مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس لیے رطب اللسان ہیں کہ وہ فنا فی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہی عشق صادق جو نورِ ایمان کا پرتو ہوتا ہے، ان کی تو پہچان ہی مدحت نبوی ہے، فرماتے ہیں

؎ مدحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی نشان ما است
جانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم است محمد نوازما

(دیوان محمدی: ص ۱۱۱)

(پھول صحرا کا جو سدا بہار ہوا)

خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے اسی لہجہ میں متعدد اشعار کہے جو دلکش بھی ہیں اور پُر کیف بھی، مثلاً فرماتے ہیں

؎ خاکِ رہِ حبیب طبیب دو چشم ما است
کحل الجواہر است غبار حجاز ما

(دیوان محمدی: ص ۱۰۴)

WWW.NAFSEISLAM.COM

نامم محمد است تو بخشندۂ بمن
جامم بہ بخش ساقیٔ بندہ نواز ما

(دیوان محمدی: ص ۱۰۵)

ہست مسجودِ ما محمدؐ ما
سجدۂ درگہش عبادت ما است

(دیوان محمدی: ص ۱۰۹)

شد عمر محمد ہمہ در حمد محمدؐ
الحمد کہ ورد حمد الٰہ است زبانے

(دیوان محمدی: ص ۱۲۱)

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے بڑے سلیقے سے خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی بعض انفرادیت کا ذکر کیا ہے مثلاً آپ کے نزدیک

- ''ان کی پہلی اور نمایاں ترین انفرادیت عشق مصطفوی میں پختگی اور کمال ہے۔''
- ''دوسری انفرادیت جو حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کو عشاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں امتیازی مقام پر فائز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک عالم شاعر ہیں اور وہ ہمارے باکمال زبان دانوں میں شامل ہو گئے ہیں، ایسے باکمال زبان دان جنہیں بیک وقت ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل ہے اور انہوں نے ان تمام زبانوں میں شعر کہے ہیں۔''
- ''ان کی تیسری انفرادیت فنافی الشیخ ہونا ہے جو مبالغہ کی حدود تک پہنچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''
- ''حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں چوتھی انفرادیت تو ایسی نادر الوجود خصوصیت بھی ہے جو بہت کم لوگوں کو شاذ و نادر ہی میسر آ سکتی ہے، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام ہونا بہت بڑی سعادت اور عزت ہے مگر اس نادر الوجود انفرادیت سے

WWW.NAFSEISLAM.COM

بھرپور فائدہ اٹھانا بھی صرف حضرت ''خواجہ فریدی رحمۃ اللہ علیہ'' کا حصہ ہے۔''

- ''پانچویں انفرادیت شاعر کے اپنے دیوان کا نام 'دیوان محمدی' ہے۔''

(کنار یار سے نکلا نہیں محمد یار۔ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)

'اشفاق احمد خان' اپنے مخصوص انداز میں خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے مرشد کامل کی عطاؤں کا ذکر کرتے ہیں اور شعری عظمت کو بھی اسی حوالے سے دیکھتے ہیں، لکھتے ہیں

''خواجہ محمد یار فریدی کے وجود پر اس کے غیاب میں، اس کے حضور میں، اس کے اپنے زمانے میں اس کے مرشد کی عطا کا ترشح اس طرح سے جاری رہے گا، یہ جو صوفیانہ تعلیمات اور روحانی اقدار، ان کے آداب گفتار کے قرینے اور ان کے تبحر علمی کے نمونے ان کی شاعری کے آئینے میں نظر آتے ہیں تو اکتسابی علوم۔مدرسے کی تربیت کی بنا پر نہیں اس مہکار کی بدولت ہیں جو مرشد کے لمس سے پیدا ہوئی ہے۔'' (دیوان محمدی۔طلب کی باس)

مرشد کا لمس اُس قرب کا نتیجہ ہوتا ہے جو مرشد اور مرید کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اور قلبی موافقت سے جنم لیتا ہے اس کے لیے مجاہدے کا تسلسل درکار ہے۔مجاہدہ اگر تعلیمات اسلامیہ کی مطابقت کا امتیاز رکھتا ہے تو مرشد کی ہدایات، مرید کے قلب ونظر میں پاکیزہ خیالی کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہیں۔یوں تقویٰ شعاری کا ایک تسلسل پورے معاشرے کو نیک نشان بنا دیتا ہے۔خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی تسلسل کا ہمہ جہت دمکتا ہوا نشان ہے جن کے فیض نے قرب و جوار کو ہی نہیں دور ونزدیک کو خیر آشنا کیا ہے، اور یہ سلسلہ خیر مسلسل رواں دواں ہے۔

ڈاکٹر الطاف حسین جہانیاں، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی خصوصیات گنواتے ہیں۔

''آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے، آپ کے کلام میں سادگی، مقامی رنگ، وعظ و نصیحت، درد وغم، سوز وگداز، تغزل، ترنم و موسیقیت، مضمون آفرینی،

نازک خیالی اور جدت ادا نمایاں طور پر نظر آتی ہے، آپ کی ساری شاعری تصوف، وحدت الوجود، نعت حبیب ﷺ، مدح صحابہ کرامؓ اور منقبت اولیائے کرام پر مشتمل ہے۔" (حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ۔ شخصیت و کلام)

شعر کسی خیال کا مرقع ہو تو اس کا حسن و قبح ظاہری ہیئت و ترکیب کے ساتھ معنویت کے مقام و مرتبہ سے بھی جانچا جاتا ہے، ارفع خیالی اگر مناسب کلمات اور مستند اسلوب کے حصار میں رہے تو ہر ذہن پر دستک دیتی ہے اسی طرح اگر جذبات شائستگی کا دامن نہ چھوڑیں تو سب کو متاثر کرتے ہیں اور آفاقی منظر پیش کرتے ہیں خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری ارفع و ازکی جذبات کا مرقع ہے اسی لیے اس میں بے پناہ اثر آفرینی ہے۔

سید فاروق القادری، ادبیات عربی کے رمز شناس، شعر کی ہمہ جہت گرفت کے شاہد اور خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ سے زمانی، مکانی اور ذہنی قرب رکھتے ہیں، آپ کی رائے میں بھرپور شناسائی کا وقار ہے۔ اس لیے ان کی رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"یوں تو خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ دنیائے شعر و ادب میں بالکل الگ اسلوب کے مالک ہیں، ان کے ہاں وحدت الوجود پھر اس وجود کے ظہور یا تجلیات یعنی سرور عالم ﷺ، اہل بیت، صحابہ کرامؓ، اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مدینہ منورہ، بیت اللہ، بے کراں مدح و ثناء کے مستحق ہیں، زندگی بھر ان کی فکری کد و کاوش انہی موضوعات کے گرد گھومتی رہی، ان کے نزدیک یہ مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک حقیقت کے مختلف لباس اور رنگ ہیں۔"

مزید لکھتے ہیں:

"سرور عالم ﷺ کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں بھی انہوں نے ذرا مختلف پیرایہ اختیار کیا ہے، آج نعت کا انداز تبدیل ہو گیا ہے، اس وقت نعت سیرت و کردار اور افکار کے حوالے سے لکھی جا رہی ہے مگر خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے قدیم دبستانِ فکر میں رہتے ہوئے بھی اپنا راستہ الگ اختیار کیا ہے مثلاً اُن کی

WWW.NAFSEISLAM.COM

نعمت میں جو آفاقیت، مقام محمدیؐ تک عام انسانی عقل وفہم یا ادراک کی نارسائی اور بے چارگی، عظمت رسالت کے سلسلے میں الفاظ اور خیال کا عجز اور درماندگی، اپنی کمتری اور نفی پھر صرف ذات اقدس کی تعریف وتوصیف کے حوالے سے اپنے احساس اور خودی کا حوالہ ایسا دلکش اور روح پرور انداز ہے کہ انسان اسے کوئی زبان نہیں دے سکتا صرف وجدانی طور پر اس کا لطف لے سکتا ہے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

؎ گرچہ حسان نیستم سحبان نیم
مدح او شیریں کند گفتار را

سرور عالم ﷺ کی ذات گرامی کے حوالے سے حقیقت محمدیہ کی بے کنار عظمتوں کے حضور آپ اپنا مجزا یوں پیش کرتے ہیں

؎ حقیقت محمد ﷺ دی پا کوئی نیں سکدا
اتھاں چُپ دی جا ہے الا کوئی نی سکدا

ماوشما تو اپنی جگہ رہے اس ذات اقدس کی شان دیکھئے

؎ ابوبکر و فاروق و عثمان و حیدر
ایہو راز مشکل ڈسا کوئی نی سکدا

حقیقت الحقائق تک رسائی کی صورت یا راستہ کیا ہے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ فرماتے ہیں

؎ حقیقت دے پردے پھڑیندے محمدؐ
خدا نال بک تھی جلیندے محمدؐ

(حضرت خواجہ محمد یار اور عشق رسول ﷺ ۔ سید محمد فاروق القادری)

اردو کی ایک معروف ادیبہ بشریٰ رحمان نے بھی حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، بشریٰ رحمان کے تبصرے کے بعض اقتباسات لائق توجہ ہیں:

WWW.NAFSEISLAM.COM

''حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہ کی شاعری طلب وصل وطرب وصل کے اندر جذب وکیف، دوری ورنجوری، رسائی ونارسائی۔کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔

دارالشفا میں رہ کے میں بیمار کیوں رہوں
چارہ ہے جب تو میرا تو نا چار کیوں رہوں

شاعری کیا ہے بس ایک مست الست کی سی کیفیت ہے کہ جس طرح کسی دیوانے کے ہاتھ میں نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اکتارا آ گیا ہے اور زخمی انگلیوں کی پوروں سے نغمے پھوٹ رہے ہوں

ہم تو قرآن کے حافظ ہیں پڑھا کرتے ہیں
رُخِ محبوب انوکھا ہے یہ قرآں اپنا

سرائیکی شاعری کے حوالے سے بشریٰ رحمان لکھتی ہیں:

''حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی سرائیکی شاعری میں حزن وملال، موسیقیت کا رچاؤ، فکری پالیدگی، دل کی کیفیتوں کا اُتار چڑھاؤ، روایتی مٹھاس، ایک انمٹ آس اور سوندھی سوندھی مٹی کی باس ہے۔'' (فیضانِ فرید۔بشریٰ رحمان)

سچی بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاعری، خواہ فارسی میں ہو یا اردو میں یا سرائیکی میں، آپ کے ضمیر کی آواز ہے اس لیے اس میں پُرخلوص جذبے پوری صداقتوں کے ساتھ موجزن ہیں، اظہار کا رنگ کوئی ہو حسن کی یکتائی ہر مظہر میں قائم ہے۔آپ محبت خیز رویوں کی بوقلمونی کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ

ع حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

اس تعدد میں وحدت کی صورت گری کیسے ہے؟ اس کا خود ذکر کرتے ہیں

سب سے ملتا ہوں مگر سب سے جدا رہتا ہوں
وہ حقیقت ہوں جسے عشق کا ناداں سوچے

(دیوان محمدی: ص ۱۴۰)

WWW.NAFSEISLAM.COM

بشیر حسین ناظم نے خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے، اس کا کہنا ہے کہ

''حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے جذبات و احساسات کے وسیع عالم میں نہ صرف جذبۂ عشق و محبت درد و سوز و گداز کو ہی اُجاگر کیا ہے بلکہ فلسفۂ تصوف، لطافت، نفاست، شہادت، جاں نثاری، اباء نفس، آزادی و حریت، حسن ترکیب الفاظ، زباں دانی و لسانی اجتہاد کو اپنی مہارت و سخت کمانی سے شکار کر کے طباق دیوان محمدی میں قاری کی ضیافت کے لیے رکھ دیا ہے۔''

پھر ناظم صاحب نے خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار میں اُن خصائص کو دریافت کیا ہے جن سے آپ کی شاعری کی عظمتوں کا حوالہ ملتا ہے، فصاحت و بلاغت کے ضمن میں لکھا:

''ایک ایک حرف ایک ایک لفظ میں فصاحت کا رنگ نمایاں ہے۔''

سادگی ادا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں

''حضرت خواجہ کے اشعار کے قالب میں سادگی ادا روح رواں کی طرح مرئی ہے۔''

'سلاست و روانی' کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ایسے مشاق شاعر ہیں کہ اگر انہوں نے قصیدہ بھی لکھا ہے تو حقائق کو اس سلاست و بے تکلفی سے ادا کیا ہے گویا دو آدمیوں کے مابین مکالمہ و حوار ہو رہا ہے، شاعری کے اس درجہ کو مسند قبولیت و پذیرائی ملتی ہے۔''

'سراپا نگاری' پر تبصرہ فرماتے ہیں کہ وہ

''اپنے مشاہدے کو قوت واہمہ سے بھی آگے لے گئے ہیں اور انہوں نے جن جن بزرگوں کا سراپا لکھا ہے وہاں صنعت تنسیق الصفات کا پورا خیال رکھا ہے اور حرفوں اور لفظوں سے ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ممدوح ایک شخصیت کی شکل

WWW.NAFSEISLAM.COM

میں نظر آتا ہے'' الغرض ''بحیثیت شاعر آپ برصغیر پاک و ہند کے مقبول ترین شاعر ہیں۔''

(عبدالنبی اختار حضرت خواجہ محمد یار فریدی قدس سرہ۔ کچھ یادیں کچھ تذکرے۔ بشیر حسین ناظم)

بشیر حسین ناظم صاحب کے اس جائزے سے حقیقت واضح ہوگئی کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری میں شعری محاسن کی متعدد صورتیں موجود ہیں جو شعری فضا میں آپ کے مقام کے تعین میں مددگار ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن بخاری کا انداز نقد منفرد ہے کہ انہوں نے شعر کے ظاہری محاسن سے زیادہ اس کے معنوی جمال کو موضوع بنایا ہے، صوفیانہ خیالات اور رویے دنیا کی ہر زبان کے شعر میں اثر انداز ہوتے رہے ہیں فارسی شاعری کا تو ہیولہ ہی تصوف کے سایوں میں تیار ہوا ہے۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ ایک صوفی تھے اور وہ بھی چشتی صوفی جن میں سرمستیوں کی حکایت طویل بھی ہے اور ہمہ گیر بھی، اسی حوالے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بخاری رقمطراز ہیں:

''خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق چشتی دبستانِ تصوف سے تھا اور ان سے پہلے ایران و برصغیر کے بے شمار چشتی صوفیاء شعر و ادب کی پاکیزہ روایات تخلیق کر چکے تھے، خواجہ صاحب نے اپنے نظامِ فکر و فن کی اساس انہیں صوفیانہ شعری روایات پر استوار کی اور اپنے ہر دلعزیز لہجہ اور مقبول عوامی زبان کے ذریعہ تصوف کو پنجاب میں ایک عوامی تحریک کا روپ دینے میں بھرپور کردار ادا کیا، ان کے دیوان پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فارسی، اردو اور سرائیکی شاعری کی آغوش میں برصغیر کی طویل کلاسیکی صوفیانہ روایت، فکری سرمایے اور ادبی و لسانی ورثے کو سمیٹ کر نئے قالب میں ڈھال دیا ہے، ان کے کلام کی گہرائی میں مختلف صوفیانہ لہجے، انداز اور تیور جذب ہو کر ایک عجیب قوس قزح کا روپ دھار چکے ہیں۔''

WWW.NAFSEISLAM.COM

پھر ڈاکٹر صاحب نے صوفیانہ روایات کو تین حصوں میں بانٹ کر خواجہ علیہ الرحمۃ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے مثلاً ''مابعد الطبیعاتی معتقدات'' کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چشتی نظریات کے مطابق آپ کے ہاں وحدۃ الوجود کا یقین ہی وہ محرک ہے جس سے آپ کی شاعری کا تانا بانا بنا گیا ہے مگر ایک نمایاں خصوصیت جو آپ کو عام صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ

''خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں وحدت الوجود کا اعلانیہ، پر جوش اور دوٹوک اظہار ہوتا ہے تاہم انہوں نے اس نظریے کو مجرد عقیدتی اور فلسفیانہ سطح پر نہیں پڑتا اور نہ ہی اسے زندگی کی پست سطحوں تک اترنے دیا بلکہ ایک مسلمہ صداقت کے طور پر اس کے مذہبی اور سماجی نتائج اخذ کیے اور اُسے ایک تحرک و افادیت بخش سماجی نظریے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔''

غور کیا جائے تو یہی تحرک اور افادیت اسلامی تصوف کا مابہ الامتیاز ہے، کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی شاعری عجمی تصوف کی آلودگیوں کا شکار نہیں ہوئی حالانکہ برصغیر کی ہندو ویدانت کے اثرات غیر مرئی طور پر ہی سہی سرایت ضرور کر رہے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ 'تصوف' ترک دنیا کی غیر اسلامی تعلیمات کا اسیر ہو گیا تھا اور بے عملی اور فراریت بعض صوفیاء کی پہچان بن گئی تھی، تصوف کو اصلاحِ معاشرہ کا محرک بنانا یہ وہ جرأت مندانہ اقدام تھا جو حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کا امتیاز ہے۔

خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کا دوسرا بڑا عنصر وہ تعلیمات ہیں جن پر صوفیانہ معتقدات کی چھاپ ہے مگر اس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس پر شریعت کا پہرہ ہے۔ بخاری صاحب کا تجزیہ ہے کہ

''ان کا نظام افکار تصوف اور روحانیت کی کوکھ سے جنم لیتا ہے تاہم یہ قرآنی اسرار اور نبوی معارف سے ضو گیر ہے، عشق حقیقی، جذبۂ عبدیت، عرفان حق، حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اتباع سنت، پیروی شریعت، محبت شیخ، دردِ ملت،

ہمدردیٔ انسانیت، ایثار، اخلاق اور وفا کیشی کے مضامین ان کے دیوان میں جا بجا ملتے ہیں۔''

'روحانی احوال وواردات' کے ضمن میں ڈاکٹر بخاری کا دعویٰ ہے کہ

''خواجہ صاحب، صاحب حال صوفی تھے، ان کے نفسی احوال، باطنی کیفیات اور روحانی واردات کا عکس جمیل ان کی شاعری میں پوری آب وتاب کے ساتھ جھلکتا ہے، انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اپنے نفس کی داخلی پہنائیوں اور عالم وجد وحال میں کھو کر لکھا ہے، اس لیے اُن کی شاعری میں حقیقی اثر آفرینی ہے، اکثر نعتوں اور منقبتوں میں جذباتی تسلسل پایا جاتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس شدت سے جذبہ ان پر طاری ہوتا ہے اسی شدت سے وہ اسے شعری سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''عشق حقیقی ان کا مسلک ہی نہیں مقصد حیات ہے، ان کا عشق پورے وجود کو گھیرے ہوئے ہے..... (مزید کہا) انہوں نے ہر جذبے کو گویائی کا جوہر بخشا ہے، وفور شوق، حدتِ عشق، سوز وگداز اور گھلاوٹ ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں، مگر دعمیق صوفیانہ مضامین بیان کرتے ہوئے بھی سریت، ایمائیت اور مشکل پسندی سے گریز کیا ہے، لفظی صنائع بدائع ان کے ہاں فکر اور جذبے میں اس طرح تحلیل ہو گئے ہیں کہ بعض اوقات ان کی جداگانہ تشخیص دشوار ہو جاتی ہے۔''

(پیکر عرفان وآگہی۔ پروفیسر علامہ عبد الرحمٰن بخاری)

رہبر رشید محمود صاحب کا بھی یہی خیال ہے کہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے

'فلسفۂ وحدت الوجود کو تقریر میں بھی قابل فہم بنا دیا ہے اور شعر وسخن میں بھی سہل ممتنع بنا دیا۔'' (آشنائے راز)

WWW.NAFSEISLAM.COM

مختصر یہ کہ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے شعری پیراہن کو پاکیزہ صوفیانہ نظریات اور ارفع شرعی مقاصد کے لیے بڑی فنکاری اور مہارت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ عروضی تقاضے، قافیہ کی ضرورت واہمیت اور ردیف کا حسن و جمال آپ کی نظر میں ہے اس لیے کہیں بھی وزن و قافیہ میں جھول نہ آیا، الفاظ وتراکیب کے انتخاب کا سلیقہ آپ کو فطرت نے فیاضی سے عطا کیا تھا، ماضی کی شعری روایات سے مکمل آگہی تھی اور وقت کے تقاضوں سے آشنا تھے، شاعری کی عظمت اس میں ہے کہ شاعر کا شعور بیدار رہے اس کا مشاہدہ اس قدر قوی ہو کہ وہ اس کو بھی دیکھے جو دوسروں کو نظر نہ آ رہا ہو، وہ جب دعوت فکر دے تو اس کا ایقان دمک رہا ہو، وہ برملا پکارے کہ

ع میری چشم بیدار میں آ کے دیکھو

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں داخل کی بھی تازگی ہے اور ظاہر کی بھی بیداری، آپ کا مقصود شاعر کہلانا نہیں امت کے درد کا درماں کرنا ہے اس لیے وہ صاحب فکر معالج کی طرح صاحب درد سے قرب کے راستے تلاش کرتے ہیں اور اگر نسخۂ شفا اثر انگیز نہ ہو رہا ہو تو اندازِ علاج بھی بدل دیتے ہیں، یہی حکمت ہر کامیاب مصلح کا طریق عمل رہی ہے۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار میں ایسی ہی شفایابی کا درد نمایاں ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ اصلاح کے تمام نظریات پادر ہوا رہیں گے جبکہ ان میں عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھہراؤ نہیں، آپ کو اپنے اکابر سے حد درجہ عقیدت ہے اس لیے بہت سی منقبتیں لکھیں مگر جب ان کے مندرجات پر غور کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ سب نعت کے ابتدائیے ہیں، ہر صاحب عظمت کے ہاں حاضری ضرور دیتے ہیں مگر تلاش ہمیشہ ایک کی ہی رہی۔ آپ تو 'وحدت' کے بیان میں بھی ایک ہی محبوب کے حضور حاضر رہتے ہیں، آپ کے بخت کی رسائی دیکھیے کہ عمر بھر 'کنارِ یار' سے نہیں نکل سکے ہمہ وقت دربار رسالت میں رہے کہ انہیں علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح یقین ہے کہ

ع فبابُ محمدٍ بابُ الرجاء

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ایک صوفی:

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی شناخت ایک عالم دین کی حیثیت سے تھی کہ آپ درسیات کے مروج نظام سے گزرے تھے، تدریسی زندگی متلاشیانِ علم کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، شعر گوئی کا ذوق افتادِ طبع کا حصہ تھا اس لیے فارسی، اردو اور سرائیکی میں شعر کہنے لگے، طبع سلیم بھی تھی اور موزون بھی اس لیے لائق التفات ٹھہری، گھر کا ماحول دینی تھا اور تصوف کی اثر آفرینی نمایاں تھی، ایک ایسے مکتب کے طالب علم رہے جہاں ایصال علم کی ہمہ ہمی تھی، مدرسہ کا نگران جذب وکیف کی دنیا سے نہ صرف یہ کہ آشنا تھا بلکہ صاحب جذب وکیف بھی تھا، علم جب معلومات کی عوامی سطح سے بلند ہو جائے تو قلب ونظر کو منور کرتا ہے اور معلومات سے واردات میں ڈھلنے لگتا ہے۔ خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ سے باطن سوز ناک ہوتا جا رہا تھا، چند ہی سالوں میں داخل کی دنیا میں کہرام بپا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جسم کا سوز روح کا گداز بن گیا، مستی اس حد تک محیط جاں بنی کہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ وجدانِ پیر میں گم ہو گئے اور پھر تو فرید، فرید ہونے لگی۔

؎ یا فرید و یا فرید و یا فرید
ہر زماں وردِ زبانے می کنم

(دیوان محمدی: ص ۴۷)

یہ صرف خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی ہی حالت نہیں، یہ تو دربار ی 'مست الست' اصحاب کا ہے۔

؎ میخانہ فرید میں مستوں کی دھوم ہے
مستانہ ہو رہا ہے زمانہ فرید کا

(ص: ۱۲۶)

اور خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی حالت یہ ہے کہ

میں بلبل فرید ہوں باغِ فرید میں
عادی ہوں عین دید میں ہل من مزید کا

(ص:۱۲۶)

اس بلبل فرید کی چہک بھی اُسی باغِ فرید کی عطا ہے، یہ پکار دلوں پر دستک دیتی رہی، دلوں کے داغ دھلتے گئے اور آخر یہ منزل آ گئی کہ

فرید پاک کی پاکی کی اک دلیل ہوں میں
کہ بے گناہ ہی رہا گرچہ گنہ گار رہا

(ص:۱۷۰)

یہ ذاتی تجربہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کو مشربِ صوفیت کا رکن رکین بنا گیا، برصغیر کا مسلمان اس حوالے سے خوش قسمت رہا کہ جب پورا عالم اسلام منگول حملوں سے گھائل ہو گیا تھا، قوت کا ہر مظہر داغدار تھا اور بے توفیق بھی، نہ فرد میں زندگی کی کوئی رمق تھی اور نہ اجتماع میں قوتِ مدافعت باقی تھی، ایسے سراسیمگی کے عالم میں برصغیر نہ صرف یہ کہ پناہ کا نشان بنا بلکہ توانائیوں کا مرکز بھی بنا، صوفیاء کے آستانے شجر سایہ دار ہوتے ہیں جہاں صحراءِ ہوس میں بھٹکنے والوں کے لیے ایک سکوں بخش ٹھہراؤ منتظر ہوتا ہے، استحلال کی ماری ہوئی ملت کو حیاتِ تازہ انہیں آستانوں سے نصیب ہوئی تھی، کوٹ مٹھن ایسا ہی مرکز عافیت تھا جس کا فیضان دور دور تک وسیع ہوا، گڑھی اختیار خان بھی اسی چشمہ صافی سے فیض یاب ہوا، اس فیض یابی کی دلپذیر حکایت بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ فیضان کے اس مصدر کا ذکر ہو جائے تا کہ مجموعی پیش رفت میں اس مرکز یقین کا مقام متعین کیا جا سکے۔

آگے پڑھنے سے پہلے موضوع کی مبادیات کا ذکر ہو جائے یعنی یہ وضاحت ہو جائے کہ

- تصوف کیا ہے؟ اس کی ضرورت کیوں ہے؟
- تصوف کا فکری و عملی نظام کیا ہے؟

WWW.NAFSEISLAM.COM

اہل تصوف کی ذمہ داریاں کیا ہیں اور اُن کے امتیازات کیا ہیں؟

یہ سوالات بار بار اٹھائے جاتے رہے ہیں، تصوف کا ذوق رکھنے والوں اور اس راہ پر چلنے والوں کو ان سوالات سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے، کچھ اہل فکر ونظر ان سوالات کے جواب کے لیے خود کو مستعد پاتے ہیں مگر بعض افراد جو ذوقِ تصوف کی حلاوتوں سے بہرہ مند نہیں ہوتے لڑکھڑانے لگتے ہیں اور کچھ تو ایسے دوں ہمت ثابت ہوتے ہیں کہ بھٹک جاتے ہیں اور بے راہ رو ہو جاتے ہیں، تاریخ تصوف جہاں پاکیزہ سیرت بزرگوں، باکردار راہنماؤں اور صاحبانِ نظر فلک پیماؤں سے مہک رہی ہے وہاں بعض شعبدہ بازوں، بے توفیق راہبروں اور سراپا حرص دنیا داروں سے بھی اٹی پڑی ہے، خیر شناسی اور بدی آشنائی میں ایک ستھرہ کاری ہر دور کا میں نمایاں رہی، تاریخ گواہ ہے کہ جب یونانی فکر کے بعض غیر محمود اثرات نے اسلامی تعلیمات کے چشمۂ صافی میں گدلاہٹ پیدا کی تو اصحاب فکر اسلامی نے ان اثرات سے امت کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت قربانیاں دیں اور جب دین کی روشنی برصغیر کے افق پر ہویدا ہوئی تو بے ثبات ماورائیت اور بے توقیر ملفوفیت نے فجر اسلام کو داغدار کرنے کی پوری کوشش کی، یہ کوشش کبھی بھگتی تحریک کے روپ میں نمودار ہوئی تا کہ اسلام کے امتیازی اوصاف دھندلا جائیں تو کبھی تعلیماتِ دین کو مقامی مادی حوالوں میں اسیر کر کے مختلف گروہوں میں بانٹ کر بے شناخت کرنے کے عزم کا اظہار ہوا، خوارق عادت کی بعض غیر مستند حکایات نے عوام کو مبہوت کیا، خواص جنہیں ایسے مواقع پر فکری پختگی کا ثبوت دینا تھا، وہ کچھ ہمسائیگی کے فریب سے گھائل ہوئے تو کچھ سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گئے، دین الٰہی کا شاخسانہ ایسی ہی تحریک تھا، برصغیر کا مسلمان جو عافیت کے حصار میں رہا تھا ان سازشوں کا ہدف بننے لگا، حالات گھمبیر بھی تھے اور متنبہ کرنے والے بھی، ایسے میں اسلام کی حقانیت پوری قوت سے آشکار ہوئی، یہ اس امت کی ہمیشہ خوش بختی رہی کہ ہزار کوتاہیوں اور بے شمار بدعملیوں کے باوجود یہ امت بالآخر راہ صواب پا لینے میں کامیاب رہی، یہ قائدانہ صلاحیت علماء کے ہاں بھی نمایاں تھی

WWW.NAFSEISLAM.COM

مگر اس میں بھرپور کردار صوفیاء باصفا نے انجام دیا، سیرت و کردار کی راستی کے ساتھ صیانت عقیدہ کا فریضہ بھی اہل تصوف نے ادا کیا،

راہنماؤں کے سامنے دو مشکل مراحل تھے، ایک یہ کہ برصغیر ”تعدد الہٰ“ کے نظریے کا نخچیر تھا، الہیات کا سارا سلسلہ محسوسات کے فریب میں الجھے ہوئے انسانوں کے ہاتھوں اس طرح شرک آشنا ہو گیا تھا کہ ہر کوئی مستیوں کی آڑ میں خدائی دعوے کرنے لگا تھا، اس کا ردعمل پیدا ہوا جو بالآخر ’وحدت الوجود‘ کی صورت میں جدلیاتی مبحث بن گیا، دوسرا یہ کہ خدا بن جانے کا خبط اس قدر رمنہ زور بنا گیا کہ نبوت کی ضرورت سے انکار ہونے لگا، جب ہر کسی کی بساط میں تھا کہ الہٰ تک رسائی پانے لگے تو نبوی واسطوں کی کیا ضرورت باقی تھی، اس کا ایک اور نقصان بھی ہوا کہ ’نبوت‘ کی سرفرازی اور خصوص ختم کر دیا گیا اور ہر بوالہوس اس حسن پرستی پر دلیر ہو گیا، نبوت ایک درمیانی پڑاؤ سمجھا گیا جس پر مسلط ہونے کی ہر کس و ناکس کو تحریک ملنے لگی اس طرح نبوت کے دعویداروں کا میلہ لگنے لگا، کچھ دعویدار تو مفادات کے حصول تک ہی محدود رہے مگر بعض نے پوری ملت کی یکجائی کو ہلا ڈالا، غیروں نے اسلامی وحدت میں اسطرح کی نقب کشائی کو اپنے استحصالی مقاصد کے قریب جانا اور سرپرستی کرنے لگے، یہ تھی فضا اور یہ تھا ماحول جس میں ہمارے ممدوح خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ اصلاحِ احوال کا بیڑا اٹھایا۔

”وحدت الوجود‘ کے حوالے چند احباب کی آراء درج کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ مسئلہ جو برصغیر کے علمی و عرفانی ماحول میں سب سے زیادہ بحث و جدل کا حصہ تھا خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ وحدت میں کیا مقام رکھتا ہے اور اصحاب علم کے نزدیک آپ کے میلانات کی قدر و قیمت کیا ہے؟

رابعہ رشید محمود نے اگرچہ اس پر کھل کر اظہار خیال نہیں فرمایا مگر پھر بھی اجمالاً ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں:

”جس طرح زبان اور دل کی ہم زبانی سے سلطان الکاملین حضرت خواجہ محمد یار فریدیؒ

نے وحدت الوجود کو سامعین کے وجود میں رچا بسا دیا اور شعر و سخن کے آہنگ میں اس ادق فلسفے کی تشریح کی، وہ اپنے طرز کی پہلی مثال ہے، وحدت الوجود ہم عاصیوں کے فہم و ذکا سے ارفع بات تھی۔ تصنیف و تالیف کی دھرتی میں روحانیت و طریقت کی تخم ریزی بہت ہوئی .... مگر 'ہمہ اوست' کے حوالے سے ان درختوں پر گل ہائے تقریر اور اثمار گفتگو کی کمی رہی، کتابوں کی دنیا میں وحدت الوجود کا چرچا رہا لیکن عامی اس فلسفے کی تہہ تک نہ اُتر سکے، فتوحاتِ مکیہ سے لے کر الروض المجوذ تک کا علم انہیں مرعوب تو کرتا رہا، مرغوب نہ ہوا، یہ سعادت برہان محبت نبوی ﷺ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آئی کہ انہوں نے عامۃ الناس کی زبان میں بات کی اور فتوحاتِ مکیہ کے ادق مقامات اور وحدت الوجود کی شرح میں تحریر کی گئی دوسری تصانیف کے سنگلاخ نکات کو اپنی زبانِ فیض ترجمان میں پانی کر دیا، وحدت الوجود کو عوام کی سمجھ کے مطابق پیش کرنا اور ہر کسی کو کسی نہ کسی حد تک اس کے معانی و مفاہیم تک رسا کرنا حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہ کے سوا کسی کا منصب نہ ہوا

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(آشنائے راز)

راجہ صاحب کو یہ بھی اعتراف ہے کہ

"وحدت الوجود کے جن پھولوں کی طرف ہماری قوت شامہ حضرت خواجہ محمد یارؒ کے دم قدم سے متوجہ ہوئی، انہوں نے مشام جاں کو معطر کر دیا"

"حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ حمد محمد ﷺ اور حمد الٰہ میں ہمیشہ تر زبان دکھائی دیتے ہیں اور اس نکتے میں وحدت الوجود کو بیان کرتے نظر آتے ہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

؎ شد عمر محمد ہمہ در حمد محمدؐ
الحمد کہ در حمد الٰہ است زبانے.....

؎ در پنج وقت جانب کعبہ است سجدہ
در ہر زماں بہ سوئے محمدؐ نمازِ ما

(آشناءِ راز)

خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے 'وحدت الوجود' کے حوالے سے عملی رویوں کا ذکر کرتے ہوئے سید فاروق القادری کہتے ہیں:

''راقم السطور (سید فاروق القادری) کے نزدیک خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ وحدت الوجود کے صرف شارح اور مفسر نہیں ہیں وہ اس کے عملی معلم اور پیکر ہیں، جب وجود ہے ہی ایک تو ظاہر ہے کہ اس کے سوا کا تصور ہی عنقا ہے، اب یہی وجود محبّ بھی ہے، محبوب بھی، طالب بھی ہے مطلوب بھی، وہ ظاہری اشکال و اجسام کو وجودِ حقیقی کے پرتو یا عکس سے قطعاً کچھ اور نہیں سمجھتے، یہی وجود ان کے ہاں محمد (قابلِ تعریف یا لائقِ حمد) ہے، یوں بھی اگر اس نظریے کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھیں تو تمام اکابر صوفیاء کے نزدیک حقیقت محمدیہ ہی وہ حقیقت الحقائق ہے جسے انہوں نے النفس الکائنہ، القلم الاعلیٰ، نور الانوار، انسانِ کامل کے عنوانات سے یاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

؎ اللہ ام وہم بندہ من غیر نمی دانم
مسجودم وافگندہ من غیر نمی دانم
ہم خالق و مخلوقم، ہم رازق و مرزوقم
مطلوبم وجوینده من غیر نمی دانم
خود ساجد و مسجودم خود عابد و معبودم
خود شیخ شنا ستده من غیر نمی دانم

(حضرت خواجہ محمد یار اور عشقِ رسول ﷺ)

وحدت الوجود کے یہی اسرار ہیں جو بسا اوقات عام عقل انسانی سے گریز پا رہتے ہیں اس لیے فہم وفکر کی نارسائی کئی مغالطے پیدا کر لیتی ہے، اگرچہ خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان اسرار کی نقاب کشائی ایک معمول ہے پھر بھی ظاہر بین نظر چند ہانے لگتی ہے اور بعض اوقات فتویٰ بازی کی نوبت بھی آ جاتی ہے 'واعظ کی حیثیت' کا ذکر کرتے ہوئے عبدالرشید ارشد کے کلمات نقل کیے جا چکے ہیں جو فتویٰ جاری کرنے کے ساتھ دشنام طرازی کے بھی نمونے ہیں، ڈاکٹر الطاف حسین جہانیاں ایک عقیدت مند محبّ ہیں انہوں نے خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے عقیدت کا اظہار کیا ہے مگر وہ بھی وحدت الوجود کے بیان میں بے بسی کی حیرت زدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسی طرح غلبہ حال اور غلبہ عشق میں اہل اللہ کی زبان سے سکر کے مرتبہ عین الجمع میں ایسے کلمات صادر ہوئے ہیں جن میں دوئی کی تمیز ان کی نظر سے دور ہو جاتی ہے اور وہ وحدت والوں کا اسی حال میں کلام بظاہر خلاف شرع ہو جاتا ہے اس کو شطحیات، ہفوات عاشقانہ، اور کفر طریقت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خواجہ محمد یار صاحب کے ہاں اس طرح کا کلام بھی موجود ہے جو وحدت الوجود کے حال کے غلبہ کی عکاسی کرتا ہے۔

؎ اللہ ام وہم بندہ من غیر نمی دانم
مسجودم و افگندہ من غیر نمی دانم

؎ فرید باصفا ہستی محمد مصطفیٰ ہستی
چہا گویم بامستی خدا ہستی خدا ہستی

؎ گر محمد نے محمدؐ کو خدا مان لیا
پھر تو سمجھو کہ مسلمان ہے دغا باز نہیں

؎ رنگ و بے رنگ میں گر فرق ہے اے اہل فرق
کیوں محمدؐ کو خدا کہتے نہیں وحدت والے

ان اشعار کا ظاہر خلاف شرع ہے۔ کلام میں وہی تاویل ہوگی جو اوپر کی

حدیثوں میں کی جاتی ہے (اوپر احادیث درج ہیں) نیز متکلم کا وحدت الوجود میں مغلوب الحال ہونا بھی انہیں مرفوع القلم کر رہا ہے۔ ایسا کلام اہل کو پڑھنا جائز ہے اور نا اہل کو پڑھنا حرام ہے۔"

(حضرت خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمہ۔ شخصیت وکلام۔ ڈاکٹر الطاف حسین جہانیاں)

یہ تبصرہ فرمانے کے بعد یہ بھی کہا "یہ میری تحقیق ہے اہل علم چاہیں تو اختلاف کریں اور چاہیں تو اس میں مزید اضافہ کریں۔ (حوالہ مذکورہ)

یہ ڈاکٹر الطاف کا خلوص ہے کہ قاری کو فیصلہ کرنے میں آزاد چھوڑا ہے مگر یہ کہ 'مرفوع القلم ہونا' اور اپنی تحقیق کا ذکر کرنا ذرا غیر مانوس سا لگتا ہے، آخر اہل اور نا اہل کا فیصلہ کون کرے گا، یہ اجازت کس کی اجازت سے ہے، یہ بھی محل نظر معاملہ ہے۔

کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے وہ ماحول اور جو گروہ پیش نظر رہنا چاہیے جس میں یہ کلام کیا جا رہا ہے۔ ثنویت، تثلیث اور تعدد الہ کے مسموم ماحول میں جہاں محسوسات کی بنیاد پر اور خوف و رجا کے حوالے سے الہ تراشے جا رہے ہیں یہ نعرہ کس قدر توحید مست تھا کہ وحدت الوجود پر اصرار کیا جائے۔ کسی جملے یا مصرعہ کو سیاق سے کاٹ کر کوئی استخراج مناسب نہیں ہوتا کہ ایک جملہ ہی شخصیت کا عکس نہیں بنتا، ضرورت یہ ہے کہ شخصیت کا مجموعی جائزہ لیا جائے اور پھر مجموعی تاثر کو اساس بنایا جائے، خواجہ محمد یار فریدی علیہ الرحمہ عشق کی جولانیوں کے پیکر ضرور تھے آپ میں اپنے شیخ، شیوخ چشتیہ اور سب سے بڑھ کر نبی محترم ﷺ کی محبت نے اک ہنگام بپا رکھا تھا اور کہا جاتا ہے کہ "حبک الشئ یعمی ویصم" محبت تو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ اور یہ کہ

عَینُ الرضا عن کل عیبٍ کلیلۃ

محبت کی آنکھ خامیاں تلاش کرنے والی نہیں ہوتی۔ خواجہ علیہ الرحمہ تو سراپا محبت تھے اگر کہیں کسی سے نفرت کا اظہار ہوا ہے تو وہ درحقیقت نفرت نہیں شدت محبت کا ردعمل ہے۔

لائق توجہ تو یہ رویہ ہے کہ آپ ہر گفتگو کو ایک ہی مرکز تک لے جانا چاہتے ہیں کہ محبت شرک برداشت نہیں کرتی، مدار استخراج تو یہ ہے کہ وارفتگی محبت میں کسی قدر بھی غیر

متوازن ہوتے نظر آئیں کہ "باخدا دیوانہ باش" کی صوفیانہ سہولت انہیں حاصل ہے مگر پھر بھی ہر جگہ آپ کا ہر عمل "بامحمد ہوشیار" کا آئینہ دار ہے۔

ہے مسجود میرا خدا جانتا ہے
خدائے محمدؐ بجائے محمدؐ

یہ شعر جس کے ایقان کا آئینہ دار ہو اس میں درست، نادرست، جائز ناجائز اور مناسب غیر مناسب کی الجھنیں کیوں، اُن کے ہاں تو دعویٰ ہی نہیں بلکہ 'خدا جانتا ہے' کی حتمی باخبری ہے۔ محبت میں سب سے جدا ہو جانے والا پھر بھی سجدہ کرنے میں اس قدر پابند آداب ہو اور 'خدائے محمد ﷺ' کی شناخت نہ بھولے تو پھر 'شطحیات یا ہفواتِ عاشقانہ' کے تبصروں کی کہاں گنجائش ہے۔ ضرورت حرف گیری کی نہیں، صاحب کلام کی روح میں ڈوبنے کی ہے کہ وہ تو پکار رہے ہیں کہ شعوری سطح کا اندازہ لگانا ہو تو

ع میری چشم بیدار میں ہو کے دیکھو

عشق رسول ﷺ کی یہی تو انائی تھی جو خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے یقین بے مثلی کو تقویت دیتی تھی، آپ نہ تو کسی اور کو خدا کا شریک ماننے کو تیار تھے اس لیے کہ بہر جانب یکتائی کا حصار محسوس کرتے تھے اور نہ ہی کسی اور کو محبوب خدا تسلیم کرتے تھے کہ آپ اعتراف عظمت میں بھی کسی شرکت کے قائل نہ تھے، ذات رسالت کی محبت یقین وحدت کی اساس تھی، محبت کی شدت کبھی ان واہموں کو جنم دیتی تھی کہ اتحاد کا تصور استوار رہا ہے، یہی ڈاکٹر الطاف کے نزدیک اہل اور نا اہل کی تقسیم کی محرک بنی تھی، عشق کی حدت اور محبت کی وارفتگی کا سب نے ذکر کیا ہے مثلاً

سید فاروق القادری کی پختہ رائے ہے کہ

"خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا عشقِ رسول ﷺ کے بغیر تصور اسی طرح ناممکن ہے جس طرح عشق رسول ﷺ کی دلفریب داستان آخرین دور کے اس منفرد محبت اور عاشق کے ذکر کے بغیر ناممکن ہے۔"

عشقِ رسول ﷺ کو اس دورِ آخر میں اس لیے بھی عام کرنا ضروری تھا کہ

''برصغیر پاک و ہند میں عیار انگریز کی ساری کدوکاوش عشق رسول ﷺ کو کمزور کرنے اور اسے کجلانے پر مرکوز رہی اور اُسے یک گونہ کامیابی بھی ہوئی مگر اسے نگاہِ رسالت کا فیضان سمجھنا چاہیے کہ اس نے بالکل غیر متوقع طور پر خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ ایسے چند باکمال لوگ پیدا کر دیئے جنہوں نے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر جامی رحمۃ اللہ علیہ تک تمام اہل محبت کے نغمات کو اس انداز میں دہرایا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بیمار روحوں میں نئی زندگی، تازگی اور حرارت پیدا ہوگئی، یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ہر دور کے مسلم مفکرین نے مسلمان قوم کی زبوں حالی، انحطاط اور زوال کے علاج کے لیے فکر وسوچ کی ہمیشہ ایک ہی راہ اختیار کی ہے اور وہ ہے محبوب ازل سرور عالم ﷺ سے والہانہ محبت اور آپ کی ذاتِ اقدس سے رشتہ غلامی کی ازسرنو تجدید یعنی

ع بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہم اوست

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے ملت اسلامیہ کو عشق ومحبت کا درس دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ نے عشق ومحبت نبوی کا عملی نمونہ پیش کیا، آپ حب نبوی کا ایسا پیکر تھے جس کی ہر تار، ذات نبوی کے کسی نہ کسی وصف و جمال سے جڑی ہوئی تھی، سرور عالم ﷺ کا نام نامی، اسم گرامی آتا تو آپ تڑپ اٹھتے جیسے بے خبری میں کسی نے ہتھیلی پر انگارہ رکھ دیا ہو'' پھر فرماتے ہیں:

''خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو، خامشی، اوڑھنا بچھونا، نشست و برخاست، نظم، نثر، رات دن، صبح وشام، خواب وخیال سب کا مرکز ومحور، موضوع اور عنوان، صرف اور حرف ذات رسالت مآب ﷺ تھی، انہوں نے اس عنوان میں اپنے آپ کو اس طرح مٹایا اور جذب کیا کہ عنوان اور مضمون میں دوئی کا فرق مٹ گیا، گویا۔

انا من اھوی، ومن اھوی انا

نحن روحان حللنا بدنا

ما دو جانے آمدہ دریک بدن
من کیم و لیلیٰ کیست من

.....وہ اپنی زندگی کے وظیفہ حیات سے متعلق خود فرماتے ہیں:

محمد محمد پکیندیں گزر گئی
احد نال احمد ملیندیں گزر گئی

(حضرت خواجہ محمد یار اور عشق رسول ﷺ)

ڈاکٹر سید عبدالرحمٰن بخاری، صوفیاء گرامی قدر کے فیضان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان باکمال ذوات قدسیہ میں حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی صف اول کی زینت ہے، آپ ان خاصانِ خدا اور مقربین بارگاہِ حق میں سے تھے، جنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا اور محبوب خدا ﷺ کے نقوشِ سیرت جگمگا اُٹھتے ہیں، جن کے فیض صحبت سے بگڑے ہوئے نفوس کی اصلاح ہوتی اور بجھے ہوئے قلوب میں ایمان کی حرارت چمکتی ہے، خواجہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذاتی زندگی، عشق رسول ﷺ کا مرقع اور اتباعِ سنت کا آئینہ تھی، خلوتوں اور جلوتوں میں اسی کی جلوہ گری تھی، بندگی حق آپ کا شیوہ اور تذکرہ رسول ﷺ آپ کا وظیفہ تھا''۔ (پیکر عرفان و آگہی)

یہی چند نامور دانش وری خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے کردار، سیرت، احوال، کمالات اور اثر آفرینی کے قائل نہیں جو بھی قریب آیا، جس نے بھی دیکھا اور گفتگو سنی اور جو بھی کسی مجلس وعظ میں حاضر ہوا یہی کہتا رہا کہ قادر الکلام شاعر ہیں، فصیح البیان واعظ ہیں اور دلوں کو وحدت کی تابانیاں عطا کرنے والے صوفی ہیں، برصغیر کا شرق وغرب آپ کی جولاں گاہ تھی، جہاں سے گزرے آثار ضرور چھوڑے اگر کوئی علمی منزلت کا اعتراف لازم سمجھتا رہا تو کوئی فیضانِ شریعت کا سچا گواہ ہونا اپنا فرض گردانتا رہا، ایک ہمہ گیر محویت نے سب کو اسیر بنایا، عقیدت مندی کی سمت ایک نہیں ہوتی، یہی ہوا کہ عالم علم کے تذکروں میں دادِ تحسین دیتا رہا تو صوفی صفاء روح کی مہکار محسوس کرتا رہا ان تذکروں میں

کرامات کا تذکرہ بھی محبوب رہا کہ ان میں عقیدت مندوں کے لیے بہت گرویدگی کا سامان ہوتا ہے۔ اولیا کرام کے حدائق ہوں یا تذکرے ان روایات کا خاص اہتمام کیا جاتا بلکہ روایات وحکایات کا سارا انحصار ہی ان پر ہوتا ہے جس سے علمی، ادبی، تبلیغی کارنامے چندھیا جاتے ہیں، اس سلسلے میں توازن ایک مستحسن عمل ہے۔ یقیناً خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ نے معرفت حق اور اطاعت محبوب کریم ﷺ میں اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا، رضاء الٰہی کے متلاشی اس مقام پر پہنچ ہی جاتا کرتے ہیں کہ ان کی رضا بھی رضاء الٰہی کا مظہر بن جاتی ہے۔ یہ وہ انعام اور اکرام ہے جس کو کرامت کہا جاتا ہے۔

کرامت کیا ہے؟ یہ سوال ہر ماننے والے اور انکار کرنے والے کی زبان پر رہتا ہے اور بعض اوقات ایسے استنباطات سامنے آتے ہیں جو باہم متصادم بھی ہوتے ہیں اور رہِ راست سے انحراف کے آئینہ دار بھی، کرامت، گرم سے مصدر ہے جس کے مفہوم میں لزوم کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے، مراد ہے۔ عزت پانا، عزت پانے والا ہونا، انسان بنیادی طور پر تو مکرم ہی پیدا کیا گیا ہے کہ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ" بے شک ہم نے بنی آدم کو تکریم بخشی، یہ خالق کائنات کی عنایت ہے کہ 'تکریم' کا شرف عطا ہوا ہے، احسن تقویم، کا اعزاز پانے والے انسان کے لیے مناسب تو یہی ہے کہ اس رفعت شان کو اپنے ہر عمل کا ہالہ بنائے اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے یہ حسن تقویم، دھندلا جائے مگر یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ اسفل سافلین کے انحطاط کا بھی کتاب مبین میں ذکر کر دیا گیا ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ شرف تکریم، کچھ آداب کا متقاضی ہے، بعض قواعد ہیں جن کی پابندی تکریم کے وصف کو دوام بخشتی ہے معلوم ہوا شرف تو عطا ہوا تھا مگر اس کی مداومت کو انسانی عمل سے مربوط کیا گیا ہے، یہ عمومی جوہر ہر انسان کو دیا گیا وہ اسے محفوظ رکھے یا ضائع کر دے، یہ اُس کا اپنا کردار ہے۔ اس عموم کے ساتھ تکریم کے بعض خصوصی حوالے بھی ہیں جن کے مقاصد بھی واضح ہیں، نبی کا معجزہ انسانی شرف کا وہ نقطہ عروج ہے جس کی غیر نبی میں مثال ممکن نہیں، یہ اس لیے کہ معجزہ مخاطب کے عجز سے اعتراف عظمت کرانا ہے جو نبی کا امتیاز ہے غیر نبی سے معجزہ ممکن نہیں کہ معجزہ حق و باطل کی شناخت اور

WWW.NAFSEISLAM.COM

پہچان کا اہم ترین ذریعہ ہے، اب بھی اگر تسلیم کا جوہر نمود نہ پائے تو یہ اعلان ہوتا ہے کہ خیر کی اس وجود میں موجودگی کا کوئی امکان نہیں رہا اور جو ہمہ جہت محروم خیر ہو جائیں انہیں اس سرزمین کا بوجھ بنانے سے کیا حاصل ہے اسی لیے تو حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال کی محنت کے بعد فرمایا تھا کہ اے پروردگار ان انکار کرنے والوں میں سے کسی کا بھی کوئی گھر نہ چھوڑ، اس لیے کہ اگر چھوڑ دیا گیا تو یہ خود تو بہکے ہوئے ہیں ہی، یہ تیرے بندوں کو بھی گمراہ کریں گے، معلوم ہوا کفر جب نسلوں تک دراز ہو جائے اور شریانوں میں رقص کرنے لگے تو ایسے کفر کو مٹا دینا چاہیے کہ جب خیر کی امید ہی باقی نہیں تو شر کو کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ معجزہ کا وقوع آخری حجت کے طور پر ہوتا ہے، اس سے انکار کفر ہوگا اور وہ بھی کفر صریح تو انکار کرنے والوں کو چھوڑا نہیں جاتا، نبوت کا سلسلہ ہدایت مکمل ہوا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی بن کو تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت نہیں اس لیے معجزہ بھی نہیں اور اگر خارق عادت کا وجود سامنے آئے تو اسے معجزہ سے الگ ہی کچھ ماننا ہوگا، اصطلاحِ اسلامی میں اسی کو کرامت کہا جاتا ہے اگرچہ یہ صرف خارق عادت مظہر ہی نہیں یہ تو کرامت کئی صورتوں میں ظہور کر سکتی ہے اور دین اسلام میں کسی انسان کی عظمت و رفعت کی سب سے بڑی منزل یہی ہوتی ہے کہ اس کا خالق اس پر راضی ہو جائے، البتہ اس رضا کے ظہور کے کئی مرتبے اور کئی صورتیں ہیں، اولیاء کرام سے اس کا صدور اسی رضاء و پسندیدگی کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ انعام ہے جو خالق کل کی رضا سے بعض صورتوں میں نظر آتا ہے، کرامت ایک شرف ہے اس لیے شرف پانے والے کو اس پر شکر بجالانا چاہیے اور پہلے سے بڑھ کر عجز اختیار کرنا چاہیے تاکہ مزید کرم ہو، دوسرے یہ کہ چونکہ یہ ذاتی شرف ہے اس لیے اس کی اشاعت کی کوئی صورت نہیں کہ اس طرح نمود و نمائش کی عادت مستحکم ہوتی ہے۔ یہ ایسا شرف ہے جو سراپا عنایت بھی ہے اور سربسر اظہار بندگی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء باصفا کرامات کے ذکر کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہ شرف کسے حاصل ہوتا ہے اس کے لیے حضرت بابا فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جواب بڑا معنی خیز ہے جو آپ نے ایک محبت کرنے والے کے اس سوال پر دیا کہ بابا جی ہم دیکھتے ہیں

کہ کبھی آپ کسی بارے میں کچھ فرما دیتے ہیں تو حیرت ہے ایسا ہی ہو جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے تو فرمایا کہ جب سے حضرت قطب الدین بختیار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خدمت میں قبول فرما کر یہ حکم دیا تھا کہ بیٹا جو رب کہے وہ مان لینا ہے، میں نے اسی ارشاد کو وظیفہ حیات بنایا اور جو رب نے کہا مان لیا اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ رحیم و کریم رب اس قدر مہربان ہو گیا ہے کہ اگر میں کچھ کہوں تو وہ اپنی عنایت و کرم سے اسے قبول کر لیتا ہے۔ معلوم ہوا جب کوئی بندہ اطاعت میں ہر صورت انہماک رکھے اور احکام پر عمل کرے تو کبھی نوازا بھی جاتا ہے، کرامت اسی نوازش کا نام ہے۔

کرامت اولیاء کا ذکر ہر تذکرے کا حصہ ہے، بہتر ہوگا کہ گذارشات کی انتہا کی طرف بڑھتے ہوئے چند ایسی نوازشات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

روایت ہوا ہے کہ ایک مرتبہ شدت گرما نے لوگوں کو بے چین کر دیا، آپ کے پاس حاضر ہوئے کہ دعا فرمائیں بارش ہو جائے، فرمایا کل کھلے میدان میں اکٹھے ہو جاؤ، ایسا ہی ہوا، میدان میں موجود ہر کوئی جھلسا جا رہا تھا۔ آپ تشریف لائے فرمایا اٹھے ہاتھ کر کے دعا مانگو میں بھی تمہارے ساتھ دعا کرتا ہوں دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ بادل کا ایک ٹکڑا آیا اور ہر طرف جل تھل ہو گئی۔ یقیناً یہ ایک مستجاب الدعوات کی دعا کا اثر تھا مگر دعا کے لیے ذریعہ وہی استعمال ہوا جو رحمت عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھا، یہی حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ شرف تھا جس نے آپ کو لوگوں کے مصائب کے دور کرنے کی قوت عطا کی تھی۔

مجیٹھہ ضلع امرتسر جو اب بھارت کا حصہ ہے، کے لوگ گواہ ہیں کہ حضرت خواجہؒ ایک محفل میلاد میں تشریف لے گئے مگر حالت یہ تھی کہ بخار نے پورا جسم نڈھال کر رکھا تھا، موجود افراد کو کسی صورت تقریر کی امید نہ تھی مگر سامعین کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے سٹیج پر آ گئے اور تکیہ کا سہارا لے کر بیان شروع کیا۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام، والہانہ پن تھا کہ سامعین بھی حیرت زدہ تھے، کھڑے ہو گئے اور اس وارفتگی میں ذکر محبوب صلی اللہ علیہ وسلم، فرمایا کہ جسم کے ہر انگ میں حرارت ایمانیے

WWW.NAFSEISLAM.COM

حرارت جسم کو گھیر لیا، خود فرمانے لگے کوئی ڈاکٹر ہے تو مجھے دیکھ لو، مجھے کسی قسم کا بخار نہیں، کیوں نہیں؟ فرمایا: ''یہ شہنشاہِ دو جہاں احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذکر پاک کی برکت ہے''۔ سچی بات یہ ہے کہ نبض مریض پنجہ عیسیٰ میں چاہیے کے مصداق عاشق صادق کی نبض، طبیب کائنات ﷺ کے ہاتھ میں تھی، یہ کرامت تھی جو دربارِ رسالت سے اپنے عاشق جانثار کو عطا ہوگئی۔

یہ حقیقت بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ دل پاکیزگی کا مرکز ہوا اور ارادوں میں صداقت کا حسن ہو تو لفظوں میں بھی تاثیر اُترنے لگتی ہے۔ خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی مادری زبان تو سرائیکی تھی۔ اُردو آپ نے کسی دارالاسنہ میں نہ سیکھی تھی، پھر آپ کو زبانِ اُردو کا ماحول بھی دستیاب نہ ہوا تھا زبانیں مشق سے پختہ ہوتی ہیں مگر جب بات صداقت کی ترجمان ہو تو حرف و لفظ راستہ نہیں روکتے بلکہ کلام کسی نوعیت کا ہو سامعین کے دلوں پر دستک دیتا ہے، ایسی ہی کیفیت سعید فریدی کے سامنے تھی کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ مسجد وزیر خان لاہور میں تقریر فرمانے تشریف لائے، سامعین کی ذہنی سطح مختلف تھی اور وہ مختلف زبانوں اور لہجوں والے تھے مگر جب تقریر شروع ہوئی تو سب پکار اُٹھے کہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اپنی اپنی مادری زبان میں سن رہے ہیں، مفہوم و معنی کا یوں دلوں میں اُترنا اللہ والوں کے کمالات میں سے ہے۔

بخت رسا کے مظاہر میں سے ہے کہ محبت کرنے والا ہر لمحہ اپنے محبوب کے قرب میں عشق لازوال کی حدوں کو چھونے لگے تو پھر وہ ہمہ وقت حضور کے لمحوں سے سرفراز ہوتا ہے۔ صوفیاء تو ایک لمحہ کی غیابت برداشت نہیں کرتے، خواجہ رحمۃ اللہ علیہ بھی دائم الحضوری بزرگ تھے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپ کی نظریں ہر لمحہ دیدارِ محبوب کریم ﷺ سے مستفید ہیں، یہ بھی کئی مرتبہ ہوا کہ اس لذت حضوری میں دوسروں کو بھی شریک کر لیا گیا، حاجی غلام عباس صاحب اپنے والد محترم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ واہگہ کی جامع مسجد میں نماز فجر کے لیے تشریف لائے، نماز شروع کرنے سے پہلے بے ساختہ پکار اُٹھے ''اے محمد یار با ادب طریقے سے نماز ادا کرنا اور توجہ

WWW.NAFSEISLAM.COM

سے دیکھنا کہ تم کہاں دیکھ رہے ہو، نماز شروع ہوئی کہ غلام عباس کے والد محترم کے بیان کے مطابق سرکارِ مدینہ ﷺ اور خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم سب کی نظروں کے سامنے تھے، یہ واعی لذت اب بھی ان خوش نصیبوں کے لیے راحت و سرور کا سامان ہے۔

یہ بھی متوسلین کے یقین کا حصہ ہے کہ مرشد کریم یا کسی ولی کامل کی دعائیں اعمال کی صالحیت کی نوید بھی بنتی ہیں اور دنیاوی حوائج میں بھی مددگار ہوتی ہیں، دعائے مستجاب سے اولاد کا ہونا، نیک اعمال کی طرف راغب رہنا، کسی لٹتے ہوئے کاروبار کا چمک اٹھنا تو ہر صاحب دل کے عقیدت مندوں کی راحتوں کا حصہ ہے، طاہر فرید صاحب کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اس پر شاہد ہے، فرماتے ہیں کہ ان کا بیٹا بدصحبت کی وجہ سے شراب کا رسیا ہو گیا، ہر وقت دُھت رہتا تھا اور کسی کے کہنے میں نہ تھا، ایک مرتبہ حضرت خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو مرید نے یہ سارا دُکھڑا سنایا، سن لیا مگر خاموش رہے، بیٹا بھی موجود تھا، دیکھا اور فرمایا ''آج ہم مل کر پئیں گے'' اس نے اس وقت بھی بوتل سنبھال رکھی تھی، تھرّ اگیا، ایک لمحہ مشفقانہ اور لفظ لفظ کی حرمت جاننے والا متکلم، بس کیا تھا بوتل گری، ٹوٹی اور ہمیشہ کے لیے شراب اس گھر سے بدر ہو گئی، روحانی قوت تو بلاشبہ اثر آفرین ہے مگر کلام کی ادائیگی کا حسن بھی تو دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ کون سے الفاظ دلوں میں پیوست ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

الفاظ کے تقدس کی قوت کا اندازہ لگانا ہو تو وعظ و نصیحت کے لمحات کو گواہ بنائیے اور اگر حرفوں کی دل آویزی کا حسن دیکھنا ہو تو دلوں کو شکار کرنے کی طاقت پر نظر رکھئے، حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے لفظوں کی سحر انگیزی کو تو اپنے ہی نہیں غیر بھی شاہد ہیں لاکھوں کے اجتماع کو کلمات حسن کا اسیر بنا لینا تو آپ کے کمالات کا موہوم سا پہلو ہے، جہاد باللسان کی عظمتوں کو سلام کیجیے جس سے دشمنوں کے دل بھی چر جاتے ہیں، ایسا ہی ایک واقعہ ہے کہ لاہور بھاٹی گیٹ میں ایک مجادلہ درپیش ہوا، مخالفین نے پوری قوت سے ہم خیالوں کو اکٹھا کیا، اسٹیج لگی، مناظرہ شروع ہونے والا ہی تھا کہ آپ اچانک اسٹیج پر کھڑے ہو گئے اور فرمانے لگے مناظرے سے پہلے میری ایک بات سن لیں، فرمانے لگے:

''غور سے سنو میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ شخص جو میرے مقابلے میں آیا ہے، یہ ساری رات کتابوں کے مطالعہ میں مصروف رہا اور میں بھی مصروف رہا ہوں، یہ شخص ساری رات وہ روایات ڈھونڈتا رہا جن سے یہ حضور اکرم ﷺ کے عیب اور خامیاں ثابت کر سکے اور میں ساری رات اپنے آقا ﷺ کی خوبیاں تلاش کرتا رہا ہوں، آپ سب بتائیں کہ رات کس کی بہتر گزری ہے، میری رات یا اس کی رات، سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آپ کی رات اچھی گزری ہے اور سب نے اکٹھے آپ کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیئے یہ ساری صورتِ حال اس قدر اثر آفریں تھی کہ مقابل میدان چھوڑ گئے''۔

ایسے ہی عاشقانِ پاک بین ہوتے ہیں جن کے دل بھی روشن ہوتے ہیں اور جسم بھی، یہ وہ لوگ ہیں جن کی بقا کی ضمانت کر دی گئی ہے کہ:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

موت زندگی کا ایک ایسا پڑاؤ ہے جہاں مدارج ہویدا ہوتے ہیں اور رفعت و پستی کا فیصلہ ہوتا ہے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال لاہور میں ہوا، وہاں ہی دفن کیے گئے، گڑھی اختیار خان والوں کو ہم وطنی پر ناز تھا اس لیے ان کی خواہش تھی کہ آپ کے جسد خاکی کو وہاں منتقل کیا جائے، چنانچہ یہی فیصلہ ہوا، چند احباب کی معیت میں قبر کشائی کی گئی اور تابوت کو بذریعہ ٹرین خان پور لے جایا گیا اور پھر وہاں سے گڑھی اختیار خاں منتقل کر دیا گیا، لاہور کے محمد جاوید صاحب کے ماموں کے ہمراہ محمد صدیق فریدی، حاجی احمد دین اور حاجی محمد شریف کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے، اُن کے جذبات، احساسات اور تاثرات کیا تھے وہ خود بیان کرتے ہیں:

''ہمارے دلوں میں تجسس پیدا ہوا کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد دیکھنا چاہیے کہ حضرت صاحب کیسے ہیں، حضرت صاحب کی زیارت کا شوق اتنا بڑھا کہ رہا نہ گیا، ہم نے موم بتی کی روشنی میں تابوت کے کیل اکھاڑے اور ہم نے دیکھا پھر ہم دیکھتے ہی رہ گئے کہ حضرت صاحب کا کفن اور اتنا عرصہ قبل ڈالے

جانے والے پھول آج بھی تازہ دکھائی دے رہے تھے ہمیں اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ رہا، ہم نے دوبارہ بغور دیکھا تو محسوس ہوا گویا ابھی ابھی حضرت صاحب نے وصال فرمایا ہے اور آپ کو غسل دے کر کفن دیا گیا ہے۔ شوقِ دیدار میں جب آپ کے چہرے سے کپڑا اٹھایا، بس اوسان خطا ہو گئے۔ گویا نوری نور آپ کے چہرے سے برس رہا تھا اور محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت صاحب تلاوتِ کلام پاک میں مشغول ہیں''۔

بقول ابوالطیب المتنبی عرب کا شہرہ آفاق شاعر کہ بعض لوگ دنیا سے رخصت ہو کر بھی دمکتے رہتے ہیں اور اُن کے چہروں کی رونقیں ماند نہیں پڑتیں، کہتا ہے:

صَلَاۃُ اللّٰہِ خَالِقِنَا حُنُوْطٌ

عَلٰی الْوَجْہِ الْمُکَفَّنِ بِالْجَمَالِ

''یعنی اللہ تعالیٰ جو ہمارا خالق ہے اس کی رحمتیں اس چہرے کے لیے جسے حسن و جمال کا کفن دیا گیا ہے حنوط بن گئی ہیں'' حنوط وہ عمل تھا جس سے مردوں کو باقی رہنے کا عمل کیا جاتا ہے۔

الغرض حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مردِ حق آگاہ کی زندگی گزاری، ساری عمر مدیحِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مگن رہے، زندگی کی ہر حکایت اسی وجودِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ترتیب پاتی رہی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ممدوح مکرم رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ما حصل ہی محبت ہے، آپ وحدۃ الوجود کے قائل تھے، کئی آوازیں بعض تحفظات کے ساتھ انھیں مگر لگتا تو یوں ہے کہ آپ وحدت کے اس حد تک قائل تھے کہ کوئی دوسرا محبوب بھی برداشت نہ کر سکے، آپ کی توحید کو شرک قبول نہیں تو آپ کی محبت بھی شرک کی ہر غلاظت سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ اس روحانی مسند کو مزید رونق بخشے اور عشق و مستی کی یہ داستان سدا دوہرائی جاتی رہے۔ آمین

نفس اسلام
WWW.NAFSEISLAM.COM

حضرت خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کردار و سیرت سے ایسے ماحول کی تعمیر کی تھی کہ اس کا بدل یا مثل اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، شب و روز کی محنت سے اک جہاں کو گرویدہ ہی نہ بنایا تھا بلکہ اس میں شرارِ زندگی کو اس قدر فروزاں کر دیا تھا کہ اس کی حرارت نے زندہ رہنا ہی تھا، عموماً یہ شکوہ لبوں پر رہا کہ قدآور وجود جب رخت سفر باندھ لیتے ہیں تو خلا ہی خلا نظر آنے لگتا ہے مگر خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے خلوص کا اثر تھا یا مسند ارشاد کے وارث کی ایمانی قوت تھی کہ گڑھی اختیار خاں کی رونقیں بحال رہیں اور فیض کا باڑ ابٹتا رہا، یہ کون صاحب ارشاد وجود تھا جس نے تسلسل خیر کو قائم رکھا اور حفاظت عقیدہ و عمل کا مشن جاری رہا۔ یہ خواجہ بلند مقام رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ کا جہد مسلسل تھا جو نشر حسنات کا وسیلہ بنا۔

خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۳۳ھ میں والد گرامی کے مستقبل کی تمنائے خیر کا ذریعہ بن کر گڑھی اختیار خان میں متولد ہوئے، نیک گھرانہ جو صالحیت کا مرکز ہی نہ تھا مصدرِ یمن و سعادت بھی تھا، نومولد کی تربیت کا کفیل بنا، کس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں وہ وجود جن کا نسبی تعلق بھی باعث رحمت ہو اور جن کا چوگردہ بھی حسنات کی فصیل میں ہو، ماحول تیک، تربیت کے کفیل زہد و پارسائی کے نشان، اور خاندان پارسائی کی علامت، جو

دیکھا وہ نیکی تھی، جو سنا وہ کلمہ خیر تھا، جس سے ملے وہ حکمت و دانش کا پیکر تھا، یہ خوش بختی کی معراج ہوتی ہے کہ انسان کا وجود ہمہ وقت اور ہمہ جہت خیر کے حصار میں رہے، اور ہر جانب پاکیزگی کی قبا اوڑھے رہے، خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ہر طرف سے خوش بختی کا گھیرا تھا جس سے شخصیت کی تعمیر کا مرحلہ بحسن و خوبی مکمل ہوا، انسانی زندگی میں ارتقائی عوامل کا دوسرا حصہ تعلیم کی قوت سے تیار ہوتا ہے۔ بعض اوقات اکتساب علم کی راہیں دشوار ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات معلمین کے کردار کا جھول، شخصیت کو غیر متوازن بنا دیتا ہے۔ خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ اس حوالے سے بھی خوش قسمت قرار پائے، والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ معلم اول بھی تھے اور مربی اول بھی، چہار جانب علم کا نور ضوفگن ہو تو وجود ہی نہیں ہر ہر مظہر ذات جھلملانے لگتا ہے، گھر سے سمیٹی ہوئی سعادتوں کے ساتھ آپ طلب علم کے مقدس سفر پر روانہ ہوئے، قرآن مجید حفظ کر چکے تھے کہ داخلی حسن کی کفالت آیات ربانی کے سوا کسی کا حق نہیں ہے، دل میں قرآن مجید کا نور اترا تو جذب افکار اور نقل افکار کے لیے فارسی زبان سے آشنائی کی ابتداء کی، والد گرامی سے اس سلسلے میں بہت راہنمائی پا چکے تھے، ماحول میں بھی فارسی زبان کے اثرات واضح تھے اس لیے تدریس فارسی کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔

گھر سے مکتب کا سفر بھی تشکیل ذات کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ علم کا سفر نصیب پوری زندگی میں راہنمائی عطا کرتا ہے۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی عربی اس ماحول میں تدریسی عربی کے نامور استاد مولانا مفتی محمد حیات رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی، شعور ذرا مزید بیدار ہوا تو سفر پر نکلے کہا جاتا ہے کہ سندھ اور بلوچستان کے بعض علماء سے بھی کسب فیض کیا، نامور اساتذہ میں مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا نام شامل ہے، طلب اور بڑھی تو ڈیرہ غازی خان کے معروف عالم مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی حاضری دی اور کچھ عرصہ سلسلہ کسب علم جاری رکھا، قرب و جوار کے مدارس، اساتذہ اور مراکز علم سے استفادہ تو کر لیا مگر علم کی پیاس کی شدت کم نہ ہوئی، یہ وہ مرحلہ تھا

WWW.NAFSEISLAM.COM

جب متلاشی نظریں دور افق تک معتد ہوگئیں، مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا نام نہ صرف یہ کہ معتبر تھا بلکہ مشتاقانِ علم کا مرجع بھی تھا، اشتیاقِ علم کا علم اُٹھائے قافلے اس مردِ بزرگ کے آستانے کے لیے محوِ سفر رہتے، اب وقت آ گیا تھا کہ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مرکز علم پر حاضری دیتے اور علوم دینیہ میں رسوخ حاصل کرتے چنانچہ یہ راہِ نور وشوق روانہ ہو گیا، استادِ کبیر کے در پر حاضری تھی، مولانا مرحوم نے نو وارد شاگرد کے چہرے سے آثارِ عظمت دیکھ لیے تھے اسی لیے خصوصی توجہ فرمائی، شاگرد بھی ہونہار تھا اور محنت کا عادی تھا اس لیے ارسالِ علم اور وصولِ علم کا یہ دورانیہ بڑا بارآور ہوا، خوب پڑھا اور علم کو اپنے وجود کا حصہ بنایا، فراغت کا لمحہ آیا تو استادِ گرامی نے خصوصی انعام سے نوازا کہ شاگرد سب سے زیادہ صلاحیت رکھنے والا تھا اور اولیت کا نشان تھا، کیا دیا یہ بھی شاگرد استاد کے ذہنوں کی ہم آہنگی کی شہادت ہے، مشکوٰۃ انعام میں پیش کی اور سب پر واضح کر دیا کہ شاگرد کے شب و روز قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی عبارت ہوں گے، کس قدر خوش قسمت نکلے کہ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پلے اور فرمودات نبوت کے تحفے کے حقدار قرار پائے، ۱۳۵۳ھ میں بیس سال کی عمر تھی کہ سند فراغت حاصل ہوئی اور واپس گھر آ گئے گھر کیا تھا علم کدہ تھا جس کے باسیوں کو ہمہ وقت علم اور علم کی واردات سے شغف تھا، حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کا سایہ شفقت بھی حاصل تھا اس لیے اخذ برکات کا پورا سامان موجود تھا، علم کی دنیا سے سرخرو ہو کر لوٹنے والے کو اب عرفان و حکمت کی تحصیل کا مرحلہ درپیش تھا، خوب محفلیں رہیں، یہ انوکھا دورانیہ تھا کہ علم کی تصدیق بھی آسان ہوگئی تھی، تقسیم فیض کی ابتداء بھی ہوئی، تدریس کے لمحات بھی نصیب ہوئے مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ یقین کی راحتیت بھی مہیا رہی، والد گرامی نے برسوں کا حصیلۂ علم و ذوق صاحبزادے کو منتقل کر دیا تو صاحبزادے کے رویوں میں بھی وہی تڑپ آ گئی جو حضرت خواجہ بلند اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا امتیاز تھی اور ہے، علامہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہی مرعوبیت کو جنم دیتا ہے، اس قدر بلند نظری کہ ہر لمحہ فلک نشینی کا گمان ہوتا ہے۔ آپ کی نگارشات اہل تصوف کے لیے ہر دور

WWW.NAFSEISLAM.COM

میں محبوب رہی ہیں، فتوحات مکیہ تو ہر حال میں بلند پروازی کا مطالبہ کرتی ہے، خاک نشینوں کو اس سے کیا لینا کہ یہ ان کے لیے تو لکھی ہی نہیں گئی، فصوص الحکم، اگرچہ حدودِ عقل میں کہیں کہیں سے آ جاتی ہے مگر ہے یہ بھی بلند نگہی کی طالب، خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے ذوق کی وہ بلند پروازی پائی تھی جو ان کتابوں تک رسائی کے لیے لازم تھی اور صاحبزادے کی خوش قسمتی کہ اس کو بھی اس حوالے سے راہنمائی نصیب ہوگئی تھی، خوش قسمت تھے کہ مشکل مراحل کو سر کرتے ہیں جو راہنمائی درکار تھی وہ انہیں حاصل ہوگئی تھی اس لیے والد گرامی کی وفات کے بعد بھی ان کتابوں کا مطالعہ حرز جاں رہا، لوائح جامی، تو وہ اساسی کتاب ہے کہ اس کے مطالعہ کے بغیر حکمت و دانش کا دعویٰ سبت ہے، خواجہ نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب کو بھی ہمیشہ وسیلہ صعود بنایا اور ہمہ وقت وظیفہ حیات رکھا۔

علم و عمل کا یہ پیکر شہبازِ خطابت کا فرزند تھا اس لیے یہ بھی لازم ٹھہرا کہ قوم کو ہدایت بخشی کی سعادت سے محروم نہ رکھا جائے، چنانچہ آپ نے بھی سلسلہ تبلیغ کو اپنا مشن بنایا، افادۂ عوام کے لیے قرب و جوار کے ہی نہیں دور دراز کے بھی دورے کیے، اجتماعات کو خطاب کیا، دھیمے لہجے اور میٹھی زبان میں سامعین کے دلوں کو گداز بخشا، حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و راہنمائی کا وہ سلسلہ جو حضرت خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ سے جاری تھا اسی ظرف وسیع ہوتا گیا یہ اس آستانے کی بلند اقبالی تھی کہ نہ مدہمت آئی نہ انحطاط بلکہ ترقی و عروج کا سلسلہ پوری قوت سے جاری رہا اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پیغام جو اس درگاہ کی شناخت تھا پھیلتا ہی رہا۔

مشن ہو یا پیغام جاری تبھی رہتا ہے کہ پیش کار کی شخصیت جاذبِ نظر ہو اور جذابِ قلب بھی، اسلامی تعلیمات میں بلند اقبال وہی ہے جو ان تعلیمات کو اپنے وجود پر بھی نافذ کرے، نصیحت صرف بے جان لفظ ہوتی ہے جب کہ اس میں عمل کی حرارت موجود نہ ہو، مبلغین، واعظین اور صالحین کے اثرات صرف اس صورت میں ہمہ گیر اور دیرپا ہوتے ہیں جب ان میں ذاتی کردار کا گداز روشن ہو، خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ پر

اک نظر ہی یقین دلا دیتی تھی کہ یہ سراپا کسی عاشق کا ہے جو تعلیماتِ اسلام کی میزان پر مستانہ وار ہی سہی مگر ثبات رکھتا ہے، شریعت مطہرہ کا ہر لمحہ خیال، سنت پر عمل کا ہر لحظہ شعور اور فرائض، سنن بلکہ نوافل و وظائف کی ہر دم پاسداری، انسان کو لوگوں کی نظر میں محترم بنا دیتی ہے صبح و شام وظائف، ہر نماز کے بعد ترتیب وِرد اور ہر موقعہ پر ذکر کا اہتمام آپ کی زندگی کے وہ مشاغل تھے جنہوں نے پورے ماحول کو آسودہ کر رکھا تھا، کہا جاتا ہے کہ اعمال و وظائف کے تمام معمولات بلا انقطاع جاری رہتے تھے، سفر ہو، بیماری ہو یا کوئی دنیاوی مجبوری ہو، ان کا تسلسل نہ ٹوٹتا تھا، کوئی نشست ہو ان اعمال سے ہی مزین ہوتی جس سے ان نشستوں کا وقار قائم تھا، محفلیں، فیضان تقسیم کرنے والی ہوں، ارشادات و فرمودات حدِ آداب سے سماعت نواز ہوں اور لمحات خیر کی جلا سے منور ہوں تو سمجھ لیجیے ''بنتا ہے بازار نور کا'' ان بزرگوں کے عرائس کی محفلیں دنیا داری نہ تھیں بلکہ دین کے مزاج سے روشن تھیں، سال میں ایک مرتبہ حاضری سارے سال میں طلب حسنات کی کفالت کرتی ہے، خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ ہوں یا خواجہ غلام نازک کریم علیہ الرحمۃ انہوں نے عرس کے اجتماعات کو صیانت عقیدہ اور ترویج رشد و ہدایت کے لیے ہی وقف رکھا، یہ بھی یاد رہے کہ اس دور میں جبکہ اجتماعاتِ خیر بھی آلودگیوں کا شکار ہو گئے ہیں، ان ایام و مقامات کو عجبِ دنیا کے خمار سے بچائے رکھنا ایک جہاد ہے۔ کس قدر دکھ ہوتا ہوگا اس صاحب قبر کو جس کے چاروں طرف ہوا و ہوس اور شر و فساد بپا ہو، نیکیوں کے یہ مراکز ہر صاحب دل سے اصلاح کے طالب ہیں خصوصاً ان سے جو انتظام و انصرام کے مکلف بنائے گئے ہیں یہ تبھی ممکن ہے کہ مسند نشین کو یہ شعور حاصل ہو کہ وہ ایک ذمہ داری نبھا رہا ہے اور اسے اسلاف کی یادگاروں کو اسلاف کے مزاج و عقیدہ کے مطابق قائم رکھتا ہے، اس کے لیے عجز و انکسار لازم ہے، کہا جاتا ہے کہ ہمارے ممدوح تو انکسار ہی نہیں، نیازمندی کی بھی حدوں کو قائم رکھتے تھے، ان کو بقول سید فاروق القادری نہ دنیاوی لالچ تھا نہ آپ کسی غیر کی خوشنودی کے قائل تھے، سب کچھ لوجہ اللہ تھا، خود بھی شریعت کے پابند تھے اور اسی کی

سب کو تلقین کرتے رہتے تھے، حق پرستی شعار تھا، کسی سے نہ حسد تھا نہ عناد، یہی وجہ تھی کہ خلق خدا اپنے ہر مشکل وقت میں دعا کے لیے حاضر ہوتی کہ دعا کی قبولیت کے لیے اخلاص لازم ہے اور وہ انہیں اسی مردِ قلندر کے ہاں نظر آتا تھا، تجربہ ہے کہ عقیدت مندوں کی کثرت ہو جائے تو غرورِ نفس کی پرورش ہونے لگتی ہے، طاقت کا کوئی وسیلہ بھی دستیاب ہو جائے تو انانیت پھنکارنے لگتی ہے۔ طاقت، قوت اور عقیدت مندوں کی کثرت بھی اگر انکسار کے حسن کو ماند نہ کر سکے تو سمجھیے صداقت بول رہی ہے اور حسنات کی افزائش ہو رہی ہے۔ خواجہ غلام نازک کریم علیہ الرحمۃ، مسند ارشاد کے تقدس کو قائم رکھے تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے رہے، اصلاح عوام کا یہ مشن دن رات جاری رہا، مشغولیت کی کثرت اوراد و ار وظائف کی مصروفیت اور عوام الناس سے مسلسل رابطوں نے جسم کو مضمحل کر دیا اور آپ بیمار رہنے لگے اور مختلف عوارض سر اٹھانے لگے، آخر وہی ہوا جو اس دنیا کا معمول ہے کہ ۲۴ محرم کی رات کے اولین حصے میں یہ فیض رساں بزرگ اور گڑھی اختیار خان کے مردِ دانش وحکمت اس بے ثبات دنیا سے دارِ ابد کے راہی ہوئے، ایک اندوہ کا سماں تھا کہ متوسلین کی نگاہیں سراپا عزم راہنما کو خاک نشین ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

سفر حیات کا ایک مرحلہ تمام ہوا مگر یہ پیغام امید سب کے لیے جانکشا رہا کہ گھبراؤ نہیں۔ ؎

ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

خواجہ غلام قطب الدین فریدی مدظلہ

حضرت خواجہ غلام نازک کریم رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد آپ کی مسند ارشاد پر چار صاحبزادوں میں سے کس کو فائز ہونا تھا یہ فیصلہ بڑے اخلاص اور دروں بینی کا محتاج تھا مگر خوش قسمتی یہ ہوئی کہ چاروں صاحبزادوں میں کسی قسم کی جلد بازی دیکھنے میں نہ آئی۔ مسند کی عظمت، فرائض کی نوعیت اور مستقبل کی پیش بندی نے آخر کار یہ متفقہ فیصلہ کی راہ دکھائی اور خواجہ غلام قطب الدین فریدی اگرچہ چھوٹے تھے مگر انہیں کا نام اتفاق کی اساس بنا، یوں آپ اپنے والد گرامی کے جانشین قرار پائے۔

خواجہ غلام قطب الدین ۱۹۵۳ء کو اپنے ہی گاؤں گڑھی اختیار خاں میں پیدا ہوئے، خاندان کی روایت کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر سے ہی شروع ہوئی، قرآن مجید حافظ محمد نواز رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا جو بعد میں مدینہ منورہ چلے گئے اور اس قدر خوش قسمت نکلے کہ وہاں ہی وفات پائی، فارسی کی تعلیم جو ایسے صوفیانہ گھرانوں کی ضرورت بھی ہے اور امتیاز بھی، اپنے والد گرامی سے پائی، لوائح جامی اور تحفہ مرسلہ کے اسباق بھی انہیں سے لیے، پھر بستی لودھراں جو مظفر گڑھ ضلع کی تحصیل علی پور میں خیر پور سیداں کے قریب ایک بستی ہے کے مولانا محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، وہاں سے بھیر پور آ گئے تا کہ مولانا حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور صوفی ہاشم علی رحمۃ اللہ علیہ سے علم صرف کے اسباق پڑھ سکیں، ان دنوں ڈیرہ غازی خان میں مولانا غلام جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ صاحب ہفت اقطاب کی

بڑی شہرت تھی اس لیے ان کے ہاں شامل درس ہو گئے۔ لودھراں میں جامعہ محمدیہ فریدیہ سے تعلق خاطر تھا اس لیے وہاں مولانا محمد افضل رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تدریسی پیش رفت کے لیے دو سال قیام کیا، آخر کار درسی زندگی کی تکمیل کے لیے کہروڑ پکا آ گئے وہاں ایک جامع معقول و منقول استاد مولانا منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی شہرت دینی طلبہ میں بہت زیادہ تھی۔ آپ ان کے ہاں چار سال رہے اور درسیات کی تدریس مکمل کی۔

حصولِ علم میں مروجہ نصاب سے فارغ ہونا ہی تکمیل علم کا نشان تھا، اب وقت آ گیا تھا کہ خود مسند تدریس کو رونق بخشیں، اس کے لیے اس دور کے نمائندہ مدرسہ جامعہ نعمانیہ لاہور کا انتخاب کیا وہاں منتہی طلبہ کو پڑھانے کی صلاحیت ظاہر ہوئی۔ قطبی، میر قطبی، شرح جامی، شرح عقائد، شرح تہذیب جیسی کتب پڑھانے پر مامور ہونا درسیات میں لائق اعتماد منزلت کا اظہار تھا۔ مسند نشینی کی مصروفیت نے اس سلسلہ تدریس کو تادیر قائم نہ رہنے دیا مگر اس خواہش کی تکمیل ان مدارس کی شکل میں اب تک ہو رہی ہے جو آپ کے زیر نگرانی چل رہے ہیں، قطب المدارس جوگڑھی شریف میں قائم ہے وہاں خود بھی پڑھایا اور اساتذہ کا تقرر بھی کیا دار العلوم محمدیہ فریدیہ ہر مینس پورہ لاہور بھی آپ کی تدریسی کاوشوں کا ثمر ہے۔

خواجہ غلام قطب الدین فریدی اپنے دادا محترم کی طرح شعر پر بھی خوب دسترس رکھتے ہیں۔ عمدہ اشعار اور مرغوب مفاہیم آپ کی شاعری کے حوالے ہیں، مسند ارشاد کو آپ کی سرپرستی میں بہت وقار، وسعت اور شناخت حاصل ہوئی ہے، عرس کی سالانہ مجالس جوگڑھی اختیار خان میں خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر منعقد ہوتی ہیں بڑی پر کیف ہیں مسلسل تین دن میزبانی کا حق بھی ادا ہوتا ہے اور ترویج خیر کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ملک بھر میں ایمان افروز مجالس خصوصاً خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں سیمینار دنیائے علم میں ایک عمدہ اضافہ ہے اور وابستگانِ سلسلہ کے لیے اظہارِ محبت و عقیدت کا ذریعہ ہے۔ خواجہ صاحب تصوف اور صوفیاء سے کس حد

WWW.NAFSEISLAM.COM

تک محبت رکھتے ہیں اس کا اندازہ آپ کی علمی سرگرمیوں سے لگایا جاسکتا ہے آپ اپنے عقیدت مندوں کے ہر اجتماع میں تصوف کے حوالے سے بڑی علمی گفتگو کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ صوفیاء سے محبت کرنے والے ہر فرد تک تصوف کی روشنی پہنچے، یہ اجتماعات اس قدر مقبول ہوتے جارہے ہیں کہ اکثر احباب اس کا تقاضا کرتے رہے ہیں اس طرح تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہورہی ہیں۔

صوفیاء دشمن قوتیں جب تحریر وتقریر سے اور ابلاغی اداروں سے تصوف کو بدنام ہی کرنے لگیں بلکہ صوفیاء کرام کو خارج از اسلام قرار دینے لگیں، یہ وہ لمحہ تھا اس پر ہر درد مند انسان چیخا، علم دوست لوگوں پر یہ دعوے بجلی کی طرح گرے مگر کیا کہا جائے، مدعیان تصوف صرف یہ الزامات سنتے رہے، ہوسکتا ہے دلوں میں رنجیدہ بھی ہوئے ہوں مگر کسی عملی اقدام سے گریز کرتے رہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ اضعف الایمان کی سطح ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خاموشی، عوامی جذبات کو بے توفیق بنانے کی صورت ہے۔ ایسے نازک لمحے میں خواجہ غلام قطب الدین فریدی کی جواں ہمتی، لگن اور خلوص کام آیا اور ایک نہایت ہی پروقار اور علمی اجلاس کا اہتمام کیا گیا جس میں گراں قدر مقالات پیش کیے گئے یہ ایک علمی ردعمل تھا اور تحفظ ناموس صوفیاء کا عظیم کارنامہ بھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے نازک لمحات ہی صوفیانہ استقامت کی دلیل ہوتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی یہ کاوشیں اندرونِ ملک تک ہی محدود نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں اس کا اعتراف کیا گیا، اکتوبر ۲۰۰۱ء میں ہلٹن ہوٹل نیویارک میں ایک عالمی امن کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں مختلف مذاہب کے اہل علم شریک ہوئے اس کانفرنس میں مختلف مذاہب کے چھ نمائندہ افراد کو ''امن کے سفیر'' (Ambassador of Peace) کا ایوارڈ دیا گیا، ان میں سب سے پہلا ایوارڈ خواجہ غلام قطب الدین فریدی کو دیا گیا، یہ منفرد اعزاز صوفی پیغام محبت کا برملا اعتراف تھا اس سے ثابت ہوا کہ صوفیاء کرام محبتوں کے سفیر ہیں، ان کے کردار وسیرت سے روشنی پاکر دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہیں۔

WWW.NAFSEISLAM.COM

خواجہ صاحب کی شاعری کے حوالے سے کچھ عرصہ قبل ایک تعارفی مضمون لکھا گیا تھا جس میں میں نے آپ کی شاعری کو نقد و نظر کا موضوع بنایا تھا، مناسب ہوگا کہ اس مضمون کو اس تحریر کا حصہ بنا دیا جائے۔ مضمون کا متن ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے مجموعہ کلام بیتابی کے حوالہ سے لکھا گیا۔

شعر کا ظاہری ہیولہ عروضی ضوابط کا پابند ہوتا ہے کہ اس میں اوزان کی پابندی، قوافی کی پاسداری اور حرفِ روی اور مجریٰ کی راستی کا اہتمام ضروری ہوتا ہے، اختیار کلمات کا حسن اور موسیقی کلام کا جمال شعر کو قبولیت کی سند عطا کرتا ہے، شعر کی داخلی فضا اُس روحِ معنی سے عبارت ہے جو ہر کلمہ کو زندگی عطا کرتی ہے، خوبصورت لفظ دلکش انداز میں ترتیب پائیں اور حسن معنی اس ترتیب کو ایک زندہ حقیقت بنا دے تو شعر سر بسر حکمت ہی نہیں ہوتا ہمہ تر سحر بھی ہوتا ہے، یہ جذب و کیف جب پیکر شعر کو ایک متحرک صورت عطا کرتے ہیں تو شعر اثر آفرینی کی معراج پر ہوتا ہے، کہا گیا ہے کہ لفظ و معنی میں جسم و روح کا تعلق ہے، جسم کی سج دھج کا ایک مقام ہے مگر اس کی رونق روح کے حوالے سے ہے، یہ حوالہ نہ ہو تو جسم مردہ ہے اور مردے کو کس قدر بھی عملی مومیائی سے گزارا جائے باعث نشاط نہیں لائق عبرت ہی ہے، شعر میں شاعر کے شعور کی ایک ایسی زندہ جھلک چاہیے جو جذبۂ صادق سے ناشی ہو تاکہ ہر قاری اور سامع اسے اپنے دل کی آواز اور روح کی تڑپ خیال کرے، شعر کی زندگی انہیں جذبوں سے عبارت ہے، ایسے جذبوں کا حامل شعر زمانے کی قید میں نہیں رہتا بلکہ اُس کا دوام اپنے وجود سے برقرار رہتا ہے وگرنہ کتنے دیوان مرتب ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے مگر زمانے کی گردان کو اوراق گم گشتہ کے اندھے کنویں میں پھینک دیتی ہے، علماء شعر نے شعر کی بقا کے چند اسباب گنے ہیں، شعر اپنے وجود کی بناء پر زندہ رہنے کی قوت رکھتا ہو تو وہ شاعر کا بھی محتاج نہیں رہتا کتنے شعر آفاقی حقائق بن کر ہر دور کے شعور کا حصہ ہیں مگر وہ کس شاعر کے ہیں؟ یہ صرف ایک علمی مبحث بن کر انتساب کے انتشار کا شکار ہے، بعض شعر، شاعر کے وجود کی برتری کے سہارے زندہ ہیں جیسے خلفاء اور

WWW.NAFSEISLAM.COM

حکمرانوں کے اشعار، کچھ شعر ایسے بھی ہیں جن کی نسبت کسی نامور بزرگ یا سراپا احترام شخصیت سے ہے اس لیے وہ شعر کی خاطر کم اور نسبت کے حوالے سے زیادہ لائق توجہ رہے ہیں، ایسے اشعار سہاروں کے محتاج ہوتے ہیں اور مقصود بالذات نہیں ہوتے، شعر دراصل وہی زندہ ہے جسے کسی نسبت یا لاحقے کی ضرورت نہیں ہوتی، ہاں اگر ایسا لاحقہ مل بھی جائے تو اضافی عظمت کا ذریعہ بنتا ہے۔

صوفیاء کرام کی مجالس میں شعر خوانی کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے کہ شعر ایصالِ جذبات کا موثر ذریعہ ہیں۔ مگر بعض صوفیاء کے ہاں شعر کا معیار اس قدر بلند رہا ہے کہ اُن کے اشعار کو شعری معیار کے کسی حوالے سے بھی جانچا جائے وہ لائق عظمت اور قابلِ التفات ٹھہرتے ہیں، علامہ ابن الفارض رحمۃ اللہ علیہ یا امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کے شعری محاسن کو کسی کرامت یا معاشرتی تقدس کا زینہ درکار نہیں، مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت اور دینی مقام کا حوالہ نہ بھی دیا جائے تو اُن کی شاعری اپنی شعری منزلت کی وجہ سے ہی پرکشش اور لائق مطالعہ ہے۔ عصر حاضر میں پیر سید نصیر الدین نصیر گولڑہ شریف کا شعری مقام اُن کی سجادہ نشینی کا محتاج نہیں اس لیے کہ ان کے شعروں میں زندہ رہنے کی قوت موجود ہے، خواجہ غلام قطب الدین فریدی کا شعری ذوق بھی اپنی عظمت خود منوا رہا ہے، آپ یقیناً ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، یہ سچ ہے کہ اُن کے قلب و نظر پر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کی برکات کا سایہ ہے، جذب دروں کی تمازت، ذہن رسا کی حدت اور صیانتِ کردار کا جوہر ان کا ایسا ورثہ ہے جو اپنی لو سے گرد و پیش کو جگمگا تا رہے گا، تصوف کے گداز اور سلسلۂ چشتیہ کی وارفتگی نے آپ کے کردار اور آپ کے رویوں میں ایک وقار کی افزائش کی ہے، خواجہ فرید رحمۃ اللہ علیہ کی مستی تو آپ کی شناخت ہے ہی مگر خواجہ محمد یار فریدی رحمۃ اللہ علیہ کے عشق نے آپ میں دربارِ رسالت سے والہانہ وابستگی کو مزید جلا بخشی ہے، اس عصرِ بے توفیق میں جبکہ سعادت گاہوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے، عمل کی بساط ہی نہیں علم کی مسند بھی اضمحلال کی گرفت میں ہے، ایسے دور میں جبکہ اخلاقی اقدار اور روحانی اوصاف جنس نایاب ہوتے

جا رہے، اگر کہیں سے کردار و عمل اور علم و تزکیہ کی کوئی صورت دکھائی دے تو مایوسیوں کے گرداب میں امید کی روشنی جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ خواجہ غلام قطب الدین مدظلہ سے جب پہلی مرتبہ شرف ملاقات حاصل ہوا۔ یہ لمحۂ وصال اگرچہ مختصر بھی تھا اور سرِ راہ بھی مگر شخصیت کا ایک عکس سطحِ ذہن پر رقص کرنے لگا تھا اس قدر وقار مگر اس قدر انکسار، یہ قرانِ السعدین تو خواب و خیال ہو چکا تھا، حیرت ہے یہ لمحہ گزران ایسا نقش چھوڑ گیا کہ اک تعلق محبت قائم ہو گیا، الحمدللہ پھر آپ سے نیازمندی میں کیف محسوس ہونے لگا اور پھر ملاقات، قربِ خاطر کی تحریک کو جنم دیتی رہی، ایک امید سی پیدا ہونے لگی کہ خانقاہیں، زاویے اور آستانے اب بھی علمی وقار اور علمی وجاہت کے مرکز بن سکتے ہیں، تعمیر کردار کا مثالی دور پھر واپس آ سکتا ہے، کاش ایسا ہو جائے تا کہ حضرت اقبال علیہ الرحمہ کا یہ شکوہ دور ہو جائے کہ تین سو سال سے برصغیر کے میخانے بند ہو چکے ہیں، کاش خانقاہوں کے مسند نشین پھر سے اسوۂ شبیری ادا کرنے کی تحریک پا سکیں، خواجہ صاحب کے وجود سے ایسی دعائیں پھر لبوں پر آنے لگی ہیں، اللہ کرے یہ دعائیں مستجاب ہوں۔ آمین

معذرت خواہ ہوں کہ بہک گیا ہوں، میں تو خواجہ صاحب کے مجموعہ شعر ''بیتابی'' کے بارے میں کچھ تاثرات پیش کرنا چاہتا تھا ''بیتابی'' کا مطالعہ میرے اندر بھی بیتابیوں کا ایک طوفان اٹھا گیا، خانقاہ، مسند نشینی، دست بوسیوں کا اک سلسلہ، نیازمندیوں کا ہالہ اور ایسا مجموعہ شعر جو صرف عروضی مشق نہیں اور نہ ہی بے جان حرفوں کی ایک شعوری قطار، حیرت بھی ہوئی اور حوصلہ بھی بڑھا، یہ ترتیب کلمات کی ایک کاوش ترکیب جذبات کا اک مرقع ہے، انتخاب الفاظ میں ایک سلیقہ ہے تو تدوین معانی میں ایک قرینہ، لفظ، لفظ باوضو اور با ادب ہے، یہ مصرعوں کی پریڈ نہیں، محبت و عقیدت کی ایک صف بندی ہے، ہر صفحہ دامن دل کھینچتا رہا، اس میں حمد ہے، نعت ہے، منقبت ہے، غزل ہے، عنوان جدا جدا ہیں مگر اول سے آخر تک ایک ہی جذبہ کارفرما ہے، صوفیانہ سرمستی کے آثار بھی ہیں اور عالمانہ وقار کے مظاہر بھی ہیں، شعر کی حدود کا احساس بھی ہے اور ممدوح علیہ الصلاۃ والسلام کی بلند

منزلت کا شعور بھی ہے، جنبشِ لب کی حد بندی سے آگہی بھی ہے اور دربارِ رسالت کے آداب کے قرآنی فرامین کی باخبری بھی، نعت کامل خود سپردگی کا نتیجہ ہے۔ ذات اقدس ﷺ کے فضائل، خصائل اور شمائل جب اپنے ہمہ گیر اثرات سے قلب و نظر کو تسخیر کرتے ہیں تو قلب مخمور کا والہانہ پن نعت کا محرک بنتا ہے۔ ''بیتابی'' میں شامل نعتوں کا مجموعی تاثر ایک قلب مخمور کا ہی ہے، محبت کبھی صفات شماری میں تسکین پاتی ہے تو کبھی جمال محبوب کے تذکروں میں راحت محسوس کرتی ہے، کبھی ذاتِ محبوب موضوع بنتی ہے تو کبھی متعلقاتِ محبوب کی یاد لفظوں کا روپ دھارتی ہے۔ اس تمام کاوش میں اگر محبت پابند آداب رہے اور حدودِ شریعت کا حصار رہے تو ایسی مدحیہ شاعری وجود میں آتی ہے جو محمود بھی ہوتی ہے اور باعث نجات بھی۔ خواجہ صاحب کی نعتیہ شاعری سے ایک باادب محبّ اور حدود آشنا عاشق کا تاثر ابھرتا ہے، میر تقی میر نے کہا تھا

دور بیٹھا غبار میر اُن سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

خواجہ صاحب کی شاعری میں اس ادب شناس روش کا بار بار احساس ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ کے حوالے سے تقریباً ہر نعت میں کوئی نہ کوئی اشارہ اس رہی محبت کی قلبی کیفیات کا پتہ دیتا ہے، صرف چند شعر اس تڑپ کی غمازی کے لیے کافی ہیں۔

دل تو بھر آیا ہے شہر مصطفیٰ کی یاد میں
تو بتا آخر تجھے کیا دیدۂ تر ہو گیا

.....○.....

آرزو ہے کہ تیرا گنبد خضریٰ دیکھوں
جس طرف آنکھ اٹھے نور برستا دیکھوں

.....○.....

بیٹھنے چین سے دیتی نہیں حسرت دل کی
اب کسی طور ترا نقش کفِ پا دیکھوں

WWW.NAFSEISLAM.COM

جس ارضِ مقدس کا ہر اک گوشہ حرم ہے
مدفن کے لیے کاش میسر وہ زمیں ہو
میں نہ مر جاؤں کہیں ہجر کے صحراؤں میں
عمر گزرے درِ سرکار پہ آتے جاتے

یہ ہجر کا گداز اور حاضری کا ارمان ارض مقدس کی عظمتوں اور حضوری کی راحتوں کا شمار کرنے لگتا ہے۔

ذرّے اُس خاک کے تابندہ ستارے ہوں گے
جس جگہ آپؐ نے نعلین اُتارے ہوں گے

.....○.....

شاہوں سے کچھ غرض نہ کسی تاجور سے ہے
میری تو آشنائی ترے سنگ در سے ہے
جس راہ سے وہ سروِ خراماں گزر گیا
نسبت میری جبیں کو اُسی رہ گزر سے ہے

اور جب حرماں نصیبی کی حدت حاضری کے کیف میں ڈھلتی ہے تو جذبوں کی فضا ہی بدل جاتی ہے۔

ہر سانس میں بو باس ہے حب نبوی کی
مہکا گئی رعنائی گلزارِ مدینہ
پابندِ ادب چاہیے سانس اور نظر بھی
نازک ہے بہت عرش سے دربارِ مدینہ

اور پھر حاضری دربار اور زائر حرمِ نبوی کا ترانہ

در آقا پہ بہر التجا اتنا ہی کافی ہے
کرم سرکار ہو جائے کرم سرکار ہو جائے

WWW.NAFSEISLAM.COM

مگر یہ احساس بھی عقیدت خالص کا ایک پرتو ہے۔

عالم یہ ندامت کا ہے لب کھلتے نہیں ہیں
مجرم ہوں در شافع محشر پہ کھڑا ہوں

اب شاعر محبت ہے اور در محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اس لیے اک کونہ اطمینان بھی ہے۔

یاران تیز گام کو جنت کی ہے تلاش
پا کر درِ حبیبؐ یہ حسرت بھی مر گئی

اب تو دعا میں بھی کیف حضوری ہے۔

طیبہ کی سرزمیں ترے بام و در کی خیر
تجھ سے ہے دل کو چین نظر کو قرار ہے

اس لیے یہ اعتراف بھی ہے۔

اے بادشاہِ حسن کرم میرے حال پر
اس قطب کا کرم پر ہی دارومدار ہے

مدینہ منورہ شہر محبت ہے اور محبت اپنی صداقتوں میں ہمہ فعال ہوتی ہے اسی لیے تو کوہ اُحد کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ "یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں" سنگ و خشت بھی محبت کی جولانیوں سے مہکنے لگتے ہیں کہ مکان، مکین کی نسبت سے عزت و احترام پاتے ہیں، خواجہ صاحب کو اس فعالیت کا گہرا احساس ہے اس لیے آپ کا ہر شعر اسی فعالیت کا مظہر ہے، اس احساس کی جلوہ نمائی دیکھئے۔

اللہ اللہ نطق پیغمبر میں یہ اعجاز ہے
سنگریزے بھی ہوئے ہیں آشنا گفتار سے

یہ سنگریزے، خاک، مسیحائی کے حوالے بھی ہیں اور سکون قلب کا ذریعہ بھی۔

قطب جب خاکِ مدینہ ہر اک غم کا علاج
کیا غرض ہے کہ کوئی اور مسیحا دیکھوں
ٹھہرتی نہیں ہے ذرا بھی طبیعت
میں تھوڑی سی خاکِ حرم چاہتا ہوں

یہ چاہت، یہ تمنا اور یہ طلب وارفتگی میں ڈوبی ہوئی ہے سراپا التجا ہے مگر ادب شناس بھی ہے۔

یہاں پہ سانس بھی لینا ادب سے
یہاں حکم خدا لا ترفعوا ہے

مدح نگاری کے سب حوالے شاعر رنگین نوا کی عقیدت سے عطر بیز ہیں اس لیے مدح اور استغاثہ میں بڑے سلیقے کی یکجائی ہے۔ مثلاً

جس حسن کی نظیر نہیں کائنات میں
اے بادشاہِ حسن وہ تیرا جمال ہے
کائنات زیست ہے روشن تیرے انوار سے
ساری قدریں فیض پاتی ہیں ترے کردار سے
اس چہرہ حضور سے سب زندگی کے رنگ
اور اسوۂ جناب سراپا بہار ہے
وہ جس کی گرد راہ کواکب کی آبرو
ارض و سما کی آن وہی شہسوار ہے

استغاثہ و استعانت کا اظہار بھی عظمت و جلال اور رفعت و کمال کے انہی سائیوں میں رہتا ہے، چند شعر ؎

اٹھ گئی جب تری جانب وہ کرم بار نظر
اس گھڑی قطب ترے وارے نیارے ہوں گے

WWW.NAFSEISLAM.COM

ہے محتسب بھی پیش حضور اضطراب میں
فردِ گناہ اس کی نہ جانے کدھر گئی

.....○.....

وہ خوب جانتے ہیں مری حال زار کو
میں بندۂ حبیب علیم و خبیر ہوں

.....○.....

اگر مجھ پر تیری چشم کرم اک بار ہو جائے
میری کشتی شہا طوفانِ غم سے پار ہو جائے

.....○.....

قیامت کا وہ دن بھی ایک روز عید ٹھہرے گا
سرِ محشر اگر سرکارؐ کا دیدار ہو جائے
تشنۂ تکمیل ہے اب تک مری قوس حیات
حلقۂ کامل بنا دے لذتِ دیدار سے

WWW.NAFSEISLAM.COM

.....○.....

بے قراری سے مجھے ڈھونڈ رہی ہے بخشش
شاید اُس نے ترے ابرو کا اشارہ دیکھا

.....○.....

کور میں آ کے چلے جائیں گے کچھ پوچھے بغیر
پاسداری تری نسبت کی نکیرین میں ہے

یہ شعر پڑھتے ہی رام کوٹری جو فیضانِ نعت سے کوثر علی کوٹری ہو گیا، کا یہ شعر سطح ذہن پر تیرنے لگا۔

منکر نکیر کرنے لگے عذر و معذرت
کس کا لیا ہے نام یہ صاحب مزار نے

خواجہ قطب فریدی عصر حاضر کے تقاضوں سے مکمل آگہی رکھتے ہیں، امت کی زبوں حالی اور لاچاری کا دُکھ آپ کے خیالات میں یوں رچا ہوا ہے کہ مدح وثنا کی محویت میں بھی نمایاں ہونے لگتا ہے، یہ شاعر کے لمحہ موجود سے باخبر ہونے کا ثبوت ہے کہتے ہیں۔

یہ امت لاچار زبوں حال بہت ہے
پھر عظمت کردار سے معمور فضا ہو
منگتا ترا کیوں جائے کسی غیر کے در پر
جو تو نے دیا جب وہ طلب سے بھی سوا ہو

خواجہ صاحب کو اس اظہار عقیدت پر کوئی فخر نہیں کہ یہ تو ممدوح کریم ﷺ کا ہی کرم ہے۔

جب سے ہے دل میں عشق محمدؐ بسا ہوا
میرا یہ دل ہے گلشن رحمت بنا ہوا
ذوق سلیم، شوق تمنا، حب پنجتن
سب کچھ اسی جناب سے مجھ کو عطا ہوا

.....○.....

یہ شاعری ہے نہ کوئی سخن طرازی ہے
چمک رہے ہیں عقیدت کے کچھ نگینے سے
کیا عظمت سرکار بیاں ہو گی بشر سے
پابوس جب اسی نور کا وہ سدرہ نشیں ہے

خواجہ صاحب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ یاد آ گئے، خواجہ صاحب کا کہنا ہے۔

سر تو بس حکم پہ جھکتا ہے سوئے بیت حرم
سجدۂ دل رُخِ محبوب کے قوسین میں ہے

علامہ فرماتے ہیں ۔

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم
وگرنہ جز تو مارا منزل نیست

''بیتابی'' میں منقبت کے حوالے سے بھی چند شعر ہیں جو بظاہر ایک روایت نبھانے کے لیے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا طائر فکر گنبد خضریٰ کے حصاری رہنا پسند کرتا ہے۔ اس مجموعہ شعر میں چند غزلیں بھی ہیں مگر ان کو پڑھ کر بھی ایسا ہی احساس ابھرتا ہے کہ یہ صرف حرم سرے محبوب کی غلام گردشیں ہیں کہ یہاں رُکنا مقصود نہیں اس لیے ان سے گزرتے ہوئے کاشانہ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش نظر رہا ہے۔ کہیں کہیں صوفیانہ مزاج بھی نمودار ہوتا ہے مگر یہاں تصوف بے باک سرمستی نہیں بنتا، حدود شریعت کا پاسدار ہی رہتا ہے، غزل کے پیرہن میں وجودِ نور کی تابانیاں دیکھئے۔

خاموش سا، اُداس سا، بے جان سا ہے دل
جب اُن کا نام لوں تو دھڑکتا ہے رات دن
کیونکر نہ کرے ناز مرا ذوقِ عبادت
تابندہ جبیں جب ہے ترے نقشِ قدم سے

.....○.....

سجی ہے کہکشاں جو آسماں پر
کہ تیری گرد رہ کو پا گئی ہے

.....○.....

میں اُن کا نام لیتا جا رہا ہوں
میرے سب کام ہوتے جا رہے ہیں

WWW.NAFSEISLAM.COM

میرے خوابوں میں آجائیں گے شاید
یہی امید لے کر سو گیا ہوں

.....○.....

نہ مجھے حرم کی تلاش ہے نہ ہے دیر سے کوئی واسطہ
مری آرزو تری رہگزر مری جستجو ترا نقش پا
کتابوں سے نہ مکتب سے غرض ہے
مری گتھی نظر سلجھا گئی ہے

نعت کے سایوں میں اور وحدت الوجود کی الست مستی میں سخن دل زار کی جولانیاں قاری کو مسلسل متوجہ رکھتی ہیں۔ غزل تو ایک وقفۂ استراحت ہے کہ خیال و فکر مجاز کے صحرا میں بھٹکنے میں عافیت پاتے ہیں، شعر پر گرفت اس میدانِ مجاز میں بھی اپنی پختہ کاری دکھاتا ہے، ایسی رند مشربی کے چند حوالے دیکھئے۔

آنسو بھی اب تو چشم حزیں میں نہیں رہا
اُن کی طلب میں کتنے ہی دست ہو گئے
بے سود لا رہے ہیں طبیبوں کو خیر خواہ
اس چارہ گر کو کوئی نہ لائے تو کیا کروں

.....○.....

اک برق جلوہ گر ہوئی پانی کے روپ میں
کوہ گراں بھی اشک رواں نے بہا دیئے

بعض اوقات یہ حوالے خیالِ محسوس کی صورت سامنے آتے ہیں

وہ زلف یار یوں برہم ہے جیسے
نظامِ دو جہاں زیروزبر ہے

.....○.....

WWW.NAFSEISLAM.COM

اس کی خوشبو سے مہکتا ہے شبستان وجود
تو نے جو پھول سر زلف لگا رکھا ہے

اور آخر میں وہ غزل جو روایت میں ڈوبی ہوئی بھی ہے اور مثل آبشار نغمہ سرا بھی ہے۔

غارت گر دل کاکل جانانہ کھڑی ہے
اب موت مری گھات میں وزدانہ کھڑی ہے
یہ حسرتِ ناکام تری رہگذر میں
اک عمر سے باہمت مردانہ کھڑی ہے
کیوں مری خودی وصل کا احسان اٹھائے
جب ہجر میں با شوکت شاہانہ کھڑی ہے
اُس آنکھ کی مستی کا ہے عالم ہی نرالا
رندوں کے لیے کھول کے میخانہ کھڑی ہے
کچھ لا نہ سکی شرم سے بے مائیگی میری
ہاتھوں پر لیے جان کا نذرانہ کھڑی ہے
اب آ کہ پس مرگ تری بادہ فروشی
تربت پہ اٹھائے ہوئے میخانہ کھڑی ہے

WWW.NAFSEISLAM.COM

الغرض، ''بیتابی'' ایک ایسا مجموعہ شعر ہے جو قاری کو ذہنی بالیدگی اور قلبی انشراح عطا کرتا ہے۔ یہ یقیناً اردو ادب میں عمدہ اضافہ ہے اس لیے میں اس شعری نوشتہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور خواہش رکھتا ہوں کہ خواجہ بلند اقبال کا قلم اسی طرح زرخیز رہے گا اور متلاشیان ادب کے دل و دماغ کو پُر بہار رکھے گا۔